

طویل مدتی قرض

اور

موجودہ کرنسی

[www.KitaboSunnat.com](http://www.KitaboSunnat.com)



ایفا پبلکیشنز



## معزز قارئین توجہ فرمائیں

- کتاب و سنت ڈاٹ کام پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب... عام قاری کے مطالعے کیلئے ہیں۔
- مجلس التحقیق الاسلامی کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق و اجازت کے بعد (Upload) کی جاتی ہیں۔
- دعوتی مقاصد کیلئے ان کتب کو ڈاؤن لوڈ (Download) کرنے کی اجازت ہے۔

## تنبیہ

ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کیلئے استعمال کرنے کی ممانعت ہے  
کیونکہ یہ شرعی، اخلاقی اور قانونی جرم ہے۔

اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر تبلیغ دین کی کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں

PDF کتب کی ڈاؤن لوڈنگ، آن لائن مطالعہ اور دیگر شکایات کے لیے درج ذیل ای میل ایڈریس  
پر رابطہ فرمائیں۔

✉ [KitaboSunnat@gmail.com](mailto:KitaboSunnat@gmail.com)

🌐 [www.KitaboSunnat.com](http://www.KitaboSunnat.com)

جدید فقہی تحقیقات

DATA ENTERED

طویل مدتی قرضے اور موجودہ کرنسی

۷۵۷۱

۲۸-۳-۱۷

MIN  
135910

[اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا) کے انیسویں فقہی سمینار منعقدہ

مورخہ ۱۲-۱۵ فروری ۲۰۱۰ء کو جامعہ مظہر سعادت ہانسوٹ میں

پیش کئے گئے علمی، فقہی اور تحقیقی مقالات و مناقشات کا مجموعہ]

www.KitaboSunnat.com

ایفا پبلیکیشنز - نئی دہلی

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ

نام کتاب : طویل مدتی قرضے اور موجودہ کرنسی  
صفحات : ۴۰۳  
سن طباعت : فروری ۲۰۱۱ء  
قیمت : ۱۲۰ روپے

27880

ناشر

ایفا پبلیکیشنز

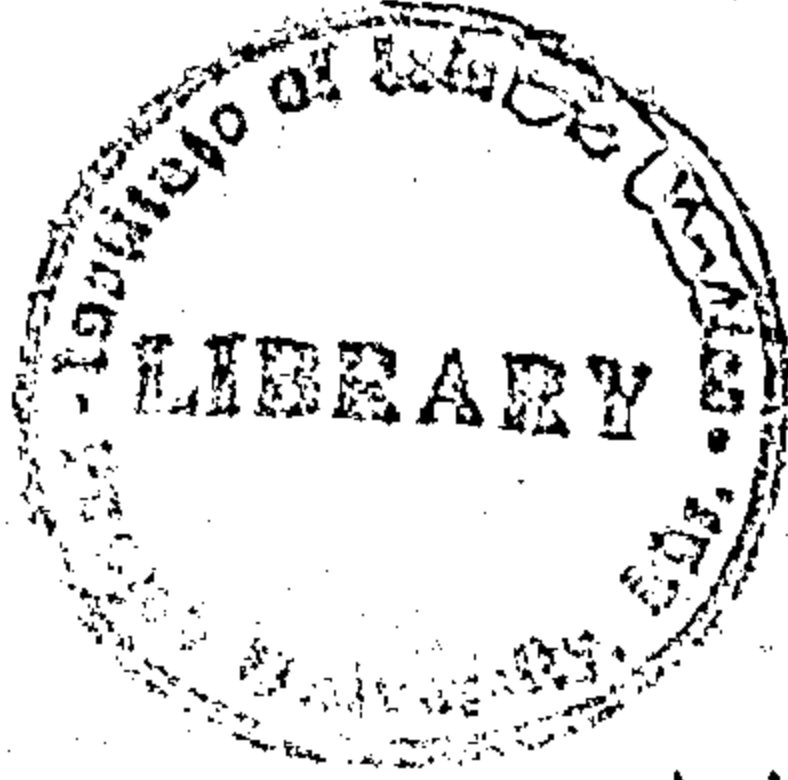
۱۶۱- ایف، پیسمنٹ، جوگابائی، پوسٹ باکس نمبر: ۹۷۰۸

جامعہ نگر، نئی دہلی - ۱۱۰۰۲۵

ای میل: ifapublications@gmail.com

فون: 011 - 26981327





## جلس اولیٰ

- ۱- مولانا مفتی محمد ظفیر الدین مفتاحی ✓
- ۲- مولانا محمد برہان الدین سنبھلی
- ۳- مولانا بدر الحسن قاسمی
- ۴- مولانا خالد سیف اللہ رحمانی
- ۵- مولانا عتیق احمد بستوی
- ۶- مولانا عبید اللہ سعیدی

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

## فہرست

۹	مولانا خالد سیف اللہ رحمانی	پیش لفظ
۵۴-۱۱		پہلا باب: تہیہ امور
۱۳		سوال نامہ
۱۶		اکیڑی کا فیصلہ
۱۷	مولانا صفدر زبیر ندوی	تلیخیں مقالات
۳۶	مفتی راشد حسین ندوی	عرض مسئلہ
۱۰۶-۵۵		دوسرا باب: تعارفی تحریر
۵۷	مولانا مبین سلیم ندوی ازہری	موجودہ کرنسی کی شرعی حیثیت
۳۲۶-۱۰۷		تیسرا باب: تفصیلی مقالات
۱۰۹	مفتی اقبال محمد نیکاروی	قرض، اجرت وغیرہ کو اشاریہ سے مربوط کرنا۔ ایک شرعی جائزہ
۱۳۳	مفتی راشد حسین ندوی	کرنسی کو اشاریہ سے مربوط کرنا۔ وضاحت اور شرعی حکم
۱۵۵	مولانا محی الدین بڑودوی	موجودہ کرنسی کی شرعی حیثیت
۱۶۹	مولانا محمد شاہ جہاں ندوی	دیون کو قیمتوں کے اشاریہ سے وابستہ کرنے کی شرعی حیثیت
۱۹۰	مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی	موجودہ کرنسی نوٹ کی شرعی حیثیت
۲۰۲	مولانا محمد حذیفہ محمود	کرنسی کے مسائل



۲۱۳	مفتی محمد خالد حسین نیوی قاسمی	موجودہ کرنسی نوٹ کی شرعی حیثیت
۲۲۱	مولانا خورشید احمد اعظمی	مؤخر مطالبات کی ادائیگی بذریعہ کرنسی
۲۳۰	مولانا عبدالقیوم پالنپوری	موجودہ کرنسی سے متعلق دو سوالوں کے جواب
۲۳۷	مولانا رضوان الحسن مظاہری	موجودہ کرنسی اور اس کی شرعی حیثیت
۲۳۸	مولانا سلمان پالنپوری	موجودہ کرنسی کی شرعی حیثیت
۲۵۸	مولانا عبدالنواب انادی	نوٹوں کی شرعی حیثیت
۲۶۸	مولانا نعیم اختر قاسمی	کرنسی کی شرعی حیثیت
۲۷۵	مفتی عبدالرحیم قاسمی	نوٹوں کی حیثیت - شریعت کی نظر میں
۲۸۱	مولانا ڈاکٹر سید اسرار الحق سیبیلی	کرنسی نوٹوں کے ذریعہ ادھار معاملات
۲۸۷	مولانا محمد نصر اللہ ندوی	موجودہ کرنسی کی شرعی حیثیت
۲۹۳	مولانا عطاء اللہ قاسمی	موجودہ کرنسی کی شرعی حیثیت
۳۰۱	مفتی محمد اجتہاد قاسمی	موجودہ کرنسی کا شرعی حکم
۳۰۶	مولانا محمد حسن عبدالحق ندوی	موجودہ کرنسی اور اس کی شرعی حیثیت
۳۱۱	مفتی سید باقر ارشد قاسمی	موجودہ کرنسی کا حکم
۳۱۷	مولوی ارشد شاداب ندوی	موجودہ کرنسی اور شرعی نقطہ نظر

۳۸۰-۳۲۷

### چوتھا باب: مختصر تحریریں

۳۲۹	مولانا زبیر احمد قاسمی	موجودہ کرنسی پر دو سوال اور اس کا حکم
۳۳۱	مفتی انور علی اعظمی	موجودہ کرنسی اور اس کی شرعی حیثیت
۳۳۵	مفتی محمد ثناء الہدی قاسمی	موجودہ کرنسی کی شرعی حیثیت
۳۳۹	مولانا محمد جعفر علی رحمانی	موجودہ کرنسی اور شرعی نقطہ نظر
۳۴۳	ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی	کرنسی کی شرعی حیثیت

۳۴۶	مولانا ابوسفیان مفتاحی	موجودہ کرنسی کی شرعی حیثیت
۳۴۹	مولانا اشتیاق احمد اعظمی	موجودہ کرنسی کا مسئلہ
۳۵۳	مولانا امداد اللہ قاسمی مسوی	موجودہ کرنسی کی شرعی حیثیت اور اس پر قیمتوں کے اشاریہ کا اثر
۳۵۶	مفتی محفوظ الرحمن مفتاحی	موجودہ کرنسی سے متعلق سوالات کے جوابات
۳۵۸	مولانا سلطان احمد اصلاحی	موجودہ کرنسی اور اس کی شرعی حیثیت
۳۶۱	مولانا محمد عثمان بستوی	مسائل کرنسی
۳۶۵	مفتی لطیف الرحمن ولایت علی	موجودہ کرنسی کی شرعی حیثیت
۳۶۹	مولانا عبداللطیف پالنپوری	موجودہ کرنسی کی شرعی حیثیت سے متعلق سوال کا جواب
۳۷۱	مفتی شیر علی گجراتی	موجودہ کرنسی سے متعلق جوابات
۳۷۲	مفتی اسماعیل بھٹا کو دروی	موجودہ کرنسی کا شرعی پہلو
۳۷۴	مولانا محمد صدر الحسن قاسمی	کرنسی نوٹ
۳۷۷	مولانا ثار احمد گودھروی	موجودہ کرنسی کی شرعی حیثیت
۳۷۸	مولانا ذکاء اللہ شبلی	موجودہ کرنسی اور شرعی نقطہ نظر
۳۷۹	حافظ کلیم اللہ عمری مدنی	موجودہ کرنسی کی شرعی حیثیت

۳۸۱-۳۰۳

### پانچواں باب: اختتامی امور

۳۸۳

مناقشہ





## پیش لفظ

معاشی نظام کے بقا و استحکام میں 'زر' یعنی کرنسی کو بڑا دخل ہے، ایک زمانہ میں کرنسی سونے اور چاندی کو بنایا جاتا تھا، جس کی خود ایک قیمت اور اہمیت تھی اور آدمی کے بس کی بات نہیں تھی کہ وہ جتنے سکے چاہے ڈھال لے، کیونکہ ان سکوں کی ڈھلائی کے لئے قیمتی دھات مطلوب ہوتی تھی اور اس کی مقدار پہلے بھی محدود تھی، اب بھی محدود ہے؛ لیکن جب کاغذی نوٹوں نے ان کی جگہ لے لی اور مختلف ممالک حدود و قیود سے آزاد ہو کر نوٹ چھاپنے لگے تو افراط زر پیدا ہوا اور ایسے نوٹ بازار میں آنے لگے جن کی پشت پر کوئی چیز نہیں تھی، اس کی وجہ سے نوٹوں کی قدر تیزی سے گھٹنے لگی، مثلاً آج اگر پانچ ہزار روپے میں گھر کا مکمل راشن آجاتا ہے تو دس مہینہ کے بعد اسی پانچ ہزار سے گھر کا ادھار راشن بھی نہیں خریدا جاسکتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ ان حالات میں روپے کو اصل ثمن مانا جائے، یعنی آج اگر کسی شخص نے دس ہزار روپے قرض لئے ہیں تو قیمت خرید میں فرق کے باوجود کیا چھ ماہ کے بعد وہ وہی دس ہزار روپے واپس کرے یا چونکہ موجودہ دس ہزار روپے سے حاصل ہونے والی چیزیں چھ ماہ کے بعد بیس ہزار روپے میں حاصل ہو سکتی ہیں، اس لئے اسے اس وقت بیس ہزار روپے ادا کرنے چاہئیں۔ اس سلسلہ میں دو پہلو ہیں جو اہل علم کے لئے قابل غور ہیں: اول یہ کہ اگر نوٹ کو اصل کرنسی مان لیا جائے اور آج کا قرض اگر دس سال کے بعد ادا ہو تب بھی اتنے ہی نوٹ واپس کئے جائیں تو اس میں قرض دہندہ کا بھاری نقصان ہے اور بظاہر یہ عدل کے خلاف ہے؛ جبکہ شریعت کے تمام احکام کی بنیاد عدل پر ہے، نیز اس کا ایک نقصان یہ ہے کہ لوگ ایک دوسرے کو قرض

دینے یا ادھار معاملہ کرنے سے گریز کرنے لگیں گے۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ اگر روپے کی قدر میں گراوٹ کی وجہ سے دی ہوئی رقم سے زیادہ وصول کی جائے تو اس سے سود کا راستہ کھل جانے کا اندیشہ ہے اور زکوٰۃ کی ادائیگی کے سلسلہ میں بھی بعض مسائل پیدا ہو جائیں گے۔

غور کیا جائے تو یہ دونوں ہی پہلو نہایت اہم ہیں؛ چنانچہ جب کرنسی سے متعلق مسئلہ پہلی بار اکیڈمی کے تیسرے فقہی سمینار میں پیش ہوا تو بعض امور پر اتفاق رائے ہو گیا؛ لیکن یہ بات طے نہیں پائی کہ مؤخر مطالبات میں نوٹ کی کیا حیثیت ہوگی؟ اسے بذات خود ٹمن سمجھا جائے گا یا یہ وثیقہ ٹمن شمار ہوگا؟ چنانچہ انیسویں فقہی سمینار میں دوبارہ یہ مسئلہ زیر بحث آیا اور اس وقت بھی ابتداء رائے منقسم تھی؛ لیکن تمام پہلوؤں پر غور و فکر کے بعد کچھ نکات پر اتفاق ہو گیا؛ چنانچہ موضوع سے متعلق مقالات، تجاویز اور شرکاء سمینار کے مباحث کا مجموعہ اس وقت آپ کے سامنے ہے۔

اکیڈمی کے شعبہ علمی کے رفیق مولانا صفدر زبیر ندوی نے اس کی ترتیب و تصحیح کی خدمت انجام دی ہے، فجزاہ اللہ خیر الجزاء، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کاوش کو قبول فرمائے اور اکیڈمی کی علمی و فقہی خدمات کے سلسلہ کو جاری رکھے۔

خالد سیف اللہ رحمانی

(جنرل سکریٹری اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا)

۱۶ صفر ۱۴۳۲ھ

۲۱ جنوری ۲۰۱۱ء

# جدید فقہی تحقیقات

پہلا باب

---

تہہ پیر کی امور





## سوالنامہ:

## موجودہ کرنسی کی شرعی حیثیت

انسان کو اپنی بہت سی ضروریات دوسروں سے حاصل کرنی پڑتی ہے، مثلاً کسی کے پاس اجناس ہیں کپڑے نہیں ہیں، اور کسی کو کپڑے میسر ہیں؛ لیکن فرنیچر کی ضرورت ہے، ایسی صورت میں اشیاء کے حصول کا ایک طریقہ یہ ہو سکتا ہے کہ لوگ گیہوں کے تھیلے لے کر بازار میں جائیں اور اس کے بدلے چند گز کپڑے خرید کر لے آئیں؛ لیکن اس میں ایک دشواری تو یہ ہے کہ انسان کو اپنی معمولی ضروریات کے لئے بھی اچھا خاصا بوجھ اٹھا کر ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا پڑے گا، دوسرے کپڑے کے ایسے تاجر کو تلاش کرنا ہوگا، جس کو گیہوں کی ضرورت بھی ہو؛ چنانچہ قدیم زمانہ میں اشیاء کے تبادلہ کا یہی طریقہ مروج تھا؛ مگر اس کی دشواری کو دیکھتے ہوئے بتدریج مختلف مرحلوں میں سونے اور چاندی کے سکے مروج ہوئے، یہ حمل و نقل کے اعتبار سے بھی آسان تھے اور ان کے ذریعہ بازار سے کوئی بھی چیز حاصل کی جاسکتی تھی؛ چنانچہ رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے وقت بھی روم میں سونے کے سکے دینار کے نام سے اور ایران میں چاندی کے سکے درہم کے نام سے مروج تھے اور عرب میں یہ دونوں سکے چلا کرتے تھے۔

رسول اللہ ﷺ نے ان ہی سکوں کو برقرار رکھا اور زکوٰۃ، دیت اور مختلف چیزوں کے لئے ان ہی کو معیار قرار دیا، اسی لئے ان کو فقہاء ”ثمن خلقی“ کہتے ہیں، سونے اور چاندی کی قیمتوں میں ایک حد تک استحکام تھا؛ اس لئے طویل عرصہ تک ان کو کرنسی کی حیثیت حاصل رہی، پھر آہستہ آہستہ ان کی جگہ کاغذی نوٹوں نے لے لی، ان نوٹوں کی قدر میں استحکام نہیں پایا جاتا اور کبھی کبھی اچھال اور زیادہ تر انحطاط پایا جاتا ہے، مثلاً: اگر آج سے دس سال پہلے دس ہزار روپے میں

دس تولہ سونا خرید کرنے کی صلاحیت تھی تو آج دس ہزار میں ایک تولہ بھی خرید نہیں کیا جاسکتا ہے، ایسی صورت میں مؤخر مطالبات کی ادائیگی کے وقت بعض اوقات روپے کی قدر میں بہت زیادہ فرق واقع ہو جاتا ہے، اگر بعینہ وہی مقدار ادا کی جائے تو صاحب حق کے ساتھ نا انصافی معلوم ہوتی ہے، اور اگر موجودہ قدر کے لحاظ سے زیادہ رقم دی جائے تو سود کا شبہ پیدا ہوتا ہے۔

اس مسئلہ کی بنیاد اس بات پر بھی ہے کہ ان کاغذی نوٹوں اور معدنی سکوں کی حیثیت بجائے خود شمن کی ہے یا وہ وثیقہ شمن کا درجہ رکھتا ہے، اور اگر اس کی حیثیت وثیقہ شمن کی ہے تو اس کی حقیقی قدر متعین کرنے لئے پیمانہ کیا ہوگا؟ سونا چاندی معیاری ہوگا یا ماہرین معاشیات کی طرف سے مقرر کردہ اندازہ پر مبنی اشاریہ؟

اس پس منظر میں دوسرے فقہی سمینار منعقدہ ۸ تا ۱۱ دسمبر ۱۹۸۹ء میں حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی نے کچھ سوالات اہل علم کی خدمت میں پیش کئے تھے؛ چنانچہ کرنسی سے متعلق بعض امور میں سمینار فیصلہ اور نتیجہ تک پہنچا لیکن دو سوالات وہ تھے جن کے بارے میں فیصلہ نہیں ہو سکا اور طے پایا کہ آئندہ ان پر بحث کی جائے، وہ سوالات حسب ذیل ہیں:

۱- کاغذی نوٹوں کی اپنی ذاتی کوئی قیمت نہیں ہوتی اور افراط زر کی صورت میں اس کی قوت خرید تیزی سے گر جاتی ہے، کیا اس صورت حال کی وجہ سے شرعیہ صحیح ہوگا کہ دیون یعنی مؤخر مطالبوں مثلاً قرض، مہر، پنشن، ادھار خریداری کی رقم اور وقت پر ادا نہ ہونے والی تنخواہوں کی ادائے گی کو قیمتوں کے اشاریہ سے وابستہ کر دیا جائے، اور کیا ایسے کسی اشاریہ کی ترتیب اور اس کے ذریعہ ادائیگیوں میں انضباط ممکن بھی ہے، اور کیا یہ کہنا صحیح ہے کہ عامۃ الناس کے درمیان ادائیگیوں کے لئے ایسے معیار مقرر کرنا جن کی بنیاد دقیق فنی اصولوں پر ہو، باہمی مستقل تنازعہ کا موجب ہوگا، نیز یہ کہ اس طرح سو روپے کے بدلے پانچ سو روپے کی ادائیگی باب ربا کو کھولنے کا ذریعہ بنے گی؟

۲- کیا یہ جائز ہوگا کہ نوٹوں کی شکل میں قرض دیتے وقت یا مہر کے تقرر کے وقت یا



ادھار فروختگی کے وقت طرفین واجب الادا نوٹ کی مالیت سونے یا چاندی میں طے کر لیں اور  
 بوقت ادائیگی اسی قدر سونے یا چاندی کی قیمت کے مساوی نوٹوں کی ادائیگی عمل میں آئے؟  
 آپ سے درخواست ہے کہ اس سلسلہ میں اپنے تحقیقی جوابات سے سرفراز فرمائیں۔



## اکیڈمی کا فیصلہ:

### موجودہ کرنسی کی شرعی حیثیت

۱- مؤخر مطالبات اور بقایا جات کو قیمتوں کے اشاریہ یا سونے چاندی کی قیمت سے مربوط کرنا درست نہیں ہے، اس لئے کہ اشاریہ دقیق فنی اصولوں اور ظن و تخمین پر مبنی ہونے کی وجہ سے ناقابل عمل بھی ہے اور سخت نزاع کا باعث ہو سکتا ہے، نیز دونوں صورتوں میں ربا کا دروازہ بھی کھل سکتا ہے۔

۲- بہتر ہے کہ مہر مؤجل سونے یا چاندی میں مقرر کیا جائے جیسا کہ اس سے پہلے بھی اکیڈمی فیصلہ کر چکی ہے، ایسی صورت میں بوقت ادائیگی مقررہ مقدار میں سونا یا چاندی ادا کرنا ہوگا، اور اگر اس وقت دونوں فریق اتنی مقدار سونا یا چاندی کی قیمت کے پیسوں کی ادائیگی پر اتفاق کر لیں تو یہ بھی جائز ہے، یہی حکم اس وقت بھی ہوگا جبکہ کسی شے کی اجرت یا قیمت سونے یا چاندی میں طے کی جائے۔



## تلخیص مقالات:

## موجودہ کرنسی کی شرعی حیثیت

مولانا صفدر زبیر ندوی ☆

اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کے ۱۹ ویں فقہی سمینار کے موضوعات میں سے ایک موضوع ”موجودہ کرنسی کی شرعی حیثیت“ رکھا گیا ہے، یہ موضوع اکیڈمی کے دوسرے فقہی سمینار منعقدہ ۸-۱۱ دسمبر ۱۹۸۹ء میں رکھا گیا تھا، موضوع کے بعض امور میں سمینار نے فیصلے کئے، لیکن دو سوالات وہ تھے جن کے بارے میں فیصلہ نہیں ہو سکا تھا اور طے پایا کہ آئندہ سمینار میں ان دونوں سوالوں پر بحث کی جائے گی، چنانچہ اکیڈمی نے موجودہ سمینار منعقدہ ۱۲-۱۵ فروری ۲۰۱۰ء بمقام ہانسوٹ گجرات میں ان کو موضوع بحث بنایا ہے، اس تعلق سے تقریباً ۳۵ مقالات اکیڈمی کو موصول ہوئے جن کا خلاصہ پیش کیا جا رہا ہے:

قیمتوں کے اشاریہ کا مفہوم:

کئی مقالہ نگار حضرات نے اپنے مقالے میں کرنسی کی قیمتوں کے اشاریہ کی تفصیلی وضاحت مفتی تقی عثمانی صاحب کی کتابوں ”اسلام اور جدید معیشت“، ”فقہی مقالات“، ”تقریر ترمذی“ اور ”تکملہ فتح الہام“ کے حوالہ سے کی ہے، لکھتے ہیں کہ:

”موجودہ علم معاشیات کے الفاظ میں اس کی تشریح اس طرح کی جاسکتی ہے کہ آج کے دور میں کرنسی کی اندرونی قیمت کا مدار ملک میں افراط زر اور تفریط زر پر ہوتا ہے، اگر ملک میں افراط زر

ہو جائے تو کرنسی کی قیمت کم ہو جاتی ہے اور جب تفریط زر ہو جائے تو کرنسی کی قیمت بڑھ جاتی ہے۔  
آگے اس کو سمجھاتے ہوئے فرماتے ہیں:

”تفریط زر کے وقت ہم کرنسی کے ذریعہ اشیاء صرف کی بڑی مقدار خرید سکتے ہیں، مثلاً اس وقت ہم سو روپے میں مندرجہ ذیل اشیاء خرید سکتے ہیں:

گندم ۲۰ کلو نمک ۲۰ کلو کپڑے ۱۰ میٹر

آگے فرماتے ہیں: افراط زر کے وقت وہی اشیاء مندرجہ ذیل مقدار میں خرید سکیں گے:

گندم ۱۰ کلو نمک ۱۰ کلو کپڑے ۵ میٹر

اب سوال یہ ہے کہ اگر ایک شخص نے تفریط زر کے وقت کسی سے سو روپے ادھار لئے یا ایک ہزار مہر مقرر کی، یا اسی کے مثل کوئی مؤخر مطالبہ اپنے ذمہ لیا، اور ان چیزوں کی ادائیگی وہ افراط زر کے وقت کر رہا ہے، تو ادائیگی کے وقت جتنا اس نے لیا تھا یا جتنا اس پر لازم تھا اتنی ہی رقم کا ادا کرنا اور اس میں کمی بیشی نہ کرنا اس پر لازم ہے، ورنہ سود لازم آئے گا، لیکن مسئلہ یہ ہے کہ اگر وہ صرف سو روپے واپس کر رہا ہے تو کیا جتنا اس پر لازم ہوا تھا اتنا اس نے ادا کیا؟ صاف ظاہر ہے کہ لزوم تفریط کے وقت ہوا، واپسی افراط کے وقت ہو رہی ہے، لہذا جتنی اشیاء سو روپے سے لیتے وقت مل سکتی تھی اب نہیں مل سکتی، تو کیا صرف سو روپے کی واپسی مقرض پر ظلم نہیں ہے؟ اور چونکہ افراط زر ہی زیادہ تر ہوا کرتا ہے اس لئے مقرض ہمیشہ گھائے میں رہتا ہے، تو یہ تو عجیب بات ہے کہ وہ کسی کی امداد بھی کرے اور اس کو مزید گھائے میں بھی مبتلا کر دیا جائے۔“

اس فکر کے تحت بعض ماہرین معاشیات نے یہ حل نکالا کہ کیوں نہ اس طرح کی ادائیگیوں کو قیمتوں کے اشاریہ (Price Index) سے مربوط کر دیا جائے، اس سے مقرض اس نقصان سے محفوظ رہے گا، برازیل، آسٹریلیا اور اسرائیل جیسے چند ممالک نے اس نظام کو پسند کیا اور اپنا بھی لیا، ہمیں اس شکل کا شرعی حکم دریافت کرنا ہے، لہذا پہلے ہم کو اس پرائس انڈیکس کا مطلب سمجھنے کی ضرورت ہے، اس لئے کہ یہ ایک خالص اقتصادی اصطلاح ہے، مولانا تقی عثمانی صاحب اس

کو سمجھاتے ہوئے فرماتے ہیں:

”زیر بحث مسئلہ کا شرعی حکم جاننے کے لئے قیمتوں کا اشاریہ وضع کرنے کا طریقہ اور کرنسی کی قیمت میں اس کے استعمال کو جاننا ضروری ہے، لہذا اقرضوں کا قیمتوں کے اشاریہ کے ساتھ تعلق کے سلسلہ میں ماہرین معاشیات جو طریقہ اختیار کرتے ہیں اس کا خلاصہ ہم آپ کے سامنے پیش کرتے ہیں:

جاننا چاہئے کہ کرنسی چاہے دھات کی ہو یا کاغذی کرنسی ہو وہ بذات خود مقصود نہیں ہوتی، اس لئے کہ وہ کرنسی بذات خود نہ تو بھوک مٹا سکتی ہے اور نہ اس سے جسم کو ڈھانپا جاسکتا ہے، اور نہ اس کے ذریعہ خواہش پوری کی جاسکتی ہے اور نہ اس کے ذریعہ تکلیف دور کی جاسکتی ہے، بلکہ اس کرنسی کے ذریعہ انسان اپنی ضروریات زندگی کی اشیاء و خدمات خریدتا ہے، اس لحاظ سے دیکھا جائے تو ہر کرنسی کی دو قیمتیں ہوتی ہیں، ایک اس کی ظاہری قیمت (Face Value) یہ وہ قیمت ہے جو اس کرنسی پر لکھی ہوتی ہے، دوسری اس کی واقعی قیمت (Real Value) یعنی اس کرنسی کا حقیقی عملی فائدہ جو ایک انسان اپنی ضروریات میں اس کرنسی کو خرچ کر کے حاصل کرتا ہے، اس کو دوسرے لفظوں میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ اس کرنسی کی حقیقی قیمت اشیاء اور خدمات کا وہ مجموعہ ہے جو ایک انسان کے لئے اس کرنسی کے ذریعہ خریدنا ممکن ہو، آج کل اقتصاد بین اشیاء کے اس مجموعہ کا نام ”اشیاء کی ٹوکری“ (Basket of Goods) رکھتے ہیں، لہذا کرنسی کی حقیقی قیمت وہ اشیاء کی ٹوکری ہے جس کو کرنسی کے ذریعہ خریدنا ممکن ہو۔“

پھر آگے موصوف نے تفصیل سے سمجھایا ہے کہ یہ قوت خرید یکساں نہیں رہتی، اس میں تغیر ہوتا رہتا ہے، اگر ۲۰۰۹ء میں پانچ ہزار روپے میں اشیاء کا ایک خاص مجموعہ ملا ہے تو ۲۰۱۲ء میں ہو سکتا ہے کہ مجموعہ ۱۰ ہزار میں ملے، مولانا فرماتے ہیں:

”اگر ہم فرض کریں کہ ۱۹۸۰ء میں ایک شخص کی ماہانہ تنخواہ پانچ ہزار روپے تھی، اور ۱۹۸۷ء میں اس کی تنخواہ زیادہ ہو کر دس ہزار روپے ہو گئے تو اس کی ماہانہ تنخواہ کی قیمت اور حیثیت کا



حساب مندرجہ ذیل طریقہ سے کیا جائے گا:

سال	تنخواہ کی ظاہری قیمت	نرخ نامہ میں زیادتی کا تناسب	حقیقی قیمت
۱۹۸۰ء	۵۰۰۰/۵ ہزار روپے	۱۶۰	۵۰۰۰/۵ ہزار روپے
۱۹۸۷ء	۱۰۰۰۰/۱۰ ہزار روپے	۲۶۵	۳۰۰۰/۳ ہزار روپے

مندرجہ بالا مثال میں آپ دیکھیں گے کہ اگرچہ اس شخص کی تنخواہ کی ظاہری قیمت دس ہزار روپے ہوگئی، لیکن اس کی تنخواہ کی حقیقی قیمت ۱۹۸۰ء کی قیمتوں کی سطحوں پر نظر رکھتے ہوئے چار ہزار روپے ہوگئی، اس لئے کہ کرنسی کی حقیقی قیمت کو دیکھتے ہوئے ۱۹۸۷ء کے دس ہزار روپے ۱۹۸۰ء کے چار ہزار روپے کے مساوی ہو گئے۔

اسی طرح اگر کسی نے ۱۹۸۰ء میں چار ہزار روپے قرض لئے تھے تو اگر ہم قرضوں کی ادائیگی کو قیمتوں کے اشاریہ کے ساتھ وابستہ کر دیں تو ۱۹۸۷ء میں اسے دس ہزار روپے کرنے ہوں گے، اس لئے کہ اس کی حقیقی قیمت معتبر ماننے کا مطلب یہی ہوگا“ (مقالہ: مولانا راشد حسین ندوی، مفتی عبدالرحیم قاسمی، مولانا عبدالقیوم پالنپوری وغیرہ)۔

بعض حضرات نے افراط زر اور تفریط زر کے عنوان سے بھی بحث کی ہے، لکھتے ہیں:

افراط زر کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں کے پاس رقم زیادہ آجائے لیکن رسد میں کوئی اضافہ نہ ہو، چنانچہ دوکاندار جب دیکھتا ہے کہ رقم زیادہ آگئی ہے اور اشیاء کی طلب میں اضافہ ہو گیا ہے لیکن رسد میں اضافہ نہیں ہوا ہے تو وہ اشیاء کی قیمت میں اضافہ کر دیتا ہے جس سے روپے کی قوت خرید میں کمی آجاتی ہے اور مہنگائی بڑھ جاتی ہے۔

اور تفریط زر کا مطلب یہ ہے کہ کسی ملک میں جاری شدہ کرنسی اشیاء اور خدمات کے مقابلہ میں کم ہو جائے، جس کے نتیجے میں اشیاء اور خدمات کی قیمت کم ہو کر ارزانی پیدا ہو جائے، اس لئے کہ جب اشیاء طلب سے زیادہ ہو جاتی ہیں تو بھاؤ گر جاتا ہے اور قیمت کم ہو جاتی

ہے (کرنسی کی قوت خرید: مولانا محمد تقی عثمانی رص ۵۰) (مقالہ: مولانا اشتیاق احمد اعظمی، مولانا نعیم اختر قاسمی، مفتی انور علی اعظمی، مولانا محمد نصر اللہ ندوی وغیرہ)۔

مولانا عطاء اللہ قاسمی کہتے ہیں کہ کرنسی نوٹوں کی قدروں اور قیمتوں کی کمی بیشی کو منضبط کرنے کے لئے ریاضی کا پیچیدہ اور بظاہر سائنٹفک طریقہ نکالا گیا جسے اشاریہ کہا جاتا ہے، اشاریہ کے تین بنیادی عناصر ترکیبی ہیں:

۱- اشیاء ضروریہ کی تعیین اور ان کی فہرست سازی۔

۲- اشیاء کی اہمیت کا تعیین۔

۳- اشیاء کی قیمتوں کا تعیین۔

مفتی اقبال محمد نیکاروی اس کو ان الفاظ میں واضح کرتے ہیں: قیمتوں کے اشاریہ (Index) میں اشیاء کی قیمتوں میں جس تناسب اور حساب سے اضافہ ہوا ہے اسی تناسب سے قرض دار قرض خواہ کو قرض واپس کرے گا، لئے ہوئے قرض کے برابر روپیہ واپس نہیں کرے گا، مثلاً اگر کسی شخص نے ۱۰۰ روپے قرض لئے ہیں اور قیمتوں کے اشاریے میں دس فیصد کے تناسب سے بڑھوتری ہوئی ہے تو واپسی کے وقت دس فیصد قرض میں اضافہ کر کے ۱۱۰ روپے واپس کرے گا۔

کرنسی نوٹوں کی حیثیت:

بعض حضرات نے کاغذی نوٹوں / کرنسی کی شمیت یعنی ثمن خلقی اور ثمن عرفی ہونے پر بھی بحث کی ہے، مثلاً:

افادیت کے اعتبار سے کرنسی نوٹ کی وہی حیثیت ہے جو ثمن خلقی یا ثمن حقیقی کی ہے (مقالہ: قاری ظفر الاسلام صدیقی، مولانا محفوظ الرحمن مفتاحی، مفتی عبدالرحیم قاسمی، مولانا محمد صدرا الحسن وغیرہ)۔

مولانا محبوب فروغ قاسمی لکھتے ہیں کہ ایک خیال یہ ہے کہ بعض فروق کے ساتھ موجودہ کرنسی نوٹ نقد (یعنی ثمن خلقی) کے حکم میں ہے، یہ بات زیادہ قرین قیاس اور ہم آہنگ روح

شریعت معلوم ہوتی ہے، اس لئے کہ نقد (یعنی ثمن خلقتی) جن اسباب و خواص کی وجہ کر نقد بنتا ہے وہ تمام اسباب و خاصیات کا حامل فی زمانہ موجودہ سکے ہی ہیں۔

بعض حضرات کے نزدیک اس کی حیثیت ثمن عرفی یا ثمن اصطلاحی کی ہے (مقالہ: مولانا عبد القیوم پالنپوری، مفتی محمد خالد حسین نیوی، مفتی شیر علی، مولانا امداد اللہ قاسمی، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مولانا عبداللطیف پالنپوری، مولانا عطاء اللہ قاسمی، مفتی سید باقر ارشد قاسمی، مفتی ارشد شاداب ندوی، مولانا محمد شاہ جہاں ندوی)۔

مولانا محمد احسن عبدالحق ندوی کہتے ہیں کہ نوٹ ثمن عرفی ہے اور یہ ثمن خلقتی کے قائم مقام ہے۔

مولانا رضوان الحسن مظاہری کا کہنا ہے کہ نقد اور معجل معاملات میں کرنسی نوٹ کو ثمن عرفی تسلیم کیا جائے، اور ادھار و معجل معاملات میں وثیقہ و سند سمجھا جائے، اور معاملہ کرتے وقت کرنسی نوٹ کا اشاریہ سونے چاندی سے کر لیا جائے۔

دیون (مؤخر مطالبوں بر بقایا جات) کی وصولی کے لئے کرنسی کو قیمتوں کے اشاریے سے مربوط کرنا:

سوال نمبر ۱: کاغذی نوٹوں کی اپنی ذاتی کوئی قیمت نہیں ہوتی اور افراط زر کی صورت میں اس کی قوت خرید تیزی سے گر جاتی ہے، کیا اس صورت حال کی وجہ سے شرعیاً صحیح ہوگا کہ دیون یعنی مؤخر مطالبوں مثلاً قرض، مہر، پنشن، ادھار خریداری کی رقم اور وقت پر ادانہ ہونے والی تنخواہوں کی ادائیگی کو قیمتوں کے اشاریہ سے وابستہ کر دیا جائے، اور کیا ایسے کسی اشاریہ کی ترتیب اور اس کے ذریعہ ادائیگیوں میں انضباط ممکن بھی ہے، اور کیا یہ کہنا صحیح ہے کہ عامۃ الناس کے درمیان ادائیگیوں کے لئے ایسے معیار مقرر کرنا جن کی بنیاد دقیق فنی اصولوں پر ہو، باہمی مستقل تنازعہ کا موجب ہوگا، نیز یہ کہ اس طرح سو روپے کے بدلے پانچ سو روپے کی ادائیگی باب ربا کو کھولنے کا ذریعہ بنے گی؟

اس سوال کے جواب میں اکثر مقالہ نگار حضرات نے مؤخر مطالبوں کی ادائیگی کو قیمتوں کے اشاریہ سے وابستہ کرنے کو ناجائز کہا ہے بلکہ اسے عین ربا یا ربا کے مشابہ قرار دیا ہے (مقالہ: مولانا راشد حسین ندوی، مولانا کلیم اللہ عمری، مفتی محمد خالد حسین نیوی، مفتی ثناء الہدی قاسمی، مولانا نعیم اختر قاسمی، مفتی اقبال محمد نیکاروی، مولانا عبدالنواب اناری، مولانا امداد اللہ قاسمی، مولانا محمد صدر الحسن، مولانا محفوظ الرحمن مفتاحی، مولانا عبداللطیف پالنپوری، مولانا عطاء اللہ قاسمی، مفتی سید باقر ارشد قاسمی، مولانا محمد احسن عبدالحق ندوی، مفتی انور علی اعظمی، مولانا محمد نصر اللہ ندوی، مفتی لطیف الرحمن، مفتی انور شاداب ندوی، مولانا اشتیاق احمد اعظمی، مولانا محبوب فروغ قاسمی، مولانا سلمان پالنپوری، مولانا محمد جعفر ملی، مولانا عبدالقیوم پالنپوری، مولانا خورشید احمد اعظمی، مولانا محمد حذیفہ محمود، مولانا محمد شاہجہاں ندوی وغیرہ)۔

ان حضرات کے دلائل ذیل میں درج کئے جاتے ہیں:

قرآن سے:

۱- ”أحل الله البيع وحرم الربا“ (سورہ بقرہ: ۲۵۷) (مقالہ: مولانا محمد خالد حسین نیوی، مولانا محمد جعفر ملی)۔

۲- ”وإن تبتم فلکم رؤوس أموالکم لا تظلمون ولا تظلمون“ (سورہ بقرہ: ۲۷۹) (مقالہ: مولانا سید اسرار الحق سبیلی)۔

۳- ”یا ایہا الذین آمنوا أوفوا بالعقود“ (سورہ مائدہ: ۱) (مقالہ: مولانا سید اسرار الحق سبیلی)۔

حدیث سے:

۱- ”لا تبیعوا الدینار بالدینارین، ولا الدرہم بالدرہمین“ (مسلم: کتاب المساقاة: باب الربا: رقم: ۴۰۵۷) (مقالہ: مولانا راشد حسین ندوی)۔

۲- ”عن أبی ہریرۃ قال: قال رسول اللہ ﷺ: الذهب بالذهب وزنا

بوزن، مثلاً بمثل والفضة بالفضة وزنا بوزن مثلاً بمثل، فمن زاد أو استزاد فهو ربا“ (مسلم: کتاب المساقاة؛ باب الصرف؛ رقم: ۴۰۶۹) (مقالہ: مولانا راشد حسین ندوی، مولانا محمد نصر اللہ ندوی)۔

۳۔ ”عن ابن عمر قلت: يا رسول الله! كنت أبيع الإبل بالبيع فأبيع بالدنانير وأخذ الدراهم وأبيع بالدراهم وأخذ الدنانير، وأخذ هذه من هذه، وأعطى هذه من هذه، فقال رسول الله ﷺ: لا بأس أن تأخذها بسعر يومها ما لم تفترقا وبينكما شيء“ (ابوداؤد: کتاب البيوع؛ باب في اقتضاء الذهب من الورق، رقم: ۳۳۵۳، مسند احمد، رقم: ۶۲۳۹، الحاكم، رقم: ۲۲۸۵) (مقالہ: مولانا راشد حسین ندوی، مفتی اقبال محمد ٹنکاروی، مولانا عبدالنواب اناوی، مولانا امداد اللہ قاسمی، مفتی عبدالرحیم قاسمی، مولانا خورشید احمد اعظمی)۔

بذل الجہود میں مذکورہ حدیث کی وضاحت کرتے ہوئے صاحب کتاب لکھتے ہیں:

”فذهب أكثر أهل العلم إلى جوازه ومنع من ذلك أبو سلمة بن عبد الرحمن وأبو شبرمة وكان ابن أبي ليلى يكره ذلك إلا بسعر يومه، ولا يعتبر غيره السعر ولم يبالوا كان ذلك بأغلى أو أرخص من سعر اليوم“ (بذل الجہود ۲۳۶/۵) (مقالہ: مولانا عبدالنواب اناوی)۔

۴۔ ”عن أبي سعيد الخدري وأبي هريرة رضي الله عنهما أن رسول الله ﷺ استعمل رجلا على خبير فجاءه بتمر جنيب فقال رسول الله ﷺ: أكل تمر خبير هكذا؟ قال: لا والله يا رسول الله! إنا لناخذ الصاع من هذا بالصاعين، والصاعين بالثلاثة، فقال رسول الله ﷺ: لا تفعل، بع الجميع بالدراهم ثم ابتع بالدراهم جنيباً“ (بخاری: کتاب البيوع؛ باب إذا أراد بيع تمر بتمر خیر منه، رقم: ۲۲۰۱، مسلم: کتاب المساقاة، باب بیع الطعام مثلاً بمثل، رقم: ۱۵۹۳) (مقالہ: مولانا راشد حسین ندوی، مولانا نعیم اختر قاسمی، مفتی اقبال محمد ٹنکاروی، مولانا محمد نصر اللہ ندوی، مولانا محمد حذیفہ محمود)۔

۵- ”عن ابی سعید الخدری قال: کنا نرزق تمر الجمع علی عهد رسول اللہ ﷺ وهو الخلط من التمر فکنا نبيع صاعین بصاع فبلغ ذلك رسول اللہ ﷺ فقال: لا صاعین تمرا بصاع ولا صاعین حنطة بصاع ولا درهما بدرهمین“ (مسلم ۲۷/۲، رقم: ۴۰۶۱) (مقالہ: مفتی اقبال محمد نیکاروی، مفتی انور علی اعظمی، مفتی لطیف الرحمن، مولانا اشتیاق احمد اعظمی، مولانا محمد حذیفہ محمود)۔

۶- ”عن عبادة بن الصامت قال قال رسول الله ﷺ: الذهب بالذهب، والفضة بالفضة، والبر بالبر، والشعير بالشعير، والتمر بالتمر، والملح بالملح مثلا بمثل، سواء بسواء، يدا بيد، فإذا اختلفت هذه الأوصاف فبيعوا كيف شئتم إذا كان يداً بيد“ (مسلم ۲۵/۲، رقم: ۴۰۳۹) (مقالہ: مولانا محمد نصر اللہ ندوی، مولانا محمد حذیفہ محمود)۔

فقہ سے:

۱- علامہ مرغینانی فرماتے ہیں: ”ومشائخنا لم يفتوا بجواز ذلك في العدالي والغطارفة لأنها أعز الأموال في ديارنا فلو أبيع التفاضل فيه يفتح باب الربوا“ (ہدایہ ۹۳/۳)۔ اس کی تشریح میں علامہ ابن ہمام لکھتے ہیں: ”فإن الناس يعتادون التفاضل في الأموال النفيسة فيندرجون إلى ذلك في النقود الخالصة، فمنع ذلك حسماً لمادة الفساد“ (فتح القدير ۲۵۷/۷) (مقالہ: مفتی خالد حسین نیوی، مولانا محمد احسن عبدالحق ندوی، مفتی عبدالرحیم قاسمی)۔

۲- ”والذي يغلب على الظن ويميل إليه القلب ان الدراهم المغلوبة الغش أو الخالصة إذا غلت أو رخصت لا يفسد البيع قطعا ولا يجب إلا ما وقع عليه العقد من النوع المذكور فيه، فإنها أثمان عرفا وخلقة ولا يجري في ذلك خلاف أبي يوسف“ (تنبیہ الرقود فی احکام النقود- رسائل ابن عابدین ۶۳/۲) (مقالہ: مولانا راشد حسین ندوی)۔



۳- علامہ ابن قدامہ فرماتے ہیں: "يجب رد المثل في المكيل والموزون،

لا نعلم فيه خلافاً" (المغنی ۳/۳۵۷) (مقالہ: مولانا راشد حسین ندوی)۔

مقالہ نگاران کا تقریباً اس پر اتفاق ہے کہ قیمتوں کے اشاریہ سے قرض کو اس لئے وابستہ نہیں کر سکتے کہ قرض کی ادائیگی میں مماثل ضروری ہے، یعنی جو چیز جس نوعیت کی جتنی مقدار میں قرض لی گئی ہے، اتنی ہی مقدار میں اس کا مثل ادا کرنا ضروری ہے، اور مثلی چیزوں میں کمی بیشی سود شمار ہوگا، درجہ ذیل عبارتیں دلیل کے طور پر پیش کی گئی ہیں:

۱- علامہ نووی لکھتے ہیں: "إذا أقرض شيئاً له مثل كالحبوب والأدهان

والدراهم والدنانير وجب على المقرض رد مثلها لأنه أقرب إليه" (شرح المہذب ۱۲/۲۱۵) (مقالہ: مولانا ثناء الہدی قاسمی، مفتی ارشد شاداب ندوی)۔

۲- ابن قدامہ لکھتے ہیں: "إن المستقرض يرد المال في المثليات سواء

رخص سعره أو غلا أو كان بحاله ولو كان ما أقرضه موجودا بعينه فرده من غير عيب يحدث فيه لزوم قبوله سواء تغير سعره أو لم يتغير" (المغنی ۳/۳۶۵) (مقالہ: مولانا ثناء الہدی قاسمی، مفتی ارشد شاداب ندوی)۔

۳- "وإن استقرض دائق فلوس أو نصف درهم فلوس ثم رخصت أو

غلت لم يكن عليه إلا مثل عدد الذي أخذه..... ولا ينظر إلى غلاء الدراهم ولا إلى رخصها" (رد المحتار ۷/۳۹۰) (مقالہ: مولانا ثناء الہدی قاسمی، مفتی ارشد شاداب ندوی، مولانا خورشید احمد اعظمی)۔

۴- علامہ مرغینانی لکھتے ہیں: "ولو استقرض فلوساً نافقة فكسدت عند أبي

حنيفة يجب مثلها، لأنه إعارة وموجه رد العين، ومعنى الثمنية فضل فيه، إذ القرض لا يختص به" (ہدایہ ۳/۱۱۰) (مقالہ: مولانا سید اسرار الحق سبیلی، مولانا کلیم اللہ عمری، مولانا محمد شاہ جہاں ندوی)۔

- ۵- علامہ کاسانی فرماتے ہیں: "ولو استقرض فلوسا نافقة وقبضها فكسدت فعليه رد مثل ما قبض من الفلوس عددا في قول أبي حنيفة وأبي يوسف وفي قول محمد قيمتها"، پھر آگے لکھتے ہیں: "ولو لم تكسد ولكنها رخصت أو غلت فعليه رد مثل ما قبض بلاخلاف، لما ذكرنا أن صفة الثمنية باقية" (بدائع الصنائع ۳/۴۹۶) (مقالہ: مولانا سید اسرار الحق سبیلی، مولانا محمد شاہ جہاں ندوی)۔
- ۶- علامہ ہکفی لکھتے ہیں: "استقرض من الفلوس الرائجة والعدالی فكسدت، فعليه مثلها كاسدة، ولا يغرم قيمتها..... لما مر أنه مضمون بمثله فلا عبرة بغلائه ورخصه"، علامہ شامی اس پر ان الفاظ میں اضافہ کرتے ہیں: "وكذلك لو قال: أقرضني عشرة دراهم غلة بدینار، فأعطاه عشرة دراهم، فعليه مثلها، ولا ينظر إلى غلاء الدراهم ولا إلى رخصها" (الدر المختار مع رد المحتار ۷/۲۹۳) (مقالہ: مولانا سید اسرار الحق سبیلی، مفتی ارشد شاہ داد ندوی، مولانا خورشید احمد اعظمی)۔
- ۷- "الديون تقضى بأمثالها" (الاشباه والنظائر ۲/۲۵۶، رد المحتار ۳/۸۳۸) (مقالہ: مولانا عبدالقادر اناری، مفتی لطیف الرحمن، مولانا اشتیاق احمد اعظمی، مولانا خورشید احمد اعظمی)۔
- ۸- "المماثلة بين الشئین باعتبار الصورة والمعنى" (ہدایہ مع فتح القدر ۷/۷) (مقالہ مفتی ارشد شاہ داد ندوی)۔
- ۹- "والمثل المطلق هو المثل صورة و معنى، فأما القيمة فمثل من حيث المعنى دون الصورة" (بدائع الصنائع ۳/۴۰۱) (مقالہ: مفتی ارشد شاہ داد ندوی)۔
- ۱۰- "يجب عليه رد مثله إن كان ذوات الأمثال كالمكيل والموزون والعدد الذي لا يتفاوت" (تنبیہ الرقود فی احکام العقود ۵۶) (مقالہ: مفتی ارشد شاہ داد ندوی)۔
- ۱۱- "لأن المقصود هو الجبران وذلك في المثل أتم، لأن فيه مراعات الجنس والمالية، وفي القيمة مراعاة المالية فقط فكان إيجاب المثل

اعدل“ (المبسوط ۱۱/۵۰) (مقالہ: مفتی ارشد شاداب ندوی)۔

۱۲- علامہ ابن تیمیہ لکھتے ہیں: ”ولهذا كان من أوجب المثل في كل شيء بحسب الإمكان مع مراعاة القيمة أقرب إلى العدل ممن أوجب القيمة من غير المثل“ (فتاویٰ ابن تیمیہ ۱۱/۳۵۲) (مقالہ: مفتی ارشد شاداب ندوی)۔

۱۳- ”وإن اشترى فاكهة بدائق فلس والدائق عشرون فلسا فلم يرد الفلوس حتى غلت أو رخصت فعليه عشرون فلسا لأن بالغلاء والرخص لا ينعدم صفة الثمنية وصار هو عند العقد بتسمية الدوائق مسميا ما يوجد به من الفلوس وذلك عشرون ولو صرح بذلك القدر لم يتغير العدد بعد ذلك بغلاء السعر ورخصه فهذا مثله“ (المبسوط ۱۳/۲۹) (مقالہ: مفتی عبدالرحیم قاسمی)۔

۱۴- مولانا عبدالحی فرماتے ہیں: نوٹ ہر چند خلقۃً ٹمن نہیں مگر عرفاً حکم ٹمن میں ہے بلکہ عین ٹمن سمجھا جاتا ہے، اس وجہ سے کہ اگر نوٹ سو روپیہ کا کوئی ہلاک کر دے تو اصل مالک سو روپے کا تاوان لیتا ہے اور سو روپیہ کا نوٹ جب بیچا جاتا ہے تو مقصود اس سے قیمت ملنا اس کا غذا کا نہیں ہوتا کیونکہ یہ ظاہر ہے کہ وہ کاغذ دو پیسہ کا بھی نہیں ہے بلکہ مقصود سو روپیہ کا بیچنا اور اس کی قیمت لینا ہوتا ہے اور نوٹ سو روپیہ کا اگر کوئی قرض لے تو بوقت ادا خواہ نوٹ سو روپیہ کا دے یا سو روپیہ دے دونوں امر مساوی سمجھے جاتے ہیں اور دائن کو کسی کے لینے میں مدیون سے عذر نہیں ہوتا حالانکہ اگر مدیون غیر جنس بوقت ادا دے تو دائن نہیں لیتا بخلاف پیسوں کے کہ وہ بھی اگرچہ عرفاً ٹمن ہے مگر یہ کیفیت ان کی نہیں ہے، اگر ایک روپیہ کے عوض میں کوئی چیز خرید لے یا ایک روپیہ کسی سے قرض لے اور بوقت ادا پیسے یا ایک روپیہ دے دے تو دائن اور فروخت کنندہ کو اختیار رہتا ہے کہ وہ لے یا نہ لے اور حاکم کی طرف سے اس پر جبر نہیں ہو سکتا کہ خواہ وہ پیسے لے لے، پس پیسہ اگرچہ عرفاً ٹمن ہے مگر عین ٹمن خلقی نہیں سمجھے گئے ہیں بخلاف نوٹ کے کہ یہ عین ٹمن خلقی ہے، گو عینیت خلقیہ نہیں بلکہ عینیت عرفیہ ہو، پس تقاضل بیع فلوس میں جائز ہونے سے یہ نہیں

لازم ہے کہ نوٹ میں بھی جائز ہو جائے کیونکہ پیسہ غیر جنس ثمن ہے حقیقتاً بھی اور عرفاً بھی گو بوجہ اصطلاح اور عرف کے اس میں ثمنیت آگئی ہو، پس ہر گاہ نوٹ عرفاً جمیع احکام میں عین ثمن خلتی سمجھا گیا، باب تقاضل میں اسی بنا پر حکم لگا دیا جائے گا اور تقاضل اس میں حرام ہوگا (مقالہ: مولانا محفوظ الرحمن مفتاحی)۔

۱۵۔ مفتی محمود حسن فرماتے ہیں: اب سے ۱۲، ۱۵ برس پہلے جتنے نوٹ قرض لئے تھے اتنے ہی نوٹ واپس کرنے کا حکم ہے، آگے فرماتے ہیں: اگر سوکا نوٹ لیا تھا تو سوکا نوٹ واپس کر دے بری الذمہ ہو جائے گا، اس کی گرانی سے اس پر اثر نہ ہوگا، جن کو نوٹ قرض دیا ہے ان سے نوٹ ہی واپس لینے کا حق ہے (فتاویٰ محمودیہ ۱۶/۴۰۶، ۴۰۷، باب القرض) (مقالہ: مولانا عبد التواب اناری)۔

☆ مولانا راشد حسین ندوی اور مولانا محمد حذیفہ محمود لکھتے ہیں کہ:

مفتی تقی عثمانی صاحب نے اس سلسلہ میں مفصل گفتگو کرتے ہوئے بعض سمیناروں کا اتفاق بھی اس بارے میں نقل کیا ہے، لکھتے ہیں:

”جب یہ مسئلہ پاکستان کی ”اسلامی نظریاتی کونسل“ کے سامنے بھی پیش ہوا تو کونسل کے تمام ارکان بشمول علماء و معاشین سب نے اس بات پر اتفاق کیا کہ ”قرضوں کے قیمتوں کے اشاریہ کے ساتھ ربط“ کے نظریہ کی شریعت اسلامیہ میں کوئی گنجائش اور وجہ جواز نہیں ہے“ (فقہی مقالات ۱/۷۲)۔

آگے لکھتے ہیں:

”اسی طرح خاص اسی موضوع پر ہونے والے سمینار میں بھی بحث کی گئی جس کو اسلامی ترقیاتی بینک جدہ، اور عالمی ادارہ برائے اسلامی اقتصادیات اسلام آباد نے مشترکہ طور پر شعبان ۱۴۰۷ھ میں منعقد کیا تھا، اس سمینار میں مختلف ممالک کے بہت سے علماء اور ماہرین معاشیات نے شرکت کی تھی، وہ قرارداد جس پر تمام شرکاء نے اتفاق رائے ظاہر کیا وہ مندرجہ ذیل ہے:

۱۔ کرنسی نوٹ تمام معاملات (مثلاً اس میں سود جاری ہونے اور زکوٰۃ واجب ہونے، بیع سلم اور مضاربت اور شرکت وغیرہ کے راس المال بننے) میں نقدین یعنی دراہم اور دنانیر کی طرح ہیں، اور امام ابو یوسف کا یہ قول کہ اگر سکوں کی قیمت زیادہ ہو جائے یا کم ہو جائے تو اس صورت میں قرض کی واپسی میں ادائیگی کے وقت نقدین کے تناسب سے سکوں کی قیمت واپس کرنا ضروری ہے، ان کا یہ قول کرنسی نوٹوں میں جاری نہیں ہوگا، اس لئے کہ یہ کرنسی نوٹ نقدین کے قائم مقام ہیں، اور ان نقدین کی قیمت بڑھنے اور کم ہونے کا معتبر نہ ہونا متفق علیہ ہے۔

۲۔ سمینار میں حاضر تمام علماء نے اس بات کی توثیق کی کہ سود اور قرض کی احادیث میں جو مثلیت اور برابری ضروری قرار دی گئی ہے وہ شرعی جنس اور قدر یعنی وزن، ناپ اور عدد میں برابری مراد ہے، قیمت میں برابری مراد نہیں، اور یہ بات ان احادیث کے ذریعہ پوری طرح واضح ہو جاتی ہے جو احادیث اموال ربویہ کے تبادلہ کے وقت عمدہ اور گھٹیا ہونے کے وصف کو غیر معتبر قرار دیتی ہیں اور اسی پر امت کا اجماع ہے اور اسی پر عمل جاری ہے۔

۳۔ ذمہ میں ثابت شدہ دیون چاہے وہ کسی بھی قسم کے ہوں، ان کو قیمتوں کے اشاریہ کے ساتھ منسلک کر دینا جائز نہیں، بایں طور کہ عاقدین عقد بیع یا عقد قرض کے وقت اس کرنسی کو جس کے ذریعہ عقد بیع یا عقد قرض کر رہے ہیں، کسی سامان کے ساتھ منسلک کر کے یہ شرط ٹھہرائیں کہ دیون ادائیگی کے وقت اس سامان کی قیمت موجودہ کرنسی میں ادا کرے گا (فقہی مقالات ۱/ ۷۲-۷۳)۔

انٹرنیشنل اسلامک فکد اکیڈمی جدہ کا فیصلہ بھی یہی ہے، لکھا ہے:

”کسی بھی کرنسی کے ذریعہ واجب دیون کی ادائیگی میں مثل کا اعتبار ہوگا، قیمت کا نہیں، کیونکہ دیون کی ادائیگی اپنے مثل سے ہوتی ہے، لہذا ذمہ میں واجب دیون کو خواہ وہ کسی طرح بھی واجب ہوئے ہوں قیمتوں کے اشاریہ (Price Index) سے مربوط کرنا جائز نہیں ہے“ (جدہ اکیڈمی کے فیصلے ۱۵۷)۔

دوبارہ اس مسئلہ پر غور کے بعد بھی یہی فیصلہ کیا گیا، چنانچہ آگے لکھا ہے:

”کسی بھی کرنسی سے لازم ہونے والے قرض کی ادائیگی میں مثل کا اعتبار ہوگا، قیمت کا نہیں، کیونکہ قرض کی ادائیگی اپنے مثل سے ہی ہوتی ہے، لہذا جائز نہیں ہوگا کہ ذمہ میں ثابت شدہ قرضوں کو چاہے جیسے ہوں نرخ کے معیار سے مربوط کیا جائے“ (جدہ اکیڈمی کے فیصلے ص ۳۴۳)۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب نے لکھا ہے:

”اشیاء صرف کی قیمتوں کے اشاریہ سے نوٹ کو وابستہ کرنے میں ایک تو بڑی دقت ہے، دوسرے: یہ اشاریہ محض تخمین پر مبنی ہوگا اور مختلف اشیاء کی قیمتوں کے اوسط سے اشاریہ مرتب کرنا پڑے گا، حالانکہ افراد و اشخاص کی نسبت سے ان اشیاء صرف کے تناسب اور ان کی ضرورت میں فرق واقع ہوتا رہتا ہے“ (جدید فقہی مسائل ۳۲/۳)۔

مولانا عتیق احمد بستوی صاحب لکھتے ہیں:

”اولاً تو اس لئے کہ اشاریہ دقیق فنی اصولوں پر مبنی ہوتا ہے، لہذا اس پر احکام شرعیہ کا دائرہ کرنا شریعت اسلامیہ کے مزاج کے خلاف معلوم ہوتا ہے، ثانیاً اس لئے کہ اشاریہ کی ترتیب کے لئے کوئی معیار مرتب کرنا انتہائی دشوار کام ہے، ملکوں، شہروں اور طبقتوں کا اشاریہ ایک دوسرے سے مختلف ہو سکتا ہے، بلکہ ہر فرد کا اشاریہ دوسرے سے مختلف ہو سکتا ہے، اس لئے اشاریہ کو بنیاد بنانے میں احکام منضبط نہیں ہو سکیں گے“ (جدید فقہی تحقیقات، کرنسی نوٹ ۶۹/۲)۔

مفتی اقبال محمد نیکاروی ایک آخری بات یہ کہتے ہیں:

بہر حال یہ بات بھی دیکھنے میں آئی کہ ماہرین معاشیات قرضوں میں حقیقی قیمت کے اعتبار کرنے کے نظریہ کی افراط زر کی صورت میں تو تائید کرتے ہیں لیکن تفریط زر کی صورت میں کوئی بھی اس کی تائید نہیں کرتا، تفریط زر کی صورت میں اگر دس فیصد قیمت گھٹ گئی تو کون شخص گوازا کرے گا کہ اس کو اپنے قرض دار سے ایک سو روپے کے بجائے نوے روپے مل جائے، مطلب تفریط زر کی صورت میں لاحق ہونے والے نقصان کو کوئی بھی قبول کرنے کے لئے تیار نہیں، اور اس نقصان کے خوف سے کوئی بھی اپنا روپیہ بینک میں رکھنے کے لئے تیار نہیں، معلوم

ہوا کہ "Real Value" حقیقی قیمت کا یہ نظریہ کوئی ٹھوس اور مبنی بر حقیقت بنیادوں پر قائم نہیں بلکہ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ افراط زر کے نقصان سے بچنے کے لئے "حقیقی قیمت" کو محض ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جا رہا ہے۔

☆ اکثر مقالہ نگاروں کی رائے ہے کہ مؤخر مطالبوں کو قیمتوں کے اشاریہ سے مربوط کرنے کا معاملہ دقیق فنی اصولوں پر مبنی ہے اور عامۃ الناس کا اسے سمجھنا بہت ہی مشکل ہے، اس لئے یہ عوام کے درمیان آپسی تنازعات کا سبب ہوگا، اور ربا کا دروازہ کھلنے کا اندیشہ ہے، بعض حضرات نے دلیل کے طور پر "نحن أمة أمیة لا نکتب ولا نحسب" (بخاری ۲۵۶۱، ابوداؤد ۷۱۳۱) والی روایت کو پیش کیا ہے (مقالہ: مولانا نعیم اختر قاسمی، مفتی محمد احتشام قاسمی، مفتی سید باقر ارشد قاسمی، مفتی انور علی اعظمی، مفتی لطیف الرحمن، مفتی ارشد شاداب ندوی، مفتی محمد خالد حسین نیوی، مفتی اقبال محمد نیکاروی)۔

☆ بعض مقالہ نگاروں نے وابستگی کے عدم جواز کی ایک بنیادی وجہ یہ لکھی ہے کہ اشاریہ اپنے تمام مراحل میں اٹکل و قیاس اور انداز و تخمین پر مبنی ہے، دلیل کے طور پر اس فقہی نظیر کو پیش کرتے ہیں:

"ولا يجوز بيع المزبنة وهو بيع التمر على رؤوس النخل بخرصة تمراً إنما لا يجوز هذا البيع لنهيه عليه السلام عن المزبنة والمحاولة" (الجوهرة النيرة ۲۳۶۱) (مقالہ: مولانا عطاء اللہ قاسمی، مولانا اشتیاق احمد اعظمی، مولانا نعیم اختر قاسمی، مولانا محمد حذیفہ محمود)۔

☆ مولانا سلطان احمد اصلاحی کا کہنا ہے کہ اس مسئلہ سے عہدہ برآ ہونے کے لئے سب سے بہتر طریقہ عدل کی جگہ احسان پر عمل ہے، عدل یہ ہے کہ میں ۱۰۰ روپے کے بدلے ۱۰۰ روپے لوٹاؤں، اور احسان یہ ہے کہ میں اس میں اپنی مرض سے ۱۰۰ روپے کا اضافہ کر دوں، یہ جائز ہی نہیں مستحسن ہے۔



☆ اکثر مقالہ نگار حضرات نے یہ بھی واضح کیا ہے کہ قرضوں کی واپسی میں جو برابری اور مثلیت شرط ہے تو وہ مقدار اور کمیت میں ہے، قیمت اور مالیت میں نہیں ہے (مقالہ: مولانا عبداللطیف پالپوری، مفتی انور علی اعظمی، مولانا محمد نصر اللہ ندوی، مولانا سلمان پالپوری، مولانا محمد حذیفہ محمود وغیرہ)۔

☆ مفتی محمد احتشام قاسمی اور مفتی اقبال محمد نیکاروی نے سوال میں مذکور اس جملہ پر کہ افراط زر کی صورت میں کاغذی نوٹ کی قوت خرید گر جاتی ہے، تعقیب کرتے ہوئے لکھا ہے کہ روپے کی قیمت خرید کم نہیں ہوتی یا بڑھتی نہیں ہے بلکہ ازرائی اور گرانی کا تعلق اشیاء سے ہوتا ہے نہ کہ ٹمن اور روپے سے، اس کی دلیل میں ابوداؤد کی روایت یہ پیش کی ہے:

۱- "عن عمرو بن شعيب عن أبيه عن جده قال: كانت قيمة الدية على عهد رسول الله ﷺ ثمان مائة دينار أو ثمانية آلاف درهم، فكان ذلك كذلك حتى استخلف عمرؓ فقال خطيباً: ألا إن الإبل قد غلت قال: ففرضها عمرؓ على أهل الذهب ألف دينار وعلى أهل الورق اثني عشر ألف درهم" (ابوداؤد ۲/۵۲۶)۔

۲- "عن معاذؓ قال: سمعت رسول الله ﷺ يقول: بشس العبد المحتكر أن أرخص الله الأسعار حزن وأن أغلاها فرح" (مشکوٰۃ ۲/۲۵۱، باب الاحتكار)۔

۳- "عن انسؓ قال: غلا السعر على عهد النبي ﷺ فقالوا: يا رسول الله! سعر لنا" (مشکوٰۃ ۲/۲۵۱، باب الاحتكار)۔

(مقالہ: مولانا خورشید احمد اعظمی، مفتی ارشد شاداب ندوی، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مولانا عطاء اللہ قاسمی، مفتی سید باقر ارشد قاسمی)۔

جواز کی صورت:

ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی لکھتے ہیں کہ کرنسی نوٹ افادیت میں وہی حکم رکھتی ہے جو ٹمن

خلقی (سونا چاندی) رکھتا ہے اس لئے اس کے ذریعہ تمامی معاملات درست و صحیح ہو جائیں گے۔ اور مولانا محمد صدر الحسن کا کہنا ہے کہ اگر اس کی ثمنیت کو باطل کر کے شیخین کے مسلک پر بیع کا درجہ دیا جائے تو فلوس پر قیاس کرتے ہوئے کمی بیشی کے ساتھ تبادلہ جائز ہوگا۔ مولانا نعیم اختر قاسمی نے ادائیگی کو قیمتوں کے اشاریے سے وابستہ کرنے کے صحیح ہونے کے لئے دو صورتوں کا ذکر کیا ہے، ایک تو یہ ہے کہ فریقین باہمی رضامندی سے کسی بھی مثلی چیز کو معیار بنا کر معاملہ طے کر لیں تو اس کے جائز ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے، اور دلیل کے طور پر شامی کا یہ جزئیہ نقل کیا ہے:

”وفی دعوی البزازیة من النوع الخامس عشر عن فوائد الامام ابی حفص الکبیر: استقرض منه دانق فلوس حال کونها عشر بدانق فصارت ستة بدانق او رخص و صار عشرون بدانق یاخذ منه عدد ما اعطی ولا یزید ولا ینقص، قلت هذا مبني على قول الامام، وهو قول ابی یوسف اولاً، وقد علمت ان المفتی به قوله ثانياً بوجوب قيمتها يوم القرض وهو دانق ای سدس درهم سواء صار الآن ستة فلوس بدانق أو عشرين بدانق“ (ردالمحتار ۲۴/۴)۔ اور حضرت ابو سعید خدریؓ سے مروی حدیث ترجمیب سے استدلال کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ چونکہ اموال ربویہ میں مساوات ضروری ہے تو برابری کی صورت میں عمدہ کھجور دینے والا خسارہ میں رہے گا، لہذا اس کو خسارہ سے بچانے کی آپ نے ایک تدبیر بتادی، تو اگر مؤخر مطالبات میں مذکورہ تدبیر اختیار کی جائے تو اسے بھی باب ربا کو کھولنے کا ذریعہ نہیں ہونا چاہئے۔

اور اس کی دوسری صورت یہ ہے کہ قرض دینے والا کسی غلہ وغیرہ کی قیمت طے کر کے اس کے حق میں بیع سلم یعنی ادھار خرید کا معاملہ کر کے طے شدہ مقدار کی قیمت دے دے اور ادائیگی کے موقع پر خواہ اصل سامان لے لے یا اسے قبضہ میں لے کر قرض لینے والے کے ہاتھ ہی بیچ ڈالے، یا اصل کی جگہ نقد یا جو چاہے بقدر مالیت لے لے، جیسا کہ یہ صورت مفتی محمد عبید اللہ

اسعدی صاحب نے بیان کی ہے (کرنسی کی شرعی حیثیت ۸۶)۔

لیکن مولانا رضوان الحسن مظاہری کار جحان ادائیگی کو قیمتوں کے اشاریے سے وابستہ کرنے کا ہے، وہ لکھتے ہیں:

اگر غور کیا جائے کہ کسی کے ذمہ دس سال پہلے کسی کے سونوٹ بطور قرض یا دین واجب الادا ہو جائیں تو کیا وہ شخص آج کے محض صوری اور عددی طور پر اس دین و قرض کے برابر نوٹ ادا کرنے سے فارغ الذمہ قرار دیا جائے گا؟ اور کیا ان دونوں نوٹوں میں مالیت اور قیمت خرید کے اعتبار سے تفاوت فاحش کے باوجود محض عددی اور صوری مساوات کی بنیاد پر ایک کو دوسرے کا مثل تسلیم کیا جائے گا؟ فقہی تصریحات سے اس کا جواب نفی میں نکلتا ہے، صاحب ہدایہ لکھتے ہیں:

”المماثلة بين الشئین تكون صورة و معنى“ (ہدایہ ثالث باب ربوا)۔

علامہ ابن ہمام فتح القدر میں لکھتے ہیں: ”المماثلة الحقيقية المطلوبة لا

تتحقق الا باعتبار الصورة والمعنى“۔

علامہ کاسانی بدائع الصنائع میں تحریر فرماتے ہیں: ”والمثل المطلق هو المثل

صورة ومعنى فأما القيمة فمثل من حيث دون الصورة“ (۱۵۰/۷)۔

ان عبارتوں سے واضح طور پر ثابت ہو رہا ہے کہ قیمت بھی دو چیزوں کے درمیان مماثلت مطلوبہ کے تحقق میں داخل ہے، اور اگر دو چیزیں محض صورتاً مماثل ہوں اور قیمتاً متفاوت تو مماثلت مطلوبہ فوت ہو جائے گی، علامہ ابن قیم اعلام الموقعین ۲/۵۲ میں جنساً صفةً مالیۃً مقصوداً اور ارتفاعاً ہر طرح کے مساوات کو مماثلت کے لئے ضروری کہتے ہیں۔

المعنى (۳۵۲/۳) میں وسیط سے امام غزالی کا قول نقل کیا ہے کہ ”والصحيح أنه

المثل الذى تماثل أجزاء فى القيمة والمنفعة“، ظاہر ہے کہ ان تصریحات کی موجودگی

میں دونوں میں قدر و قیمت اور مالیت کے مابین تفاوت فاحش کے باوجود ایک دوسرے کا مثل

کہنا بہت مشکل ہوگا، جس کا صاف مطلب یہی نکلتا ہے کہ نوٹوں کے ذریعہ مطالبات مؤخرہ کی

ادائیگی میں قیمت و مالیت کا اعتبار ضرور ہونا چاہئے تاکہ ادا مثل بن کر فارغ الذمہ ہو جائے ورنہ اتلاف حق کی بنا پر عند اللہ مواخذہ کا خطرہ ہو سکتا ہے، فقہاء لکھتے ہیں:

”يجزون رد العين المستقرضة مادامت لم تتعيب بعيب ينقص ماليتها  
 أما إذا تعيب لا يصح ردھا“، جب عین مستقرضہ کی واپسی عیب ہونے سے پہلے جائز ہے،  
 بعد میں نہیں، تو اس سے پتہ چلتا ہے کہ عیب ایک مثلی کو مثلی رہنے نہیں دیتا اور عیب دار چیز سالم من  
 العیب کا مثل نہیں ہو سکتی، اور اس کے ساتھ فقہاء کا یہ کلیہ پیش نظر رکھا جائے: ”کل ما أوجب  
 نقصان الثمن في عادة التجار فهو أعيب لأن الضرر بنقصان المالية وذلك  
 بانتقاص القيمة والمرجع في معرفته عرف أهله“ (ہدایہ ثالثہ / ۲۳)۔

جب ہر وہ چیز جو تاجروں کے عرف میں اشیاء کی قیمت کے نقصان کا سبب بن جائے  
 وہ عیب ہے جس کی بنیاد پر ہر مشتری کو بیع واپس کرنے کا حق مل جاتا ہے اس لئے کہ مالیت کی کمی  
 سے اس کا ضرر اور نقصان ہوتا ہے اور دفع ضرر ہر شخص کا شرعی حق ہے، اور مالیت کی کمی قیمت کے کم  
 ہونے سے ہوا کرتی ہے تو کیا نوٹوں کی قیمت میں کمی ہونا صاحب حق کے لئے باعث ضرر نہیں  
 ہوگا، اور اس کے دفع کا حق نہیں ملے گا، یقیناً ملے گا اور ملنا چاہئے، کیونکہ یہ کاغذی نوٹ ان  
 سارے عیبوں کے ساتھ ماضی کے ان نوٹوں کا مثل کیسے قرار دیا جاسکتا ہے جو اپنے وقت میں ان  
 عیبوں سے محفوظ تھا، اور پھر سب سے بڑھ کر قوی اور نص صریح تو اس سلسلے میں حضرت امام  
 ابو یوسف کا مشقی بہ قول موجود ہے، کہ اگر دراہم مغشوشہ اور فلوس نافقہ جو ثمن اصطلاحی کے درجہ کی  
 چیز ہے اس کے ذریعہ بیع و شراء کا معاملہ کیا جائے یا قرض دیا جائے اور ابھی بیع میں ثمن کی یا معاملہ  
 استقراض میں اس قرض کی ادائیگی نہ ہو سکی تھی کہ ان دراہم مغشوشہ اور فلوس نافقہ کا چلن بند ہو گیا  
 یا اس کی قدر و قیمت میں کمی آگئی، تو اس مشتری اور مستقرض پر ثمن اور قرض میں لئے دراہم و فلوس  
 کی قیمت لازمی ہوگی۔ یعنی بیع و شراء کے دن یا قرض کے مسئلہ میں قبضہ کے دن، ان دراہم و فلوس  
 کی جو قیمت اور جتنی قدر و مالیت تھی اتنی ہی قیمتی اور مالیت کی چیز بطور ثمن مشتری پر اور بطور ادا

قرض مستقرض پر ضروری ہوگا۔

”قال الثانی ثانیاً علیہ قیمتہا من الدراہم یوم البیع والقبض وعلیہ الفتوی ای یوم البیع فی البیع و یوم القرض فی القرض فلا فرق بین الکساد والرخص والغلاء فی لزوم القیمۃ“ (شامی ۳/۳۲۵)۔

بہر حال ان مذکورہ بالا تمام فقہی تصریحات و نظائر کی روشنی میں، اور حالات حاضرہ میں معیشت کی تباہ کاری اور معاشی خستہ حالی اور کرنسی نوٹوں کی گرتی قیمت کو دیکھ کر اور عرف اور عموم بلوی کو سامنے رکھ کر غور کیا جائے۔

مولانا عبدالقیوم پالنپوری اور مولانا سلمان پالنپوری لکھتے ہیں کہ پنشن کو قیمتوں کے اشاریے کے ساتھ وابستہ کرنا جائز ہے، کیونکہ پنشن شرعاً دین نہیں ہے بلکہ مستاجر کی طرف سے ملازم پر تبرع و احسان ہے، مفتی محمود حسن گنگوہیؒ ایک سوال کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:

ملازمت سے سبکدوش پر تازیت ملازم کو رقم ماہانہ مستعین کر کے بنام حق الخدمت دینا واجب نہیں بلکہ تبرع ہے، جس پر جبر نہیں کیا جاسکتا، بلکہ اس کا دل چاہے دے نہ چاہے نہ دے..... اسی طرح یہ بھی اختیار ہے کہ اندازہ کر کے مجموعی رقم ایک مشت دے دے..... (فتاویٰ محمودیہ ۱۶/۱۱۵)۔

مولانا راشد حسین ندوی اس کی تائید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

البتہ تنخواہ اور پنشن جب قرض نہ بنیں اور متعاقدین کے درمیان یہ معاہدہ ہو جائے کہ یہ تنخواہ یا پنشن ہر سال قیمتوں کے اشاریہ کے ساتھ بڑھتی رہے گی تو اس کا حکم الگ ہوگا، اس لئے کہ سال ختم ہونے کے بعد گویا عقد کی تجدید ہوگی، اور نئی تنخواہ یقینی طور سے فریقین کو معلوم ہو جائے گی، لہذا شرعاً اس میں کوئی حرج نہ ہوگا (فقہی مقالات ۲/۷۵)۔

سونے چاندی کے ذریعہ طے شدہ معاملات میں مساوی نوٹوں کی ادائیگی:

سوال نمبر ۲- کیا یہ جائز ہوگا کہ نوٹوں کی شکل میں قرض دیتے وقت یا مہر کے تقرر کے

وقت یا ادھار فروختگی کے وقت طرفین واجب الادا نوٹ کی مالیت سونے یا چاندی میں طے کر لیں اور بوقت ادائیگی اسی قدر سونے یا چاندی کی قیمت کے مساوی نوٹوں کی ادائیگی عمل میں آئے؟ بعض حضرات نے سونے چاندی کی قیمت کے مساوی ادائیگی پر معاملہ کرنے کو ناجائز قرار دیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ اس میں ربا کی صورت پائی جاتی ہے (مقالہ: مفتی ارشد شاذاب ندوی، مفتی سید باقر ارشد قاسمی، مولانا محمد جعفر علی، مولانا خورشید احمد اعظمی، مولانا سلمان پالنپوری، مولانا اشتیاق احمد اعظمی، مولانا عبداللطیف پالنپوری، مولانا محمد صدر الحسن، مفتی انور علی اعظمی، مولانا عطاء اللہ قاسمی، مولانا عبدالنواب اناری، مولانا محمد شاہ جہاں ندوی، مفتی اقبال محمد نیکاروی)۔

حدیث سے:

”عن عبادة بن الصامت قال: قال رسول الله ﷺ: الذهب بالذهب والفضة بالفضة والبر بالبر والشعير بالشعير والتمر بالتمر والملح بالملح مثلا بمثل سواء بسواء يداً بيد فإذا اختلفت هذه الأصناف فبيعوا كيف شئتم إذا كان يداً بيد“ (صحیح مسلم، باب الصرف وبيع الذهب بالورق نقداً) (مقالہ: مفتی سید باقر ارشد قاسمی وغیرہ)۔

فقہ سے:

۱- ”ولو استقرض فلوسا نافقة وقبضها ولم تكسد لكنها رخصت أو غلت فعليه رد مثله ما قبض بلاخلاف“ (بدائع الصنائع ۷/۲۳۷) (مقالہ مولانا عبدالنواب اناری)۔

۲- ”رجل استقرض من آخر مبلغاً من الدراهم والتصرف بها ثم غلى سعرها فهل عليه ردها مثلاً؟ الجواب نعم، ولا ينظر إلى غلاء الدراهم و رخصتها“ (تنقيح الفتاوى الحامدية ۱/۲۹۳) (مقالہ: مولانا عبدالنواب اناری)۔

۳- ”يعمل بمثل ما عملوا من اعتبار تغيرات الغرف وأحوال الناس

وما هو أرفق بالناس وما ظهر عليه التعامل“ (رسم المفتی بس ۹۷) (مقالہ: مفتی سید باقر ارشد قاسمی)۔

۳- ”سئل عن رجل أقرض آخر مقدارا من الريال المحیدی وقت رواجه بثلاثین قرشاً ثم رد المستقرض له مثل المقدار الذی استقرضه منه بعد أن نزل إلى عشرين قرشاً فامتنع المقرض من قبوله وطلب منه صرفها على سعر ثلاثین قرشاً فهل لیس له ذلك؟ فالجواب أنه لیس له الامتناع من قبول مثل ما دفع..... وفي نتیجه الفتاوی مانصه والمقبوض على وجه القرض مضمون بمثله، وفيها نقلا عن جامع الفصولین والواجب فی القرض رد المثل“ (الفتاوی الکامیہ ۹۲، مکتبہ حقانیہ پشاور) (مقالہ: مولانا عبدالنواب اناری)۔

۵- مولانا تقی عثمانی صاحب تحریر فرماتے ہیں: جب کوئی شخص دوسرے کو قرض دینا چاہتا ہے تو اس کو پہلے یہ فیصلہ کرنا چاہئے کہ اس قرض کے ذریعہ اس کی امداد کرنا چاہتا ہے یا اس کے منافع میں حصہ دار بننا چاہتا ہے؟ اگر وہ منافع میں حصہ دار بننا چاہتا ہے تو پھر اس کے ساتھ نقصان میں بھی حصہ دار بنے، اور وہ اس طرح کہ اس کے ساتھ شرکت یا مضاربت کا معاملہ کرے، اور اگر صرف امداد کرنا چاہتا ہے تو پھر یہ سوچ لے کہ قرض دینا ایسا ہے جیسے کوئی شخص اپنے پیسے اٹھا کر صندوق یا الماری میں تالہ لگا کر رکھ دے اور پھر اس الماری یا صندوق میں رکھے ہوئے روپیوں پر پانچ سال گذر جائیں تو اس دوران ان روپیوں کی قیمت کم ہو جائے گی، جس کی وجہ سے روپے رکھنے والے کا نقصان ہو جائے گا، تو اس نقصان کی تلافی کون کرے گا؟ ظاہر ہے کوئی نہیں کرے گا، اسی طرح آپ نے کسی کو قرض دیا تو وہ ایسا ہی ہے جیسے آپ نے صندوق یا الماری میں پیسے اٹھا کر رکھ دیئے، اس لئے یہ بات درست نہیں کہ دیون کی ادائیگی میں قوت خرید کا اعتبار کیا جائے گا (تقریر ترمذی ۱۵۳) (مقالہ: مولانا اشتیاق احمد اعظمی)۔

۶- مولانا محمد شاہ جہاں ندوی اس کے عدم جواز کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ عقود کی صحت کے



لئے لازمی شرط معلومیت ہے، اور ایسی صورت میں عقد کے وقت دونوں فریق میں سے کسی کو یہ نہ معلوم ہو سکے گا کہ ادائیگی کے وقت مجھ کو کتنے روپے لینے ہیں یا کتنے روپے لوٹانے ہیں، اور ایسی جہالت کی وجہ سے عقد فاسد ہو جائے گا، درمختار میں ہے:

”و شرط لصحته معرفة قدر مبيع و ثمن“ (الدر المختار للحکشی ۱/۲۸۷)۔

اور ردالمختار میں ہے:

”و خرج أيضا مالو كان الثمن مجهولا كالبيع بقيمته أو برأس ماله أو بما اشتراه أو مثل ما اشتراه فلان، فإن علم المشتري بالقدر في المجلس جاز“ (ردالمختار ۱/۲۹۷)۔

لیکن مولانا محمد جعفر ملی اور مولانا خورشید احمد اعظمی کا کہنا ہے کہ اس کی جائز صورت یہ ہو سکتی ہے کہ مہر وغیرہ کا تقرر سونا یا چاندی سے کیا جائے اور ادائیگی کے وقت مقررہ مقدار کے مساوی کرنسی نوٹ کی شکل میں ادا کیا جائے، جیسا کہ عبداللہ بن عمر کی حدیث میں ہے:

۱- ”كنت أبيع الإبل بالبيع فأبيع بالدنانير فأخذ مكانها الورق، وأبيع بالورق فأخذ مكانها الدنانير فأتيت رسول الله ﷺ فوجدته خارجا من بيت حفصة، فسألته عن ذلك فقال: لا بأس به بالقيمة“ (سنن الترمذی ۳۳۵۳، رقم: ۱۲۳۲) (دیکھئے مقالہ: مفتی انور علی اعظمی، مولانا عبداللطیف پالنپوری، مولانا محمد شاہ جہاں ندوی، مفتی عبدالرحیم قاسمی، مفتی محمد خالد حسین نیوی، مولانا عبدالنواب اناری)۔

جبکہ مولانا محبوب فروغ قاسمی کہتے ہیں کہ:

مہر واجرت وغیرہ جن میں مبادلۃ الدیون نہیں ہوتا ان میں احسن طریقہ تو یہی ہے کہ سونے و چاندی سے مہر یا اجرت متعین کیا جائے، لیکن جن معاملات میں مبادلہ ہوتا ہے، جیسے قرض وغیرہ ان میں سونا و چاندی اس دین کی قیمت ہوں گے، یا مہر واجرت کاغذی نوٹوں سے متعین کرنے کے بعد سونے و چاندی سے مالیت کو متعین کرنے کی صورت میں بھی سونا یا چاندی

کاغذی نوٹوں کی قیمت ہوگی تو ان صورتوں میں مندرجہ ذیل خرابیاں لازم آئیں گی۔

الف۔ نوٹوں کی مالیت کا تعین سونے و چاندی سے کرنا دقیق فنی اصول پر مبنی ہے جو سیدھی

سادہ امت کے مزاج و احوال کے مناسب نہیں، حضور ﷺ نے ایک حدیث میں ارشاد فرمایا:

”نحن أمة أمية لا نكتب ولا نحسب“ (بخاری ۲۵۶/۱ کتاب الصوم، باب قول النبی

ﷺ لا نكتب ولا نحسب)۔

ہم امی لوگ ہیں حساب و کتاب سے واقف نہیں، یعنی ایسے حساب و کتاب جو دقیق

ہوں، غلطیوں کا احتمال ہو اس سے واقف نہیں، لہذا نوٹوں کو سونے و چاندی سے مالیت متعین

کرنے میں امت کو بڑی الجھن میں پھنسانا ہے۔

ب۔ پھر ہر دیار بلکہ ہر روز کی قیمتوں میں اتار چڑھاؤ تیزی سے ہو رہا ہے، اگر مدار اس

کو بنایا جائے تو منازعت کا سبب بھی ہوگا۔

ج۔ مذکورہ بالا صورت میں بیع الکالی بالکالی لازم آئے گی اس لئے کہ سونا و چاندی

بھی دین ہے، اور کاغذی نوٹ بھی دین ہے، اس کی ممانعت تو صحیح حدیثوں میں وارد ہے۔

د۔ نیز یہ ربا النسیئہ ہے، کہ نقدین پر مجلس میں تقابض نہیں ہوا، قبل ازیں تصرف ہو گیا،

جس کی حرمت میں کوئی اشتباہ نہیں، اس لئے اس طرح قیمتوں کے تعین میں فساد کی وجہ کر گنجائش

معلوم نہیں ہوتی ہے۔

اس موضوع پر اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کے علاوہ مختلف اکیڈمیوں اور تنظیموں نے

سمینار منعقد کئے، ۱۴۰۷ھ میں ایک سمینار اسلامی ترقیاتی بینک جدہ اور عالمی ادارہ برائے اسلامی

اقتصادیات اسلام آباد نے مشترکہ طور پر منعقد کیا تھا، اس سمینار میں علماء و مفتیان کرام کے علاوہ

ماہرین اقتصادیات بھی جمع ہوئے، اور سب نے متفقہ طور پر جو قرارداد پاس کیا وہ بھی مذکورہ نظریہ

کی تائید کے لئے کافی ہے:

”سمینار میں حاضر تمام علماء نے اس بات کی توثیق کی ہے کہ سود اور قرض کی احادیث

میں جو مثلثیت اور برابری ضروری قرار دی گئی ہے وہ شرعی جنس اور قدر یعنی وزن، ناپ اور عدد میں برابری مراد ہے، قیمت میں برابری مراد نہیں، اور یہ بات احادیث کے ذریعہ پوری طرح واضح ہو جاتی ہے جو احادیث اموال ربویہ کے تبادلہ کے وقت عمدہ اور گھٹیا ہونے کے وصف کو غیر معتبر قرار دیتی ہیں، اور اس پر امت کا اجماع ہے اور اسی پر عمل جاری ہے۔

ذمہ میں ثابت شدہ دیون چاہے وہ کسی بھی قسم کے ہوں ان کو قیمتوں کے اشاریہ کے ساتھ منسلک کر دینا جائز نہیں بایں طور کہ عاقدین عقد بیع یا عقد قرض کے وقت اس کرنسی کو جس کے ذریعہ عقد بیع یا عقد قرض کر رہے ہیں کسی سامان کے ساتھ منسلک کر کے یہ شرط ٹھہرائیں کہ دیون ادائیگی کے وقت اس سامان کی قیمت موجودہ کرنسی میں ادا کرے گا (یہ جائز نہیں ہے) (بحوالہ: فقہی مقالات مولانا محمد تقی عثمانی ار ۳۷ مطبوعہ زمزم بکڈ پوڈیو بند)۔

۲- علامہ شامی فرماتے ہیں: ”وفی البزازیة معزیا إلی المنتقی غلت الفلوس أو رخصت فعند الامام الأول والثانی أولاً لیس علیہ غیرها وقال الثانی ثانیاً علیہ قیمتھا من الدراهم یوم البیع والقبض وعلیہ الفتوی فحیث صرح بأن الفتوی علیہ فی کثیر من المعترات فیجب أن یعول علیہ افتاءً وقضاءً“ (تنبیہ الرقود علی مسائل الفقہ، رسائل ابن عابدین ۶۰/۲) (مقالہ: مفتی محمد خالد حسین نیوی)۔

لیکن مولانا محمد حذیفہ محمود نے امام ابو یوسف کے قول سے استدلال کو محل نظر قرار دیا ہے، علامہ شامی نے لکھا ہے: ”وفی المنتقی: إذا غلت الفلوس قبل القبض أو رخصت قال أبو یوسف قولی وقول أبی حنیفة فی ذلک سواء ولیس له غیرها ثم رجع أبو یوسف وقال علیہ قیمتھا من الدراهم یوم وقع البیع ویوم وقع القبض“ (تنبیہ الرقود علی مسائل الفقہ رسائل ۵۵/۲)۔

وجہ نظریہ ہے کہ امام ابو یوسف کا مذکورہ بالا قول ایسے فلوس کے بارے میں ہے جس کا کسی دوسرے شے کے ساتھ دائمی ربط اور تعلق ہو کہ وہ فلوس اس شے کے لئے بطور اجزاء اور

ریزگاری کے استعمال ہوتے ہوں، جیسا کہ علامہ شامی کی ایک عبارت سے واضح ہوتا ہے، لکھا ہے: ”ویدل علیہ ایضا تعبیرہم بالغلاء والرخص فانہ انما یظہر اذا کانت غالبۃ الغش تقوم بغيرها“ (تنبیہ الرقود علی مسائل القنود ۲/۶۰)، اس عبارت میں ”تقوم بغيرها“ کے الفاظ سے واضح ہوتا ہے کہ وہ فلوس کے سکے اور غالب الغش دراہم دوسرے یعنی سونے چاندی کی کرنسی سے وابستہ تھے، اور سونے چاندی کی بنیاد پر ہی ان کی قیمت مقرر ہوتی تھی، اور یہ سکے سونے چاندی کی کرنسی کے لئے بطور ریزگاری اور چینج کے استعمال ہوتے تھے، لیکن جہاں تک موجودہ کرنسی نوٹوں کا تعلق ہے ان کا کسی دوسرے ثمن کے ساتھ ربط اور تعلق نہیں ہے اور نہ ہی وہ کرنسی کی ثمن کے لئے بطور ریزگاری اور اجزاء کے استعمال ہوتی ہے، بلکہ وہ خود مستقل اصطلاحی ثمن ہے، اس کے علاوہ فلوس کی صحیح قیمت معلوم کرنا امام ابو یوسف کے قول کے مطابق ممکن ہے اس لئے کہ فلوس ثمن کے ایک معین معیار یعنی دراہم کے ساتھ مربوط ہیں، بخلاف موجودہ کرنسی نوٹوں کے کہ موجودہ معاشی اصطلاح کے لحاظ سے ان کی حقیقی قیمت ٹھیک ٹھیک معلوم کرنا ممکن نہیں، بلکہ حقیقی قیمت اندازہ اور تخمینہ کی بنیاد پر فرض کی جائے گی، اس لئے موجودہ کرنسی نوٹوں کو فلوس پر قیاس کرنا درست نہیں ہے، اور امام ابو یوسف کے قول سے استدلال بھی صحیح نہیں ہے۔

اسلامی ترقیاتی بینک جدہ اور عالمی ادارہ برائے اسلامی اقتصادیات، اسلام آباد کے تحت منعقد ہونے والے سمینار کی قراردادوں میں ہے:

”کرنسی نوٹ تمام معاملات (مثلاً اس میں سود جاری ہونے اور زکوٰۃ واجب ہونے، بیع سلم اور مضاربت اور شرکت وغیرہ کے راس المال بننے) میں نقدین یعنی دراہم و دنانیر کی طرح ہیں، اور امام ابو یوسف کا یہ قول کہ اگر سکوں کی قیمت زیادہ ہو جائے یا کم ہو جائے تو اس صورت میں قرض کی واپسی میں ادائیگی کے وقت نقدین کے تناسب سے سکوں کی قیمت واپس کرنا ضروری ہے، ان کا یہ قول کرنسی نوٹوں میں جاری نہیں ہوگا، اس لئے کہ یہ کرنسی نوٹ نقدین کے قائم مقام ہیں، اور ان نقدین کی قیمت بڑھنے اور کم ہونے کا معتبر نہ ہونا متفق علیہ ہے (فقہی مقالات ۱/۷۲)۔“

۳۔ مفتی نظام الدین صاحب فرماتے ہیں:

اس قرض میں لئے ہوئے نوٹوں کی قرض لینے کے زمانے میں جتنی چاندی ملتی یا جتنا سونا ملتا اتنی چاندی میں یا اتنے سونے میں جتنے نوٹ آج بوقت ادائلیں اتنے ہی نوٹ دینے ہوں گے، پس نقدین میں سے جو زیادہ رائج ہوگا اس کا اعتبار ہوگا، اور نوٹ اس کے تابع ہوں گے (نظام الفتاویٰ ۱/۲۳۲) (مقالہ: مفتی محمد خالد حسین نیوی)۔

لیکن مفتی خالد حسین نیوی یہ شرط لگاتے ہیں کہ یہ تفصیلات اس وقت ہوں گی جب قرض دیتے وقت یا معاملہ کرتے وقت رقم کی مالیت کا آئندہ اندیشہ کے پیش نظر سونے یا چاندی میں طے کر لے ورنہ نہیں، اس لئے کہ صاحب دین کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے حق کلی کا جزوی طور پر معاف کر دے یا کم کر دے۔

جواز کے قائلین:

بعض حضرات کا کہنا ہے کہ نوٹوں کی شکل میں قرض دیتے وقت، مہر مقرر کرتے وقت یا ادھار فروختگی کا معاملہ کرتے وقت اگر اس کی مالیت سونے چاندی میں طے کر لیں اور بوقت ادائیگی سونے چاندی کے مساوی نوٹوں کی ادائیگی عمل میں آئے تو یہ درست ہے (مقالہ: مولانا نعیم اختر قاسمی، مفتی محمد احتشام قاسمی، مفتی لطیف الرحمن، مولانا سلمان پالپوری، مولانا کلیم اللہ عمری، محمد احسن عبدالحق ندوی، مولانا امداد اللہ قاسمی، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مولانا ذکاء اللہ شبلی، مولانا سید اسرار الحق سبیلی، مفتی ثناء الہدیٰ قاسمی، مولانا راشد حسین ندوی)۔

لیکن مفتی عبد الرحیم قاسمی اور مولانا محفوظ الرحمن مفتاحی کا کہنا ہے کہ اگر روپے مقرر کئے ہیں تو اتنی ہی تعداد کے روپے ادا کئے جائیں گے، جیسا کہ المبسوط میں ہے:

”وإن اشتری فاکهة بدائق فلس والدائق عشرون فلسا فلم یرد الفلوس حتی غلت أو رخصت فعلیہ عشرون فلسا لأن بالفلاء والرخص لا ینعدم صفة

الشمیة وصار هو عند العقد بتسمية الدوائق مسميا ما يوجد به من الفلوس  
وذلك عشرون ولو صرح بذلك القدر لم يتغير العدد بعد ذلك بغلاء  
السعر و رخصه فهذا مثله“ (المبسوط ۳۱/۲۹)۔

اور مولانا عبداللطیف پالنپوری اس میں یہ اضافہ کرتے ہیں کہ نوٹ ادا کرنے کی صورت  
میں اسی مجلس میں نوٹ پر قبضہ ضروری ہے تاکہ بیع الدین بالدين لازم نہ آئے، ہدایہ میں ہے:  
”ولا يصح السلم حتى يقبض رأس المال قبل أن يفارقه فيه أما إذا كان  
من النقود فلأنه افتراق عن دين بدين و قد نهى النبي عليه السلام عن الكالني  
بالكالني“ (ہدایہ ۳/۹۶ باب السلم)۔

جبکہ مولانا امداد اللہ قاسمی کا کہنا ہے کہ نوٹ فلوس کے حکم میں ہیں، لہذا ان کے ذریعہ  
سونے یا چاندی کا تبادلہ ادائیگی کے دن کی قیمت کے اعتبار سے درست ہوگا۔  
مفتی محمد احتشام قاسمی کا کہنا ہے کہ یہ صورت صحیح اور جائز تو ہے لیکن یہ صورت بھی عوام  
الناس کے لئے مشکلات اور تنازعات سے خالی نہیں ہے، مثلاً حقدار چاہے گا کہ میرا حق اس وقت  
ملے جب سونے چاندی کی قیمت گراں ہو اور مقروض چاہے گا کہ اس وقت ادا کروں جب ان کی  
قیمت ارزاں ہو، جو نزاع کا باعث ہے، اور اس تعلق سے درج ذیل عبارت کو مستدل بنایا ہے:  
”يعمل بمثل ما عملوا من اعتبار تغيرات العرف وأحوال الناس وما  
هو أرفق بالناس وما ظهر عليه التعامل“ (رسم المفتی ۱/۹۷)۔



## عرض مسئلہ:

## موجودہ کرنسی کی شرعی حیثیت

مولانا راشد حسین ندوی ☆

فقہ اکیڈمی کے انیسویں فقہی سمینار کا ایک اہم موضوع ”موجودہ کرنسی کی شرعی حیثیت“ سے متعلق ہے، اس موضوع کے کئی اجزاء پر دوسرے فقہی سمینار میں بحث ہو چکی ہے، موجودہ سمینار میں صرف دو سوالات کو موضوع بحث بنایا گیا ہے جن پر دوسرے سمینار میں فیصلہ نہیں ہو سکا تھا:

۱- مؤخر مطالبات کو اشاریہ سے مربوط کرنے کا حکم۔

۲- مؤخر مطالبات کو سونے یا چاندی سے مربوط کرنے کا حکم۔

اس موضوع پر اکیڈمی کو ۲ مقالات موصول ہوئے ہیں، جن کے عرض مسئلہ کی ذمہ داری راقم کے سپرد کی گئی ہے:

سوال نامہ کے پہلے سوال کا حاصل یہ تھا کہ مؤخر مطالبات مثلاً قرض مہر، پنشن، ادھار خریداری کی رقم اور وقت پر ادانہ ہونے والی تنخواہوں کی ادائیگی کو اشاریہ سے وابستہ کرنا شرعاً کیسا ہے؟ جواب میں تین طرح کی آراء ظاہر کی گئی ہیں:

پہلی رائے: اکثر مقالہ نگار حضرات نے مؤخر مطالبات کو اشاریہ سے مربوط کرنے کو شرعاً ناجائز قرار دیا ہے، ان حضرات کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں:

مفتی عبدالرحیم قاسمی، مفتی انور علی اعظمی، قاضی و مفتی احتشام قاسمی، مولانا محبوب فروغ قاسمی، مولانا اشتیاق احمد اعظمی، مولانا عطاء اللہ قاسمی، مولانا خورشید احمد اعظمی، مولانا صدر الحسن مظفر

☆ مدرسہ ضیاء العلوم، رائے بریلی۔

پوری، مفتی سید باقر ارشد قاسمی، مولانا امداد اللہ قاسمی، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مولانا نعیم اختر قاسمی، مولانا عبدالنواب اناوی، مولانا نصر اللہ ندوی، مولانا محمد شاہ جہاں ندوی، مفتی لطیف الرحمن، مولانا محفوظ الرحمن، مولانا عبداللطیف پالنپوری، مولانا احسن عبدالحق ندوی، مولانا کلیم اللہ عمری۔

دوسری رائے: جبکہ مولانا ذکاء اللہ شبلی اور مولانا رضوان الحسن مظاہری نے اس کے جواز کی رائے ظاہر کی ہے۔

تیسری رائے: پہلی رائے ہی کی طرح ہے یعنی مؤخر مطالبات کو اشاریہ سے مربوط کرنا درست نہیں ہے، لیکن اس میں پنشن کو صراحت سے الگ کر دیا گیا ہے، اور اس کو اشاریہ سے مربوط کرنے کو جائز قرار دیا گیا ہے، یہ رائے مولانا سلمان پالنپوری اور مولانا عبدالقیوم پالنپوری صاحب کی ہے، راقم الحروف نے بھی یہی رائے اختیار کرتے ہوئے قرض نہ بننے والی تنخواہ کا بھی یہی حکم لکھا ہے۔

### مجوزین ربط کے دلائل:

اشاریہ سے وابستگی کو جائز قرار دینے والوں میں سے مولانا رضوان الحسن مظاہری نے مندرجہ ذیل دلائل سے استدلال کیا ہے:

۱- ایک ملک کی کرنسی کا دوسرے ملک کی کرنسی سے تبادلہ تفاوت کے ساتھ جائز قرار دیا گیا ہے تاکہ عدل و انصاف کے تقاضوں کو پورا کیا جاسکے، تو عدل و انصاف ہی کے تقاضے کے پیش نظر مؤخر مطالبات میں اس کا خیال کیوں نہ رکھا جائے جبکہ قوت خرید اور مالیت میں تفاوت معلوم و شاہد ہے۔

۲- قرآن و سنت و نصوص عدل و انصاف کا حکم دیتے ہیں، اور انہیں نوٹوں کی ادائیگی عدل و انصاف کے تقاضے پورا کرنے سے قاصر ہیں، قرآن میں ہے: "اعدلوا ہو اقرب للتعوی، لا تظلمون ولا تظلمون، ولا تبخسوا الناس اشیاءہم"، حدیث میں ہے:



”لا ضرر ولا ضرار فی الإسلام“۔

۳۔ امام ابو یوسف کا قول: ”قد علمت أن المفتی به قوله جوب قیمتها یوم

القرض“ (شامی ۴/۲۳)۔

۴۔ اگر دو چیزیں محض صورتہ متماثل ہوں اور قیمتاً متفاوت ہوں تو مماثلت مطلوبہ

فوت ہو جائے گی، جس کو علامہ ابن القیم اور امام غزالی نے ضروری قرار دیا ہے۔

ناجائز قرار دینے والے حضرات کے دلائل:

اشاریہ سے ربط کو ناجائز قرار دینے والے حضرات نے مندرجہ ذیل دلائل سے

استدلال کیا ہے:

۱۔ نوٹ کو نقدین کے حکم میں مان لیا گیا ہے تو اب قیمت کے تفاوت کا اعتبار نہیں ہوگا،

مقدار میں برابری اور تماثل ضروری ہوگا، سو روپے قرض لئے تو سو روپے ہی کی واپسی ضروری

ہوگی ورنہ وبال لازم آئے گا، جیسا کہ اموال ربویہ سے متعلق احادیث میں ہے، مثلاً:

الف۔ عامل خیبر سے متعلق حدیث: ”أو کل تمر خیبر هکذا“ (بخاری ۲۲۰۱،

مسلم ۱۵۹۳)۔

ب۔ ”الذهب بالذهب وزنا بوزن (الی) فمن زاد أو استزاد فهو

ربا“ (مسلم ۴۰۶۹)۔

ج۔ ”لا تبیعوا الدینار بالدینارین ولا الدرهم بالدرهمین“ (مسلم

۴۰۵۷) (مولانا احسن عبدالحق ندوی، مولانا عبدالقیوم پالنپوری، مولانا سلمان پالنپوری، مولانا

عبدالنور اناری، مولانا عطاء اللہ قاسمی، مولانا اشتیاق احمد اعظمی، مولانا محفوظ الرحمن منو، مفتی

لطیف الرحمن، مولانا محمد شاہ جہاں ندوی، مولانا نصر اللہ ندوی، مولانا امداد اللہ قاسمی، مفتی انور علی

اعظمی، راقم الحروف راشد حسین ندوی)۔

۲۔ مؤتمر اسلامی کی مجمع الفقہ اسلامی، نیز رابطہ عالم اسلامی کی مجمع الفقہ اسلامی

دونوں نے یہ قرار داد منظور کر لی ہے کہ نوٹ کی حیثیت سونے چاندی جیسی ہے "إن العملة الورقية نقد قائم بذاته له حكم النقدين من الذهب والفضة"۔

اور یہ بات متفقہ ہے کہ سونے چاندی کے سکہ سے بیچ کی جائے تو باعتبار عدد اور نوع مسمیٰ سکہ متعین ہو جاتا ہے، خواہ اس کی قیمت بڑھے یا گھٹے، اس میں امام ابو یوسف کا بھی کوئی اختلاف نہیں ہے، "فانہا اثمان عرفا و خلقة ولا یجری فی ذلک خلاف ابی یوسف" (تنبیہ الرقود رسائل ۲/۶۳)۔

(مولانا صدر الحسن، مولانا خورشید احمد اعظمی، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، راقم الحروف راشد حسین ندوی)۔

۳- اشاریہ سے مربوط کرنے میں جہالت ہوگی، صحیح مقدار بائع مشتری مقرض متقرض شوہر بیوی، کسی کو معلوم نہ ہوگی، اس لئے کہ اشاریہ کی حقیقت تک پہنچنا ہر کس و ناکس کے بس میں نہ ہوگا، اور شریعت کسی ایسی چیز کو مدار نہیں بناتی ہے جسے صرف مخصوص لوگ سمجھ سکتے ہوں "إنا أمة أمیة لا نکتب ولا نحسب" میں اسی حقیقت کی طرف رہنمائی کی گئی ہے (مفتی لطیف الرحمن، مولانا محمد شاہ جہاں ندوی، مولانا نصر اللہ ندوی، مولانا عبدالنواب اناری، مولانا نعیم اختر قاسمی، مولانا امداد اللہ قاسمی، مفتی سید ارشد قاسمی، مولانا خورشید احمد اعظمی، مولانا اعطاء اللہ قاسمی، مولانا اشتیاق احمد اعظمی، قاضی مفتی احتشام قاسمی، مفتی انور علی اعظمی، مفتی عبدالرحیم قاسمی، راشد حسین ندوی)۔

۴- اس سے سود کا دروازہ کھل جائے گا (مولانا محمد شاہ جہاں ندوی، مفتی لطیف الرحمن ولایت علی، مولانا عبدالنواب اناری، مفتی سید باقر ارشد قاسمی، مولانا صدر الحسن، مولانا خورشید احمد اعظمی، مولانا اعطاء اللہ قاسمی، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، قاضی مفتی محمد احتشام قاسمی، مفتی انور علی اعظمی، مفتی عبدالرحیم قاسمی)۔

۵- نوٹ مثلی چیزوں میں سے ہے اور مثلی اشیاء کے قرض کی واپسی میں مقدار اور کمیت

میں برابری مطلوب ہے، قیمت اور مالیت میں نہیں (مولانا نصر اللہ ندوی، مولانا عبدالنور انانوی، مولانا نعیم اختر قاسمی، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مولانا عطاء اللہ قاسمی، مولانا اشتیاق احمد اعظمی)۔

۶- یہ مسلک حضرت ابن عمرؓ کی حدیث سے متصادم ہے، جس میں درہم کو دینار اور دینار کو درہم سے بدلنے کے سوال پر حضور ﷺ نے فرمایا: ”لا باس ان تاخذھا بسعر یومھا ما لم تفرقا و بینکما شیء“ (ابوداؤد ۳۳۵۴) اس میں یوم عقد کی قیمت کے بجائے تبادلہ کے وقت کی قیمت کا اعتبار کرنے کا حکم دیا گیا ہے، جبکہ اشاریہ کے مطابق معاملہ کرنے پر یوم عقد کی قیمت کا اعتبار لازم آئے گا، پھر مجلس بھی مختلف ہوگی (مولانا عبدالنور انانوی، مولانا امداد اللہ قاسمی، مولانا خورشید احمد اعظمی، مفتی عبدالرحیم قاسمی، راشد حسین ندوی)۔

۷- اگر ہم اشاریہ کے جواز کے قائل ہوں تو کوئی وجہ نہیں کہ گیہوں اور جو جیسی ملکیت قرض لے کر ان کو اشاریہ سے مربوط کرنے کو جائز قرار دیا جائے، جبکہ اس کا کوئی قائل نہیں ہے، علامہ ابن قدامہ فرماتے ہیں: ”یجب رد المثل فی المکیل والموزون لا نعلم فیہ خلافا“ (المغنی ۴/۳۵۷ بیوع باب القبض) (مولانا سلمان پالنپوری، مولانا نصر اللہ ندوی، مفتی عبدالرحیم قاسمی، راشد حسین ندوی)۔

۸- ارزانی اشیاء میں ہو جاتی ہے، نوٹوں کی قوت خرید میں کوئی کمی بیشی نہیں ہوتی (قاضی و مفتی محمد احتشام قاسمی، مولانا محبوب احمد فروغ قاسمی، مولانا عطاء اللہ قاسمی، مولانا خورشید احمد اعظمی، مفتی سید باقر ارشد قاسمی، مولانا امداد اللہ قاسمی، مولانا ابوسفیان مفتاحی)۔

۹- یہ نظام چونکہ انکل اور تخمینہ پر مبنی ہے، لہذا اگر اس میں ربانہ بھی ہو تو شبہ با ضرور ہے (مولانا نعیم اختر قاسمی، مولانا امداد اللہ قاسمی، مولانا عبدالرحیم قاسمی)۔

۱۰- اصل یہ ہے کہ اشیاء کی قیمتوں کا اندازہ نقد سے کیا جائے اور اشاریہ کا قائل ہونے پر لازم آئے گا کہ نقد کا اندازہ سامانوں سے کیا جائے، یہ بلاشبہ قلب موضوع ہے (راشد حسین ندوی)۔

البتہ مفتی عبدالقیوم صاحب پالنپوری اور مولانا سلمان پالنپوری صاحب نے پنشن کے اشاریہ سے جوڑنے کو جائز قرار دیا ہے، کیونکہ پنشن مستاجر کی طرف سے ملازم پر احسان و تبرع ہے اس میں تبادلہ اور بیع کی کوئی صورت نہیں ہے، لہذا اس کو اشاریہ سے مربوط کرنا جائز ہے۔

دوسرا سوال یہ تھا کہ نوٹوں کی شکل میں قرض دیتے وقت یا مہر کے تقرر کے وقت یا ادھار فروختگی کے وقت کیا یہ جائز ہوگا کہ طرفین واجب الاداء نوٹ کی مالیت سونے یا چاندی میں طے کر لیں اور بوقت ادائیگی اسی قدر سونے یا چاندی کی قیمت کے مساوی نوٹوں کی ادائیگی عمل میں آئے۔

جواب میں اکثر حضرات نے تحریر فرمایا ہے کہ جب یہی کرنا ہے تو بہتر شکل یہ ہوگی کہ درمیان میں نوٹوں کا ذکر کئے بغیر سونے چاندی کی کوئی مقدار طے کی جائے یا ادھار دی جائے اور واپسی کے وقت وہی مقدار یا نوٹوں سے اس کی مالیت ادا کی جائے۔

پھر اصل سوال کے جواب میں تین طرح کی آراء آئی ہیں:

پہلی رائے: یہ ہے کہ یہ عمل جائز ہے، یہ رائے مندرجہ ذیل حضرات کی ہے:

مولانا رضوان الحسن مظاہری، مولانا احسن عبدالحق ندوی، مفتی لطیف الرحمن، مولانا نعیم اختر قاسمی، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مولانا امداد اللہ قاسمی، قاضی و مفتی محمد احتشام قاسمی، مولانا محمد ذکاء اللہ شبلی، مفتی شیر علی، حافظ شیخ کلیم اللہ عمری مدنی۔

دوسری رائے: یہ ہے کہ یہ عمل ناجائز ہے، یہ رائے مندرجہ ذیل حضرات کی ہے:

مفتی سلمان پالنپوری، مولانا محفوظ الرحمن مسو، مولانا محمد شاہ جہاں ندوی، مولانا عبدالنواب اناوی، مولانا مفتی سید باقر ارشد قاسمی، مولانا محمد صدر الحسن، مولانا خورشید احمد اعظمی، مولانا عطاء اللہ قاسمی، مولانا اشتیاق احمد اعظمی، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، مفتی انور علی مسو، مفتی عبدالرحیم قاسمی، مولانا عبداللطیف پالنپوری۔

تیسری رائے: ناچیز راقم الحروف نے ظاہر کی تھی وہ یہ کہ مہر یا پنشن کی تعیین سونے یا

چاندی سے کی جاسکتی ہے، قرض کی نہیں کی جاسکتی۔

مجوزین نے مندرجہ ذیل نصوص سے استدلال کیا ہے:

۱- حضرت ابن عمرؓ کی حدیث: ”كنت أبيع الإبل الحدیث“ (مولانا امداد

اللہ قاسمی)۔

۲- ”استقرض منه دائق فلوس حال كونها عشر بدائق فصارت ستة

بدائق اور خص و صار عشرون بدائق، يأخذ منه عدد ما أعطى ولا يزيد ولا

ينقص، قلت هذا مبنی علی قول الامام وهو قول ابی یوسف اولاً وقد علمت ان

المفتی به قوله ثانياً بوجوب قيمتها يوم القرض وهو دائق أى سدس درهم،

سواء صار الآن ستة فلوس بدائق أو عشرين بدائق“ (رد المحتار ۲/۲۲ کتاب البیوع)

(مولانا نعیم اختر قاسمی، مولانا رضوان الحسن مظاہری)۔

مولانا نعیم اختر قاسمی نے مزید فرمایا کہ یہ صورت باب ربا کے کھلنے کا سبب نہیں بنے گی،

یہ نقصانات سے بچانے کا ایک طریقہ ہے، اسی جیسا طریقہ عامل خیبر کو تمر سے متعلق سمجھا گیا۔

جبکہ اس طریقہ کو ناجائز قرار دینے والے حضرات نے مندرجہ ذیل دلائل پیش کئے ہیں:

۱- نوٹ اموال ربویہ میں سے ہے، لہذا اس کی واپسی اسی کی جنس سے برابری کے

ساتھ ہونا چاہئے، نیز نسیئہ بھی نہ ہونا چاہئے ورنہ سود کا دروازہ کھل جائے گا (مفتی سلمان

پالنپوری، مولانا محمد شاہ جہاں ندوی، مفتی عبدالرحیم قاسمی، مفتی انور علی اعظمی، مولانا محبوب فروغ

احمد قاسمی، مولانا عطاء اللہ قاسمی، مفتی سید باقر ارشد قاسمی، مولانا عبدالنواب اناری)۔

۲- باعث نزاع اور شرعی ضوابط نیز مزاج شریعت کے خلاف ہے (مفتی انور علی

اعظمی، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، مولانا احتشام قاسمی اگرچہ مجوزین میں شامل ہیں لیکن یہ بات

موصوف نے تسلیم بھی کی ہے)۔

۳- اس سے فقہ الکالمی بالکالمی لازم آئے گی جس کی احادیث میں ممانعت وارد ہوئی

ہے (مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، مولانا عبداللطیف پالنپوری)۔

۴- دیون میں اصل مثل سے واپسی ہے "الديون تقضى بامثالها" اور مثل سے

مراد مثل فی المقدار ہے نہ کہ مثل فی القیمۃ (مولانا اشتیاق احمد اعظمی)۔

۵- اس میں شبہ ربا ہے (مولانا خورشید احمد اعظمی)۔

۶- اس میں جہالت ہے اور جہالت کے ساتھ عقد ناجائز ہوتا ہے (مولانا محمد

شاہجہاں ندوی)۔

۷- "وإن اشترى فاكهة بدائق فلس والدائق عشرون فلسا، فلم يرد

الفلوس حتى غلت أو رخصت فعليه عشرون فلسا" (مبسوط ۲۹/۱۲) (مفتی عبد

الرحیم قاسمی)۔

راقم الحروف نے مہر اور ثمن کی تعیین سونے چاندی سے کرنے کو جائز قرار دیا تھا، اور

قرض کی تعیین کو ناجائز قرار دیا تھا قرض کے ناجائز ہونے کے دلائل وہی ہیں جو مانعین کے دلائل

کے تحت (۱) پر گزرے ہیں، مہر اور ثمن کی سونے چاندی سے تعیین کے دلائل مندرجہ ذیل ہیں:

۱- مہر کا سونے چاندی سے خاص ربط ہے، چنانچہ مہر کی کم از کم مقدار دس درہم بتلائی

گئی، ظاہر ہے اس کا پتہ لگانے کے لئے چاندی کی طرف رجوع ناگزیر ہے، دس درہم سے کم مہر

مقرر کی جائے تو دس درہم مقرر ہو جائے گی، اس کا پتہ بھی چاندی کی مقدار پر غور کرنے سے چلے گا،

معاشرہ میں مہر فاطمی کا عام رواج ہے اس سے واقفیت بھی چاندی کی مقدار پر غور کرنے سے ہوگی۔

پھر بھی یہ معلوم ہے کہ مہر میں خط بھی جائز ہے اور زیادتی بھی، اسی طرح عقد سے پہلے

مہر کی تعیین نہ کی ہو تو بعد میں تراضی سے تعیین جائز ہے، لہذا روپے سے تعیین کر کے بعد میں

سونے چاندی سے بھی تعیین تراضی سے جائز ہونا چاہئے، اس میں ربا یا شبہ ربا کی کیا بات ہے؟

جہاں تک ثمن بیع کی تعیین سونے چاندی سے کرنے کا تعلق ہے تو یہ مسلمہ قاعدہ ہے کہ

مسلمان کے تصرفات کو حتی الامکان صحیح قرار دینے کی کوشش کرنا چاہئے، یہاں بھی اقتضاء اقالہ

مان کر عقد جدید قرار دینا ممکن ہے، صاحب ہدایہ فرماتے ہیں:

”والفسخ قد یثبت بطریق الاقتضاء کما إذا تبایعا بالف ثم بالف

وخمس مائة“ (ہدایہ مع الفتح کتاب الصرف ۶/۲۷۲، ۲۷۳)۔

”کرنسی نوٹ“ کے موضوع پر مولانا ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی صاحب کا مقالہ بھی

دستیاب ہوا ہے، آپ نے دلائل کے ساتھ نوٹ کو نقدین کے حکم میں قرار دیا ہے، لیکن ان دونوں

سوالات کو نہ چھیڑنے کے سبب اوپر موصوف کی رائے نہیں آسکی۔



www.KitaboSunnat.com

# جدید فقہی تحقیقات

دوسرا باب

---

تعارفی تحریر





## موجودہ کرنسی کی شرعی حیثیت

مولانا مبین سلیم ندوی ☆

الحمد لله رب العالمين والصلاة والسلام على سيد المرسلين وعلى

آله وصحبه ومن تبعهم بإحسان إلى يوم الدين، أما بعد:

کرنسی انسانی زندگی کی ناگزیر ضرورت ہے، جس پر اس کے مالی معاملات کا دارومدار ہے، اسی لئے انسانی تاریخ میں اسے غیر معمولی حیثیت حاصل رہی اور وہ متعدد محرکات کے پیش نظر اپنی لمبی تاریخ میں مختلف تبدیلیوں سے گذرتی رہی (۱) یہاں تک کہ آج نقدیہ Paper Money والعملة الورقية (Paper Currency) کاغذی نوٹوں کی کرنسی کے نام سے موسوم ہے، ابھی اس کا سفر ختم نہیں ہوا بلکہ مسلسل جاری ہے، جیسا کہ نظام زر کے ماہرین کے درمیان الیکٹرونک کرنسی یا ڈیجیٹل کرنسی (Digital Currency) یا ڈیجیٹل روپیہ (Digital Money) زیر بحث ہے (۲)۔

اس کرنسی کی اہمیت اسلامی شریعت میں بھی بہت ہے چونکہ اسی کے ذریعہ تبادلہ پر تمام مالی معاملات کی حلت و حرمت، اباحت و خطر کا انحصار ہے، یہی وجہ ہے کہ تمام فقہاء کرام نے اس پر بحث کی ہے لیکن آج کرنسی نے جو شکل اختیار کر لی ہے وہ چند وجوہ سے قدیم کرنسی اور اس سے مرتبط نظام زر سے مختلف ہے، نیز یہ کہ موجودہ کرنسی کی تمام تر تبدیلی و ترقی اسلامی فقہ کی نگرانی کی غیر موجودگی میں طے پائی ہے، اسی لئے اس کرنسی کی شرعی حیثیت متعین کرنا چنداں مشکل اور

تفصیل کا متقاضی ہے۔

چنانچہ اس بحث کا بنیادی مقصد ”الحکم علی الشیء فرع عن تصورہ“ کی روشنی میں موجودہ کاغذی کرنسی کی حقیقت و مزاج کی شناخت و انکشاف کے ساتھ فقہ اسلامی میں موجود کرنسی کی حقیقت اور اس کے شرعی حکم کا جاننا اور پھر جدید کرنسی کا فقہاء کے اقوال سے تقابل کرنا اور ان کے اختلاف کو بیان کرنا نیز موجودہ کرنسی کی شرعی حیثیت پر راجح رائے قائم کرنا ہے۔ اس مقصد کو موضوعی و منہجی انداز سے انجام دینے کی وجہ سے یہ بحث مندرجہ ذیل خاکہ کی پابند ہوگی:

(۱) کرنسی کی تعریف، ایجاد اور اس کی قسمیں۔

(۲) اسلامی حکومت میں درہم و دینار کی کرنسی۔

(۳) نقدین (درہم و دینار کی کرنسیوں) میں ربا کی علت۔

(۴) فلوس نامی کرنسی اور اس کی شرعی حیثیت فقہاء کے اقوال کی روشنی میں۔

(۵) موجودہ زیر بحث کاغذی کرنسی (العملة الورقیة Paper Money) اور فقہاء کرام۔

(۶) رائے راجح اور نتائج بحث۔

(۷) مراجع بحث

۱۔ کرنسی کی تعریف، ایجاد اور اس کی قسمیں:

تعریف: ”عربی میں کرنسی کی شکل کو نقد جمع نقود کہا جاتا ہے، جس کے لغوی معنی ہیں:

”خلاف النسیئة، وهو الإعطاء والقبض، تقول: نقدته الدراهم، ونقدتها له

بمعنی: أعطیته، فانتقدتها: أي قبضتها“ (۳)، نقد ادھار کے برخلاف ہے یعنی دینا اور قبضہ

کرنا۔ خطیب شربینی کہتے ہیں: ”أصل النقد لغة: الإعطاء، ثم أطلق النقد على المنقود؛

من باب إطلاق المصدر على اسم المفعول (۴): نقد کے لغت میں اصل معنی تو دینے کے

کا اطلاق اس چیز پر ہونے لگا جو نقد کے طور پر دی جاتی ہے، یہ مصدر کو اسم مفعول پر اطلاق کرنے کے باب سے ہے۔

اس جگہ اصطلاحی معنی لغوی معنی سے الگ نہیں بلکہ یکساں ہیں، اسی بنیاد پر ہم دیکھتے ہیں کہ فقہاء نقد کو زکاۃ، صرف، اور ربا کے ابواب میں سونے اور چاندی (ڈھلے ہوئے اور بغیر ڈھلے ہوئے) کے معنی میں استعمال کرتے ہیں، جبکہ بیع کے باب میں مشتری کے بائع کو قیمت دینے کے معنی میں استعمال کرتے ہیں۔

لیکن موجودہ نقد کی تعریف کچھ اس طرح سے کی گئی ہے: "السلعة التي تلقى قبولا في عمليات التبادل: من شراء و بيع للسلع، وفي تسديد الدين" (۵)۔

ایجاد: ابتدائی زمانہ کے انسان نے صرف سامان کو سامان کے بدلہ میں لین دین کے طریقہ کو اپنایا (اسلوب المقایضۃ)، جب اس کی ضرورت سے زائد سامان ہوتا تو اس کو دیکر دوسرا سامان لے لیتا جس کی اسے ضرورت ہوتی، لیکن اس طریقہ کے اندر بڑی دشواریاں اور وقتیں ہوتیں جس کی بنیاد پر انسان نے کرنسی کا طریقہ متبادل ایجاد کیا، ان میں چند اس طرح تھیں:

۱- تمام افراد کی ضرورتوں کا ایک وقت میں ایک ساتھ نہ پایا جانا، جس کی وجہ سے سامان کی خرید و فروخت میں وقت و محنت کا ضیاع۔

۲- ایک سامان کی دوسرے سامان کے مقابلہ میں قیمت کی تعیین کی دشواری۔

۳- ذخیرہ (اسٹاک) کرنے کی دشواری۔

۴- ادھار کی شکل میں اس سے معاملہ کی دشواری۔

یہ اور ان جیسی اور دشواریوں کے پیش نظر انسان نے اس طریقہ کی جگہ دوسرے متبادل طریقہ کی تلاش جاری رکھی جس میں وہ پرانے طرز کی دشواریوں سے بچ سکے، چنانچہ اس نے سامانی کرنسی کا (چیزوں کی قیمت کو جاننے کی بنیاد کے طور پر) استعمال شروع کیا، اگرچہ ان سامانی

کرنسیوں کی انواع ان معاشروں کی معاشی حالات کے اعتبار سے مختلف رہیں اور مختلف چیزیں نقد کے طور پر مستعمل رہیں، جیسے: تمباکو، سیپ، چوپائے، چائے، کھال وغیرہ، پھر سونا اور چاندی مستعمل ہوئے (۶)۔

اس طرح مختلف قسم کی کرنسیاں وجود میں آئیں اور اس نے سامان کو سامان کے بدلہ خرید و فروخت کے طریقہ کی مکمل جگہ لے لی، اور اس کے ذریعہ معاملہ کی وجہ سے اس کے کام (Functions) متعین ہوئے، یہاں تک کہ وہ تبادلہ کا ذریعہ، قیمتوں کا معیار، مالی امانت ہونے کے ساتھ ادھار سرمایہ و ذخیرہ کا وسیلہ قرار پایا، اسی لئے کرنسی پر سوسائٹی میں اعتماد ضروری ہے تاکہ تمام معاملات بحسن و خوبی انجام دیے جاسکیں۔

## کرنسی کی قسمیں:

کرنسی نے اپنی تاریخ میں مختلف شکلیں اختیار کی ہیں، جو مندرجہ ذیل ہیں:

۱- سامانی کرنسی (النقد والسلعیۃ: Commodity Money)، یعنی کرنسی کی وہ شکل

جسے ابتدائی انسانی سوسائٹیوں نے سامان کو سامان کے بدلہ میں خرید و فروخت کے طریقہ کے طور پر استعمال کیا۔

۲- دھاتی کرنسی (النقد والمعدنیۃ: Metallic Money)، جس میں سب سے اہم

سونے اور چاندی کی دھات سے بنی کرنسی ہے جو کرنسیوں کی شکلوں میں سب سے بہتر صفات کی حامل ہے اور تمام انسانی تاریخ میں سب سے زیادہ استقرار کی صلاحیت سے متصف رہی ہے جنگ و سلم اور انقلابات زمانہ کی وجہ سے قیمتوں میں تغیرات کے باوجود، یہی وجہ ہے کہ سونے چاندی کا مدتوں سے اہم رول رہا ہے جو تقریباً تین سو سال پہلے تک باقی تھا جس میں سونا اور چاندی ہی صرف لین دین کا ذریعہ رہے۔ اور اس پر لوگوں کا بھرپور اعتماد تھا جس نے ان

سوسائٹیوں کو افراط و مندی کے خطرات سے بچائے رکھا مگر زمانہ قدیم سے بہت سی حکومتوں نے ان قیمتی دھاتوں میں سستی دھاتوں کی ملاوٹ کر کے اس بھروسہ کو ختم کرنے کی کوشش کی جیسا کہ رومی تہذیبوں میں امراء و حکام نے کرنسیوں میں قیمتی دھاتوں کے مشتملات میں کمی کی اور ایسے سونے کے سکے ڈھالے جو وزن میں تو دوسری کرنسیوں سے کم ہوں مگر اسی قیمت کے حامل ہوں، یہی حال قدیم یورپی مملکتوں میں ہوا، چنانچہ آٹھویں ہنری نے چاندی کی ایسی کرنسی ڈھالی جو تھوڑے استعمال کے بعد ہی نیچے سے تانبا ثابت ہوئی۔ پھر یہ دھوکہ حکومتوں سے افراد میں منتقل ہو گیا اور دھیرے دھیرے لوگوں کے اعتماد میں کمی آنے لگی، بادشاہوں نے ایسا جان بوجھ کر کیا، خاص طور پر جنگی حالات میں یا اپنے محلوں کے بنانے کے لئے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چیزوں کی قیمتیں بڑھ گئیں اس لئے کہ یہ کرنسی حقیقت میں اس کی اصلی قیمت کے مقابلے میں سونے کی کم مقدار پر مشتمل تھی۔ دوسری طرف کبھی بعض اوقات سونے کی فراہمی میں زیادتی کے سبب افراط کرنسی کی صورت میں قیمتیں مہنگی ہو گئیں جیسا کہ سولہویں صدی میں یورپ میں واقع ہوا، جب کہ اسپین کی براعظم امریکہ میں نوآبادیوں کے اندر سونے، چاندی سے بھرپور کانوں کا انکشاف ہوا۔ مندرجہ بالا وجوہات کی بنیاد پر لوگوں کا سونے چاندی کی کرنسی سے اعتماد کم ہوتا گیا یہاں تک کہ کاغذی کرنسی نے آکر ان منفی پہلوؤں کو ختم کر دیا۔

۳- معاون کرنسی (البنقود المساعدة: Taken Money)، یہ کرنسی کم قیمت چینج ریزگاری پر مشتمل ہوتی ہے، اور اساسی سکے کی اکائی کے اجزاء کے طور پر جاری ہوتی ہے، اس کا رول صرف چھوٹی خرید و فروخت کے تبادلہ تک محدود رہتا ہے۔ یہ کون سکے چاندی یا نیکل یا پرونز کے ہوتے ہیں، اور یہ کاغذ کے بھی ہو سکتے ہیں۔ اور اس معاون کرنسی میں دھات کی قیمت کرنسی کی اسی قیمت سے کم رہتی ہے، تاکہ زائد دھات سے فائدہ حاصل نہ کیا جاسکتا ہو، چونکہ ان معاون کرنسیوں کے ڈھالنے سے حکومت بہت فائدہ اٹھاتی ہے۔

۴- کاغذی کرنسی: یہ کاغذی کرنسی دھاتی کرنسی سے کئی اعتبارات سے فائق ہے:

- اس کے جاری کرنے میں حکومت کو کوئی معتد بہ خرچہ برداشت نہیں کرنا پڑتا۔
- ہر اعتبار سے اس پر حکومت کا کنٹرول ہوتا ہے جب چاہے جتنے چاہے بازار کے اعتبار سے فراہم کرے اور افراط سے بچائے، نیز اسے نقدی (کرنسی) سیاست کی روشنی میں مہیا کرے۔

- اس کی سونے چاندی کی کرنسی کے مقابلہ میں زیادہ بہتر طریقہ سے ذخیرہ اندوزی ہو سکتی ہے۔

کاغذی کرنسی کی ترقی: جب سونے چاندی کی کرنسی کا رواج تھا تب مالی معاملہ کرنے والوں اور تاجروں کو اس کی حفاظت میں بڑی دشواری کا سامنا کرنا پڑتا تھا، اس لئے کہ اس کی چوری ہو سکتی تھی لہذا وہ اسے حفاظت کے طور پر سنارو جوہری کے پاس رکھتے تھے، ان پر مکمل اعتماد کی وجہ سے؛ چونکہ ان کے پاس حفاظتی وسائل ہوتے تھے جیسے کہ لوہے کی مضبوط الماری وغیرہ، اور یہ جوہری ان کو اس وقت رسید دیتے تھے جس میں مال کی قیمت، اس کی مقدار، اس کی قسم کے ساتھ اس بات کا عہد ہوتا تھا کہ وہ امانت جمع کرنے والوں کو طلب کرنے پر ان کی امانت واپس کریں گے، اور امانت رکھنے والے انہیں سود ادا کرتے تھے۔ سونے کی ضرورت کے وقت امانت رکھنے والے تاجران رسیدوں کو پیش کرتے اور سونے چاندی کی تختیوں کو حاصل کرتے اور پھر اسے سکے ڈھالنے کے کارخانہ میں بنوانے کے لئے دے دیتے تاکہ کرنسی کی شکل میں تیار ہو کر ان کو حاصل ہوں۔ جب یہ طریقہ رائج ہو گیا تو اس پر چلنا بھی مشکل ہو گیا چونکہ اس میں تاخیر و لاگت دونوں چیزیں موجود تھیں، اس لئے تاجروں نے ان حاصل شدہ رسیدوں کو دکھانا شروع کر دیا اور ان کے ساتھ معاملہ کرنے والوں نے قبول کرنا شروع کر دیا، ان تاجروں اور سوناروں پر بھروسہ کر کے جو حقیقت میں ان رسید والوں کو ان کی قیمت کا سونا دینے کو تیار رہتے تھے، اس

طرح ان رسیدوں نے سونے کے سکوں کی جگہ حاصل کر لی، پھر ایک قدم اور آگے بڑھے اور ان رسیدوں کے اظہار کی بھی ضرورت نہ رہی اور ان رسیدوں کے حامل شخص کو اس کی قیمت کا سونا ادا کیا جانے لگا بغیر نظہیر کے، پھر سناروں کو یہ آسان لگا کہ ان رسیدوں کے مختلف حصے کسی معین کرنسی کی اکائیوں کی شکل میں بنالیں، اس طرح کاغذی بینک نوٹ کی پہلی شکل وجود میں آئی، اور اس طریقہ کا چلن عام ہو گیا، اور معاملہ کرنے والوں کو بھی آرام و آسانی ہوئی، چونکہ ان کے اور جوہریوں کے درمیان مکمل اعتماد بحال تھا اور انہوں نے جوہریوں کے پاس اصل سونے کی تختیاں لینے جانے کی ضرورت محسوس نہیں کی، پھر حکومتوں نے ان سوناروں کی جگہ لے لی، اور وہ ان تختیوں کی حفاظت اور امانت رکھنے والوں کو رسیدیں دینے کی ذمہ داری ادا کرتی رہیں یہاں تک کہ سترہویں صدی عیسوی کے اوائل میں بینک نوٹ کرنسی نے استقراری کیفیت حاصل کر لی۔

یعنی اس سے مراد ایک ایسا کاغذ ہے جس کی قیمت سونے کی مکمل اور حقیقی نمائندگی کرتی ہے، اس کا ہولڈر جس وقت چاہے اس کے مقابل سونا حاصل کر سکتا ہے۔ لیکن بعد میں بینکوں نے ایسے کاغذی سکوں کی پابندی نہیں کی جو حقیقت میں امانت کے برابر رکھے سونے کی مقدار کے برابر ہو۔ پھر اس کاغذی کرنسی نے قانونی طور پر شمن کی حیثیت حاصل کر لی اور انیسویں صدی میں بعض حکومتوں نے قرض دینے والوں پر لازم قرار دیا کہ وہ اپنے قرضے واپس لیتے وقت ان کاغذی نوٹوں کو قبول کریں، اس طرح اس کرنسی کے ذریعہ معاملہ قانونی ہو گیا۔ مگر بینکوں نے اس پر بس نہ کیا بلکہ جب دیکھا کہ بہت ہی کم ڈپازیٹر (امانت رکھنے والے) اپنے کاغذی نوٹوں کے مقابلے میں سونے کا مطالبہ کرتے ہیں تو اس چیز نے ان بینکوں کو (جیسا کہ اس سے پہلے جوہریوں کو) اس بات پر اکسایا کہ وہ اپنے پاس موجود سونے کی ان تختیوں کو قرض کے طور پر دوسروں کو دیں جس کا مطالبہ ان کے مالک نہیں کرتے اور اس قرض سے متعین سود حاصل



کریں، اس طرح بینکوں نے ان جمع شدہ امانتوں کو قرض کے طور پر دینا شروع کر دیا اور پھر یہ قرض کی فراہمی کا دائرہ اتنا بڑھا کہ یہی بینکوں کا اصل مشغلہ ہو گیا۔ اس کے بعد ایک خطرناک مرحلہ پیش آ گیا اور وہ یہ تھا کہ ان بینکوں نے صرف دوسروں کی جمع کردہ امانتوں سے ہی قرض دینے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ان امانتی کھاتوں سے بھی دینا شروع کر دیا جن کے پاس حقیقت میں کوئی سونے کا کور ہی نہ تھا یا اس کا کوئی حقیقی وجود ہی نہ تھا، اور چونکہ بینک ہی ان کاغذی نوٹوں کو جاری کرتی ہیں تو سود کے ذریعہ جلدی کمانے کی لالچ نے انہیں ان کاغذی نوٹوں کو زیادہ تعداد میں جاری کرنے پر ابھارا جن کے حقیقی کوئی سونے کے کور نہ تھے، اسی لئے اٹھارہویں صدی کا اواخر اور انیسویں صدی کا اوائل مالی بحرانوں کے لئے معروف ہے، چونکہ بعض بینک ان کاغذی نوٹوں کے ہولڈرس کو اس کے مقابل سونا دینے سے عاجز رہیں جس کی وجہ سے ان بینکوں کے ساتھ معاملہ کرنے والوں کا بھروسہ کم ہو گیا اور انہوں نے بھی ان کاغذی نوٹوں کے بالمقابل سونے کا مطالبہ کر دیا اور اکثر بینک یہ فراہم کرنے سے قاصر رہیں، جس کی وجہ سے حکومت کے زیر نگرانی مرکزی بینکوں کا قیام عمل میں آیا جو کاغذی نوٹوں کے معاملہ کو قابو میں رکھنے اور ان کی حقیقی سونے کی ادائیگی میں زیادہ قادر ہوتی ہیں۔ لیکن جب حکومتوں کے ہاتھ میں اس کرنسی کی باگ ڈور آئی اور وہ مرکزی بینکوں کے ذریعہ کرنسی کی مہم پر حاوی ہو گئیں تو وہ بھی بینکوں (اور اس سے پہلے سوناروں) کے کاموں (رول) سے محفوظ نہ رہ سکیں، یہی وجہ ہے کہ مختلف حکومتیں خاص طور سے جنگوں، اقتصادی پریشانیوں میں یا سیاسی اسباب کی وجہ سے ان کاغذی نوٹوں کو (جن کا سونے کا کوئی کافی کور نہیں ہوتا) بڑی مقدار میں چھاپ دیتی ہیں جس سے بازار بھر جاتا ہے۔

بعض حکومتوں نے جان بوجھ کر کرنسی کی دھات کی جودت میں کمی کی جس سے اس کی اسی قیمت اس کی حقیقی سونے چاندی کی قیمت سے بہت زیادہ ہو، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کرنسی کی حقیقی قیمت کا بدلنا اور اسے اس کے مقابلہ ادا کرنا بینکوں کے بس سے باہر ہو گیا۔ اور پھر آہستہ

آہستہ سونے کی بنیاد پر کرنسی کا قاعدہ و قانون بھی ختم ہو گیا (۷)۔

”اس طرح یہ کاغذی نوٹ ایک ایسی کرنسی سے جو سونے کے برابر قیمت رکھتی تھی ایک کاغذ میں تحویل ہو گیا جس کا کوئی حقیقی سونے کا کور ہی نہیں، اور اس نے خود ایک مستقل کرنسی کی حیثیت اختیار کر لی جسے سونے سے کوئی تعلق نہیں“ (۸)۔

۲- اسلامی حکومت میں درہم و دینار کی کرنسی:

اسلام سے پہلے عرب میں درہم و دنانیر کا استعمال:

اسلام کی آمد سے قبل عرب درہم و دنانیر سے متعارف تھے، اور خرید و فروخت میں اس کا استعمال بھی کرتے تھے، حالانکہ یہ ان کے پاس پڑوسی ملکوں سے آتے تھے، چنانچہ ملک روم سے دنانیر اور ملک فارس سے درہم کے آنے کا عام رواج تھا۔ اس سلسلہ میں علامہ بلاذری یوں رقم طراز ہیں: ”کانت دنائیر ہرقل ترد علی اہل مکة فی الجاہلیة، فترد علیہم دراہم الفرس۔ وکانوا یتعاملون بہا بالوزن معاملة التبر غیر المضروب، وکانت لقریش أوزان فی الجاہلیة؛ فدخل الاسلام فأقرت علی ما کانت علیہ: کانت قریش تزن الفضة بوزن تسمیہ دینارا۔ فکل عشرة من أوزان الدراہم سبعة أوزان من الدنانیر۔ وکان لهم وزن الشعيرة وهو واحد من الستین من وزن الدراہم۔ وکانت لهم الأوقية: وزن أربعین درهما، والنش: وزن عشرين درهما۔ وکانت لهم النواة وهي وزن خمسة دراهم۔ فکانوا یتباعون بالتبر علی هذه الأوزان، فلما قدم النبی ﷺ مکة أقرهم علی ذلك“ (۹)۔

اسلام کے آنے کے بعد عہد رسول و عہد صحابہ میں اوزان درہم و دنانیر سے معرفت:

مذکورہ بالا عبارت سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ اور صحابہ

کے مبارک عہد میں ان دراهم و دنانیر اور ان کے اوزان سے معرفت موجود تھی۔ اس سے ان لوگوں کا گمان بے معنی رہ جاتا ہے جو اُس زمانہ میں ان کی معرفت کا انکار کرتے ہیں، اس مسئلہ میں قاضی عیاض فرماتے ہیں: "لا تصح أن تكون الأوقية والدرهم مجهولة في زمن رسول الله ﷺ، وهو يوجب الزكوة في أعداد منها، و تقع بها البياعات والأنكحة كما ثبت في الأحاديث الصحيحة"۔ پھر آپ نے تاکیداً کہا: "و هذا يبين أن قول من زعم: أن الدرهم لم تكن معلومة الى زمن عبد الملك بن مروان، وأنه جمعها برأى العلماء، وجعل كل عشرة وزن سبعة مثاقيل، ووزن الدرهم ستة دوانيق قول باطل، وإنما معنى ما نقل من ذلك: أنه لم يكن منها شئ من ضرب الإسلام وعلى صفة لا تختلف، بل كانت مجموعات، ضرب فارس والروم، وصغاراً وكباراً، وقطع فضة غير مضروبة، ولا منقوشة ويمنية ومخربية، فأوا صرفها إلى ضرب الإسلام ونقشه وتصيرها وزناً واحداً إلا يختلف، و أحياناً يستغنى فيها عن الموازين، فجمعوا أصغرها وأكبرها، وضربوه على وزنهم، ولا شك أن الدراهم كانت حينئذ معلومة، وإلا فكيف كانت تعلق بها حقوق الله تعالى في الزكوة وغيرها وحقوق العباد؟ وهذا كما كانت الأوقية معلومة أربعين درهماً، وقال الرافعي من الشافعية وغيره: أجمع أهل النظر الأول على التقدير بهذا الوزن، وهو أن الدراهم ستة دوانيق، كل عشرة دراهم سبعة مثاقيل، ولم يتغير المثقال في الجاهلية ولا في الإسلام، هذا ما ذكره العلماء في ذلك، والصحيح الذي يتعين اعتماده: أن الدراهم المطلقة في زمن رسول الله ﷺ كانت معلومة الوزن معروفة المقدار، وهي السابقة الى الأفهام عند الاطلاق، وبها تتعلق الزكوة و غيرها من الحقوق

والمقادیر الشرعية، ولا يمنع من هذا انه كان هناك دراهم أخرى أقل أو أكثر من هذا القدر؛ فإطلاق النبي ﷺ الدراهم محمول على المفهوم عند الإطلاق، وهو كل درهم ستة دوانيق، كل عشرة دراهم سبعة مثاقيل، وأجمع أهل العصر الأول فمن بعدهم إلى يومنا على هذا، ولا يجوز أن يجمعوا خلاف ما كان في زمن رسول الله ﷺ وخلفائه الراشدين“ (۱۰)۔

نبی کریم ﷺ کی یہ حدیث بھی اسی معرفت کی طرف واضح دلالت کرتی ہے: فعن ابن عمر قال: قال رسول الله ﷺ: ”الوزن وزن أهل مكة، والمكيال مكيال أهل المدينة“ (۱۱)۔

(حضرت ابن عمر سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”پیمانہ مدینہ والوں کا مانا جائے گا اور باٹ مکہ والوں کا)۔

### اسلامی سکہ کی ضرب سب سے پہلے کس نے کی؟

امام ماوردی فرماتے ہیں: اس میں اختلاف ہے، سعید بن مسیب فرماتے ہیں کہ سب سے پہلے عبد الملک بن مروان نے ضرب کرائے، اس وقت رومی دینار اور کسروی و حمیری دراهم بھی کچھ چلتے تھے۔ ابو زناد کہتے ہیں کہ عبد الملک بن مروان کے حکم سے حجاج نے ۷۷ھ میں عراق میں دراهم ضرب کرائے، مدائنی کا قول ہے کہ حجاج نے آخر ۷۵ھ میں ضرب کرائے، اس کے بعد ۷۶ھ میں نوحی میں ضرب کرنے کا حکم دیا، ایک قول یہ بھی ہے کہ حجاج نے بلا حکم خود اپنی رائے سے ضرب کرائے اور اللہ أحد، اللہ الصمد کندہ کرایا، اس کا نام مکروہ تھا، وجہ تسمیہ میں اختلاف ہے، ایک جماعت کہتی ہے کہ اس کو فقہاء نے ناپسند کیا تھا؛ کیونکہ آیت قرآنی جنبی اور محدث کے ہاتھ میں جاتی تھی، دوسری جماعت کہتی ہے کہ عجمیوں نے کم وزن ہونے کی وجہ سے ناپسند کیا تھا اس لئے مکروہ سے موسوم ہوا۔ حجاج کے بعد یزید بن عبد الملک کے عہد میں جب

عمر بن ہبیرہ والی ہوا تو اس نے پہلے سے زیادہ کھرا ضرب کرایا، اس کے بعد خالد بن عبد اللہ قسری والی ہوا تو اس نے اور شدت کی، اس کے بعد یوسف بن عمرو نے اور بھی شدت کر کے نہایت خالص ضراب کرائی، اس وجہ سے ہبیرہ، خالدیہ، یوسفیہ عہد بنو امیہ کے خالص ترین سکے تھے، منصور خراج میں ان کی نقود کے یہی سکے لیتا تھا۔ یحییٰ بن نعمان غفاری اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ سب سے پہلے مصعب بن زبیر نے اپنے بھائی عبد اللہ بن زبیر کے حکم سے اکاسرہ کی ضرب پر درہم ضرب کرائے، ان کے ایک طرف ”برکتہ“، دوسری طرف ”اللہ“ تحریر کرایا، ایک سال کے بعد حجاج نے اس کو بدل کر ایک جانب ”بسم اللہ“ اور دوسری جانب ”حجاج“ لکھا (۱۲)۔

سکہ کی تعریف: امام ماوردی اس کی تعریف کرتے ہوئے کہتے ہیں: ”سکہ اصل میں لوہے کا نام ہے جس پر درہم ضرب کیا جائے، اسی مناسبت سے درہم کو سکہ کہتے ہیں“ (۱۳)۔

دینار کی مقدار:

دینار کی مقدار کے سلسلہ میں ابن حزم کہتے ہیں: ”بحث غایۃ البحت عن کل من وثقت بتمییزہ فکل اتفق علی أن دینار الذهب بمکة وزنه ثنتان و ثمانون حبة و ثلاثة أعشار حبة من حب الشعیر، و عشر عشر حبة (فالرطل) مائة درهم و ثمانية و عشرون و أربعة أسباع درهم، و هو تسعون مثقالاً“ (۱۴)۔

یہاں یہ وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے کہ عرف میں دینار و مثقال دونوں مرادف ہیں اور ایک ہی معنی میں ہیں جیسا کہ لغت کی کتابوں میں تصریح ہے: ”الدینار هو المثقال“ (۱۵)۔

ابن عبد البر اس طرح اس اتفاق کو بیان کرتے ہیں: ”کانت الدنانیر فی الجاهلیة و أول الاسلام بالشام و عند عرب الحجاز کلها رومیة، تضرب بلاد الروم علیها صورة الملك، و اسم الذی ضربت فی ایامہ مکتوب بالرومیة،

ووزن كل دينار منها مثقال كمثلنا هذا، وهو وزن درهمين ودانقين ونصف وخمسة أسباع حبة“ (۱۶)۔

علامہ بلاذری یوں فرماتے ہیں: ”وكانت دنانیر هرقل ترد علی اهل مكة فی الجاهلیة وترد علیهم دراهم الفرس البغلیة، فكانوا لا يتبايعون إلا علی أنها تبر، وكان المثقال عندهم معروف الوزن، وزنة اثنان وعشرون قيراطا إلا كسرا، ووزن عشرة دراهم سبعة مثاقيل، فكان الرطل اثنی عشر أوقية أربعين درهما، فأقر رسول الله ﷺ ذلك وأقره أبوبكر وعمر وعثمان وعلي، وذكر الواقدي قال: حدثني ربيعة عن عثمان عن وهب بن كيسان قال: رأيت الدراهم والدنانير قبل أن ينقشها عبد الملك ممسوحة، وهي وزن الدنانير التي أخذ بها عبد الملك“ (۱۷)۔

ابوعبید کہتے ہیں: ”كان الدينار يحمل اليهم من بلاد الروم، فلما أراد عبد الملك بن مروان أن يضرب الدنانير والدراهم سأل عن أوزان الجاهلية، فأجمعوا له على أن المثقال اثنان وعشرون قيراطا إلا حبة بالشامي، وأن عشرة من الدراهم سبعة مثاقيل فضربها كذلك“ (۱۸)۔

اگر عبد الملک بن مروان کے ڈھلوائے ہوئے دینار کا موجودہ وزن سے حساب کریں تو ۳۲۵ گرام سونا ہوتا ہے (۱۹)۔

درہم کی مقدار:

عہد ما قبل اسلام میں درہم کی مقدار بہت مختلف رہی لیکن زکوٰۃ کی ادائیگی اور لوگوں کے تعامل میں آسانی پیدا کرنے کی غرض سے عہد اسلام میں اس کی مقدار یکساں کر دی گئی اور اس

پراجماع امت ہو گیا، امام ماوردی رقم طراز ہیں: "إن الدراهم كانت في أيام الفرس مضروبة على ثلاثة أوزان: منها درهم على وزن المثقال، عشرون قيراطا، ودرهم وزنه اثنا عشر قيراطا، ودرهم وزنه عشرة قيراط فلما احتيج في الإسلام إلى تقديره أخذ الوسط من جميع الأوزان الثلاثة، وهو اثنان وأربعون قيراطا، فكان أربعة عشر قيراطا من قيراط المثقال. وقيل: إن عمر بن الخطاب رأى الدراهم مختلفة، منها البغلي ثمانية دوانيق. والطبري أربعة، والمغربى ثلاثة دوانيق، واليمنى دائق واحد، فقال: أغلب ما يتعامل الناس به من أعلاها وأدناها، فكان البغلي والطبري فجمعهما فكانا اثني عشر دائقا، فأخذ نصفهما، فكان ستة دوانيق، فجعله دراهم الإسلام" (۲۰)۔

امام ماوردی فرماتے ہیں: "عہد فارس میں تین وزن کے درہم مضروب ہوتے تھے، ایک تو مثقال کے وزن سے بیس قیراط کا، دوسرا بارہ قیراط کا، تیسرا دن قیراط کا، عہد اسلامی میں لینے کے وقت ان تینوں کے مجموعے یعنی ۲۲ قیراط کا وسط یعنی ۱۲ قیراط لیکر اس پر درہم ضرب کرایا گیا، ایسے دس درہم کا وزن ۷ مثقال کے برابر ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے درہم میں اختلاف پایا، کوئی درہم بغلی وزن ۸ دائق، کوئی طبری وزن ۴ دائق، کوئی مغربی وزن ۳ دائق، اور کوئی یمنی وزن ایک دائق، تو حکم دیا کہ سب سے اعلیٰ اور سب سے ادنیٰ کو جو زیادہ مروج ہوں جمع کرو، چنانچہ ایسے درہم بغلی اور طبری تھے جن کا مجموعہ ۱۲ دائق ہوا، ۱۲ دائق کا نصف ۶ لے کر اس پر اسلامی درہم ضرب کرادیا؛ اس لئے اسلامی درہم ۶ دائق کا ہے، اگر اس پر اس کا ۳/۷ زیادہ کیا جائے تو ایک مثقال کا وزن ہوتا ہے اور مثقال میں سے ۳/۷ کم کیا جائے تو درہم کا وزن نکلتا ہے، اس طرح سے ہر دس درہم کا وزن ۷ مثقال اور ہر ۷ مثقال کا وزن دس درہم اور ہر دس مثقال کا وزن (۷ × ۲ =) ۱۴ درہم ہوا۔ اسلامی درہم کی چاندی خالص ہوتی

ہے کھوٹ نام کو نہیں، اہل فارس کے نظم و نسق بگڑنے کے ساتھ ان کے نقود بھی کھوٹے ہو گئے تھے مگر کھوٹ نظر انداز ہونے کی وجہ سے معاملات، لین دین میں کھرے کے مساوی چلتے تھے، اسلامی سکے بالکل کھرے ضرب کئے گئے اس کے بعد سے کھوٹے کھرے میں فرق ہونے لگا“ (۲۱)۔

امام ابو عبید کہتے ہیں: ”حدثنی رجل من اهل العلم والعناية بأمر الناس ممن یعنی بهذا الشأن: أن الدراهم كانت في الجاهلية ضربين: البغلية والسوداء ثمانية دوانيق، والطبرية أربعة، وكانوا يستعملونها متقاصدة مائة طبرية، فكان في المائتين منها خمسة دراهم زكاة، فلما كان زمن بني أمية، قالوا: إن ضربنا البغلية ظن الناس أنها التي تعتبر فيها الزكاة فيضر الفقراء، وإن ضربنا الطبرية ضر أرباب الأموال؛ فجمعوا الدرهم البغلي والطبري وجعلوهما درهيمين كل درهم ستة دوانيق... الخ (۲۲)۔“

”میں نے لوگوں کے معاملے سے باخبر اور اس موضوع سے دلچسپی رکھنے والے ایک بزرگ سے سنا وہ درہم کی کہانی اور اسلام میں ان کے ڈھالے جانے کا سبب بیان کرتے ہوئے کہہ رہے تھے: یہ درہم جو روئے زمین پر ہمیشہ سے لوگوں کی نقدی کے کام آتے ہیں دو قسم پر مشتمل ہیں: ایک تو یہ (نئے) سود وافیہ (بھر پور وزن کے بڑے درہم) اور دوسرے (پرانے) طبری درہم، جب اسلام آیا تو یہ انہی شکلوں میں مروج تھے۔ پھر عہد اموی میں خلفاء نے نئے درہم ڈھالنے کا ارادہ کیا تو نتائج غور کر لینے کے بعد انہوں نے کہا: یہ سके رہتی دنیا تک رائج رہیں گے؛ کیونکہ فریضہ زکوٰۃ کے سلسلہ میں آیا ہے: ”ہر دو سو یا ہر پانچ اوقیہ پر پانچ درہم زکوٰۃ واجب ہوگی“۔ اور ایک اوقیہ چالیس درہم کا ہوتا ہے۔ وہ اس بات سے ڈرے کہ تمام درہم سود وافیہ (بھر پور وزن کے بڑے) درہم کے برابر ڈھال دیں، لیکن بعد ازاں یہی صورت اتنی عام ہو گئی کہ اس کے سوا کوئی دوسری شکل لوگ پہچانتے بھی نہ تھے۔ وہ زکوٰۃ کے سلسلہ میں یہی جانتے



تھے کہ جب تک ان سود و افیہ و راہم کی تعداد دو سو یا اس سے زائد نہ ہو جائے ان پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی لیکن اس طرح زکوٰۃ کی مقدار میں کمی ہوتی تھی۔ اب وہ اس بات سے ڈرنے لگے کہ ان تمام دراہم کو طبریہ کے برابر بنا کر یہ قاعدہ بنا لیں کہ جب ان دراہم کی تعداد دو سو ہو جائے تو ان پر زکوٰۃ واجب ہو جائے گی۔ کیونکہ اس طرح مال کے مالک پر زیادتی ہوتی تھی۔ تب انہوں نے یہ چاہا کہ ان دونوں صورتوں کے درمیان کوئی ایسی شکل پیدا کی جائے کہ اس میں زکوٰۃ بھی پوری ادا ہو جائے اور لوگوں کو نقصان بھی نہ ہو۔ ساتھ ہی یہ صورت رسول اللہ ﷺ کی (مقررہ مقدار نصاب و سنت) زکوٰۃ کے مطابق بھی ہو۔

اس سے قبل لوگ دو حصوں میں زکوٰۃ ادا کرتے تھے بڑے دراہم سے علاحدہ اور چھوٹوں سے علاحدہ۔ اب جب انہوں نے نئے دراہم ڈھالنے کا عزم مصمم کر لیا تو انہوں نے بڑے درہم کو تول کر دیکھا تو اس کا وزن آٹھ دانق تھا۔ پھر انہوں نے چھوٹے درہم کو تول کر دیکھا کہ اس کا وزن چار دانق ہے۔ چنانچہ انہوں نے بڑے کی زیادتی اور چھوٹے کی کمی کو برابر کرنے کے لئے (اوسط نکال کر) ہر ایک کا وزن چھ دانق کر دیا، پھر مشقال سے اس کا وزن کر لیا؛ کیونکہ مشقال ہمیشہ سے ایک ہی معین وزن کا رہا ہے۔ چنانچہ انہوں نے ایسے دس درہم لئے جن میں سے ایک کا وزن چھ دانق تھا۔ پھر ان (دراہم) کو مشقالوں سے تولا تو وہ پورے سات مشقال ہوئے۔ اس طرح ان دراہم میں تینوں صورتیں پیدا ہو گئیں۔ ایک تو یہ کہ وہ (دس دراہم) سات (مشقال) کے ہموزن ہو گئے۔ ثانیاً یہ کہ چھوٹے اور بڑے درہموں کے درمیان اعتدال قائم ہو گیا۔ تیسرے یہ کہ رسول اللہ ﷺ کی زکوٰۃ سے متعلق سنت سے اسے پورا پورا تطابق ہو گیا نہ اس میں کوئی کمی رہی نہ بیشی۔ بعد ازاں دراہم کے یہ اوزان امت میں رائج ہو گئے اور امت نے اسے متفقہ طور پر قبول کر لیا۔ اور اس میں کسی کو اختلاف نہیں کہ پورے وزن کا درہم چھ دانق کا ہوتا ہے۔ اور اگر اس کے وزن میں کچھ کمی بیشی ہو تو حسب موقع کہا جائے گا کہ اس درہم کا وزن کم یا

زیادہ ہے۔ اس طرح لوگ زکوٰۃ کی ادائیگی میں بجز اللہ اسی اصل پر باقی ہیں جو سنت و ہدایت نبوت پر مبنی ہے۔ اس سے سرمو بھی متجاوز نہیں ہوئے۔ اس میں کسی قسم کا شک و شبہ اور التباس نہیں ہے۔ یہی صورت خرید و فروخت اور دیت سے متعلقہ امور کے معاملات میں چاندی کے سکے رکھنے والوں کے ساتھ جاری رہے گی۔

یہ ہیں وہ تفصیلات جو ہمیں اس ضمن میں پہنچیں۔ اس سے قبل بھی درہم کا وزن چھ دانق ہی ہوتا تھا۔ جس کا ذکر بعض احادیث میں آیا ہے۔ اصْبَحُ بنِ نُبَاتَةَ حضرت علیؑ سے روایت کرتے ہیں: ”رسول اللہ ﷺ نے چار سو اتنی درہموں پر حضرت فاطمہؑ کا نکاح مجھ سے کرایا تھا۔ ہر درہم کا وزن چھ (دانق) تھا۔ یہی وزن برابر چلا آ رہا تھا تا آنکہ بعد میں جیسا کہ ہم نے بتایا وہ سات (مثقال) کا کر دیا گیا“۔ (۲۳)۔

اسلامی عہد میں درہم کے اسی اجماعی وزن کو امام ابو سلیمان الخطابی نے بھی معالم السنن ۱۲/۵ میں مفصل بیان کیا ہے، اسی طرح ابن خلدون نے بھی مقدمہ میں اسے بہت تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ آپ نے کہا: ”فاعلم أن الإجماع منعقد منذ صدر الإسلام وعهد الصحابة والتابعين: أن الدرهم الشرعي هو الذي تزن العشرة منه سبعة مثاقيل من الذهب، والأوقية منه أربعين درهما، وهو على هذا سبعة أعشار الدينار، ووزن المثقال من الذهب اثنان وسبعون حبة من الشعير، فالدرهم الذي هو سبعة أعشاره، خمسون حبة وخمس حبة، وهذه المقادير كلها ثابتة بالإجماع، فإن الدرهم الجاهلي كان بينهم على أنواع، أجودها الطبري وهو أربعة دوانق والبغلي وهو ثمانية دوانق، فجعلوا الشرعي بينهما وهو ستة دوانق، فكانوا يوجبون الزكاة في مائة درهم بغلية ومائة طبرية خمسة دراهم وسطا.... وأما وزن الدينار باثنتين وسبعين حبة من الشعير الوسط فهو الذي

نقلہ المحققون، وعلیہ الإجماع، إلا ابن حزم فقد خالف ذلك، وزعم أن وزنه أربعة وثمانون حبة، نقل عنه القاضي عبد الحق، ورده المحققون، عدوه وهما وغلطا، وهو الصحيح“ (۲۴)۔

الغرض حضرت عمرؓ نے درہم کی مقدار میں اتحاد قائم کرنے کے ساتھ اسے عمومی تعامل و تداول نیز عملی تنفیذی شکل فراہم کی اور پھر عبد الملک بن مروان کے عہد میں اسلامی سکے متفق علیہ وزن پر ڈھالے گئے اور پھر اسلامی عہد میں اسی کے مطابق عمل ہوتا رہا، اس سے یہ بات بھی ظاہر ہے کہ یہ اسلامی کرنسی کے سکے چاندی اور سونے ہی سے ڈھلتے تھے لہذا ان کی اسی اور حقیقی قیمت میں کوئی فرق نہیں ہوتا تھا۔

موجودہ اوزان میں درہم و دینار کی مقدار:

تمام فقہاء و مؤرخین اس بات پر متفق ہیں کہ مشقال کے وزن کے مقابلے درہم کے وزن کا اوسط: ۱۰/۷ ہوتا ہے، لیکن معاصر فقہاء کے درمیان درہم و دینار کے اوزان میں اختلاف پایا جاتا ہے، چنانچہ شیخ علی مبارک، ڈاکٹر محمد ضیاء الدین الریس، ڈاکٹر یوسف القرضاوی اور ڈاکٹر صحیحی صالح کے نزدیک دینار کا وزن ۲۵ء۴ گرام ہے، اس اعتبار سے ان کے نزدیک درہم کا وزن ۲۹۷۵ء۲ گرام ہوا (۲۵)۔

جب کہ ڈاکٹر شوقی اسماعیل کے نزدیک دینار کی مقدار ۲۵ء۴ گرام ہے، اس حساب سے درہم کا وزن ان کے یہاں ۳۱۰ء۳ گرام ہوا۔ یہی رائے ڈاکٹر عبدالرحمن فہمی کی بھی ہے۔ ڈاکٹر مصطفیٰ ذہبی کے نزدیک درہم کا وزن ۱۲ء۳ گرام ہے، اور ڈاکٹر تقی الدین النبھانی کے نزدیک دینار کا وزن ۳۴ء۳ گرام اور درہم کا وزن ۱۲ء۳، اور ان کی یہ رائے صحابہ کرام کی متفق علیہ ۱۰/۷ کے اوسط کی مخالف ہے۔ ڈاکٹر محمود الخالدی کی رائے ڈاکٹر شوقی شحاتہ کی رائے کے مطابق ہے کہ دینار کا وزن ۲۵ء۴ گرام ہے اور درہم کا وزن ۱۱۵ء۳ گرام ہے (۲۶)۔

راج رائے یہ ہے کہ دینار کا وزن ۲۵ء۳ گرام ہے، اس حساب سے سونے کا نصاب

۲۵ء۳ × ۲۰ = ۸۵ گرام سونا ہوا۔ اور چاندی کا نصاب ۲۵ء۹ × ۲۰۰ = ۵۹۵ گرام۔

دینار و درہم کی زکوٰۃ کا نصاب:

بہت سی روایات و نصوص وارد ہوئے ہیں جو سونے چاندی کے نقد (درہم و دینار) کی زکوٰۃ کا نصاب متعین کرتی ہیں، اور یہ حکم متفقہ طور پر طے ہے کہ چاندی کی زکوٰۃ کا نصاب دو سو درہم اور سونے کی زکوٰۃ کا نصاب بیس دینار ہے۔

امام ابو عبید سونے چاندی کے نصاب پر تفصیلی روشنی ڈالنے کے بعد لکھتے ہیں:

”مسلمانوں میں اس مسئلہ میں کوئی اختلاف نہیں کہ جب کسی کے پاس شروع سال میں اتنی مقدار مالیت ہو جائے جس پر زکوٰۃ واجب ہو جاتی ہے مثلاً دو سو درہم (چاندی)، بیس دینار (سونا)، پانچ اونٹ، تیس گائیں، چالیس بکریاں بھٹیڑیں، تو ان اصناف میں سے کسی ایک کا شروع سال سے آخر تک مالک رہنے کی صورت میں تمام لوگوں کے قول کے مطابق اس مالک پر زکوٰۃ واجب ہو جاتی ہے“ (۲۷)۔

زکوٰۃ کے نصاب میں معیار اصل سونے کا ہے یا چاندی کا؟

دوسرے الفاظ میں ”زکوٰۃ واجب ہونے کے لئے معیار سونے کا نصاب ہے یا چاندی کا نصاب؟“

سونے یا چاندی کے جداگانہ مقدار نصاب سے کم ہونے پر زکوٰۃ ادا کرنے کی صورت

کے سلسلے میں امام ابو عبید فرماتے ہیں:

اگر درہم و دینار اپنے مقررہ نصاب سے کم ہوں تو ان پر زکوٰۃ سے متعلق پانچ اقوال ہیں:

(پہلا قول): ہر صنف میں سے بقدر حصہ اس کی زکوٰۃ ادا کرے گا۔ یہ قول امام ابراہیم

اور امام مالک بن انس کا ہے، ان کی دلیل یہ ہے کہ کسی مال پر اس کی انفرادی اور ذاتی حیثیت سے زکوٰۃ واجب ہوتی ہے اور یہ نہیں ہوگا کہ اس پر جو حق واجب ہوتا ہے وہ اس سے منتقل ہو کر دوسرے پر واجب ہو جائے۔ بنا بریں دونوں قسموں میں سے کسی ایک کو دوسرے میں ضم نہیں کیا جائے گا۔

(دوسرا قول): جو صنف کمتر ہو اسے زیادہ والی کے مطابق (قیمت کا اندازہ لگا کر) حساب کرے گا، اگر وہ بقدر نصاب بن جائے تو اس کی زکوٰۃ ادا کرے گا۔ یہ قول امام شععی، سفیان، اہل عراق اور ابن بکیر کی روایت کے مطابق امام اوزاعی کا ہے۔ امام ابو عبید نے اس کی تشریح یوں کی ہے: ”مطلب یہ ہے کہ (چاندی یا سونے میں سے) جو صنف کمتر ہوگی بازار کے موجودہ بھاؤ سے اس کی قیمت متعین کر کے (زیادہ مقدار والی صنف کی قیمت میں ملا کر) حساب کیا جائے گا؛ اس رائے کے قائلین دونوں کو ایک مال قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ درہم و دینار اشیاء کی قیمت ہیں، اشیاء کو ان دونوں قیمت نہیں کہا جاتا لیکن باہم یہ دونوں اصناف ایک دوسرے کے عوض ادھار (نسی) فروخت کرنا جائز نہیں ہے، اس سے ثبوت ملتا ہے کہ یہ دونوں چیزیں ایک ہی نوع ہیں۔ بنا بریں کمتر صنف کی قیمت اس کے بھاؤ کے مطابق لگا کر زیادہ مقدار والی صنف میں شامل کریں۔“

(تیسرا قول): جب دینار کی قیمت درہم میں شامل کرے تو ہر دینار کو دس درہم کے مساوی قرار دے خواہ (موجودہ) بھاؤ اس سے کمتر یا بیشتر ہو۔ یہ قول محمد بن حسن کا ہے، وہ اپنے مسلک پر یہ ثبوت پیش کرتے ہیں کہ اصل نصاب میں ہر دینار دس درہم ہی کے مساوی رکھا گیا ہے، آپ نہیں دیکھتے کہ جب تک دینار کی تعداد بیس نہ ہو جائے اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی۔ بالکل اسی طرح جیسے درہم کی تعداد دو سو ہونے سے قبل ان پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی؛ چنانچہ (ان دونوں کی مذکورہ تعداد کے بعد) یہ دونوں باہم دیگر مساوی ہو جاتے ہیں لہذا ان میں سے ہر ایک

پر چالیسواں حصہ واجب کیا گیا ہے۔

(چوتھا قول): ہر حال میں دیناروں کی قیمت لگا کر دراہم میں جوڑی جائے، خواہ دینار دراہم سے کم ہوں یا زیادہ۔ یہ بعض اہل اثر کا قول ہے اور اس سے ملتا جلتا قول امام عطاء وزہری کا ہے، یہ دونوں دیناروں کو بمنزلہ مال تجارت قرار دیتے ہیں۔ ان کا استدلال یہ کہ سنت میں صرف درہموں کی زکوٰۃ ہی مذکور ہے اور یہی سنت رسول ﷺ سے ثابت ہے۔ مسلمانوں نے دراہم سے مشابہت کی بنا پر ہی سونے پر زکوٰۃ واجب کر دی ہے۔ بنا بریں دیناروں کو مال تجارت قرار دیتے ہوئے ان کی قیمت لگا کر اسے دراہم میں شامل کیا جاتا ہے۔

(پانچواں قول): دونوں قسم کے مالوں پر سے زکوٰۃ ختم کر دی جائے گی، اور ان پر اس وقت تک کوئی زکوٰۃ نہیں لگے گی تا وقتیکہ وہ جدا گانہ (اپنے نصاب کی مقدار میں یعنی) دراہم دو صد، اور دینار میں نہ ہو جائیں۔ یہ قول امام ابن ابی لیلیٰ، شریک اور حسن بن صالح کا ہے؛ ان کی دلیل یہ ہے کہ خود سنت نے ان دونوں اصناف میں فرق قائم رکھا ہے اور ان دونوں کو مختلف نوع قرار دیا ہے۔ اس لئے کہ خود رسول اللہ ﷺ نے چاندی کو چاندی کے عوض ربا قرار دیا ہے الا یہ کہ وہ مساوی ہو۔ چنانچہ آپ ﷺ نے دونوں چاندیوں کو برابر قرار دیا؛ کیونکہ وہ دونوں ایک نوع ہیں۔ اسی طرح آپ ﷺ نے سونے کو سونے کے عوض ربا قرار دیا (الا یہ کہ وہ مساوی ہو) پھر آپ ﷺ نے سونے کو اس سے کئی گنا زیادہ چاندی کے عوض جائز قرار دیا اس لئے کہ وہ دونوں دو مختلف انواع ہیں۔ جب رسول اللہ ﷺ نے سونے اور چاندی کو دو جنس قرار دیا تو پھر ہم ان دونوں کو کیونکر اکٹھا کر کے ایک جنس بنا سکتے ہیں؟ اسی رائے کو راجح قرار دیتے ہوئے امام ابو عبید کہتے ہیں:

”یہی قول میرے نزدیک احادیث و آثار سے زیادہ قریب اور نظری طور پر زیادہ صحیح ہے۔ اس میں ایک دلیل تو یہی ہے کہ صراحتی میں یہ دونوں مختلف جنسیں ہیں اور دوسری دلیل خود

زکوٰۃ میں بھی ہے، اور وہ اس طرح کہ اگر ایک آدمی کے پاس بغیر درہم کے صرف بیس دینار ہوں اور اس وقت ایک دینار کا بھاؤ نو درہم یا اس سے کم کے برابر ہو تو بھی اس شخص پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔ اگرچہ یہ شخص دو سو درہم کا مالک نہ ہوگا۔ اسی طرح اگر اس شخص کے پاس دس دینار ہوں اور ایک دینار کی قیمت بیس یا بیس سے زائد درہم کے مساوی ہو تو بھی اس شخص پر زکوٰۃ واجب نہ ہوگی حالانکہ وہ دو سو درہم یا اس سے زائد کا مالک ہوگا۔ ملاحظہ فرمایا آپ نے کہ ان صورتوں میں درہم کی حیثیت کس طرح ابھر کر سامنے آگئی اور وہ دینار سے بالکل الگ ہو گیا؟ پھر کون سی وجہ ہے کہ دیناروں کو درہم میں شامل کر لیا جائے؟ اور انہیں اس موقع پر جب وہ بیس سے کم ہوں مال تجارت کی حیثیت دے دی جائے، اور دوسری صورت میں جبکہ وہ پورے بیس ہوں نقدی قرار دیا جائے؟ اس بارے میں میری پوری تائید ابن ابی لیلیٰ، شریک اور حسن کے قول کو حاصل ہے جس کی رو سے یہ دونوں دو جداگانہ مال ہیں جیسے اونٹوں کے ساتھ بھیڑ بکریاں یا گھوڑوں کے ساتھ کھجور۔ ان میں سے ایک کو بھی دوسری میں داخل نہیں کیا جائے گا“ (۲۸)۔

### ۳۔ نقدین (درہم و دینار کی کرنسیوں) میں ربا کی علت:

ربا کی تعریف: لغت میں ربا زیادہ کو کہتے ہیں (۲۹)۔

فقہاء کا اتفاق ہے کہ ”الربا هو زیادة أحد البدلین المتجانسین من غیر عوض یقابل الزیادة“ یعنی دو ہم جنس تبادلہ کی اشیاء میں بغیر کسی عوض کے زیادتی کرنا۔ ربا کے شرعی اصطلاحی معنی: احناف کے نزدیک اس کی تعریف یہ کی گئی ہے: ”فضل

خال عن عوض بمعیار شرعی، مشروط لأحد المتعاقدين فی المعاوضة“

(۳۰)۔ شوافع کے یہاں تعریف کے یہ الفاظ ہیں: بأنه ”البيع مع زیادة أحد العوضین

عن الآخر فی متحد الجنس“ (۳۱)۔

تعارفی تحریر

ربا کی قسمیں: ربا کی دو قسمیں ہیں: (۱) ربا النسبیۃ: ہم جنس عوضین میں سے کسی ایک میں ادھار کے مقابل زیادتی کرنا۔ (۲) ربا الفضل: اموال ربا میں ایک جنس کی دو چیزوں کے درمیان ایک ہی مجلس میں قبضہ کے ساتھ ایک کو دوسرے کے عوض زیادہ دینے پر ربا الفضل ہوتا ہے جیسے کہ ایک درہم کو دوسرے درہم کے عوض نقداً بیچنا۔ نیز فقہاء اس بات پر متفق ہیں کہ ربا الفضل صرف ایک جنس میں ہی ہوتا ہے۔

حکم ربا: ربا کتاب و سنت اور اجماع سے حرام ہے۔ قرآن کریم میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَاحِلٌ لِلَّهِ الْبَيْعُ وَحَرْمَ الرِّبَا﴾ (۳۲)۔ وعن جابر قال: "لعن رسول الله ﷺ آكل الربا، ومؤكله، وكاتبه، وشاهديه، وقال: هم سواء" (۳۳)۔ وعن عثمان بن عفان أن رسول الله ﷺ قال: "لا تبيعوا الدينار بالدينارين، ولا الدرهم بالدرهمين" (۳۴)۔

اموال ربا کی منصوص اجناس: حدیث شریف کی نص صریح سے چھ جنسوں میں ربا حرام ہے: [۱] سونا [۲] چاندی [۳] کھجور [۴] گندم [۵] جو [۶] نمک۔

عن عبادة بن الصامت عن النبي ﷺ أنه قال: "الذهب بالذهب مثلا بمثل، والفضة بالفضة مثلا بمثل، والتمر بالتمر مثلا بمثل، والبر بالبر مثلا بمثل، والملح بالملح مثلا بمثل، والشعير بالشعير مثلا بمثل؛ فمن زاد أو ازداد فقد أربى، بيعوا الذهب بالفضة كيف شئتم يدا بيدا، وبيعوا البر بالتمر كيف شئتم يدا بيدا، وبيعوا الشعير بالتمر كيف شئتم يدا بيدا" (۳۵)۔

ان چھ جنسوں میں ربا کی حرمت پر اجماع ہے (دیکھئے: القرطبی) لیکن کیا ربا صرف ان ہی چھ جنسوں میں منحصر ہے یا وہ اس کے علاوہ دوسری جنسوں میں بھی قیاس کے طریقہ سے علت مشترکہ کی بنیاد پر جاری ہوگا یا نہیں؟



جمہور فقہاء (خاص طور پر ائمہ اربعہ) کا اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ علت کی بنیاد پر ربا کا حکم دوسری اجناس میں بھی متعدی ہوگا، کیونکہ قیاس شرعی دلیل ہے، اس کے علاوہ ایک حدیث میں اس کی طرف صراحت بھی موجود ہے جسے مالک بن انس اور اسحاق بن ابراہیم نے چھ جنسوں کے اندر ربا کی حرمت والی روایت کے آخر میں یہ زیادہ الفاظ بیان کئے ہیں: ”و کذلک کل ما یکال أو یوزن“ (۳۶)۔

اس سے یہ واضح ہو گیا کہ یہ حکم دوسری اجناس میں علت مشترکہ کی بنیاد پر جاری ہوگا، اور صرف چھ اعیان کی تخصیص حدیث میں اس وجہ سے ہے کہ اس زمانہ میں ان ہی کے درمیان لین دین کا عام رواج تھا۔ اس سلسلہ میں ابن حزم الظاہری جمہور سے الگ رائے رکھتے ہیں اور وہ یہ کہ بیع و سلم میں ربا صرف انہی چھ اجناس میں منحصر ہے اور علت کی بنیاد پر اس کا حکم متعدی نہیں ہوگا (۳۷)۔

علت ربا: لیکن جمہور فقہاء اس اتفاق کے باوجود ان چھ اجناس میں علت حرمت میں مختلف آراء رکھتے ہیں، جن میں سے تین مشہور و معتبر ہیں (۳۸):

پہلی رائے: علت ربا: قدر و جنس ہے (قدر سے مراد مکملی چیزوں میں کیل اور موزونی چیزوں میں وزن) لقول النبی ﷺ: ”و کذلک کل ما یکال و یوزن“۔ نقدین چونکہ موزونی ہیں اسلئے ان میں علت ربا وزن و جنس ہوا۔ یہ قول احناف، مشہور روایت کے مطابق امام احمد، امام زہری، حکم، حماد، ثوری، اوزاعی، نخعی کا ہے۔ علامہ کاسانی فرماتے ہیں: ”العلۃ فی الذهب والفضۃ: الوزن مع الجنس، فلا تتحقق العلة إلا باجتماع الوصفین“ (۳۹)۔ علامہ ابن قدامہ امام احمد کا مذہب بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ”إن المشہور عن أحمد: أن علة الربا فی الذهب والفضۃ موزون جنس“ (۴۰)۔

اس رائے کا مطلب یہ ہے کہ ربا ہر مکمل و موزون چیز میں اسی کی جنس کے ساتھ تبادلہ

کرنے پر جاری ہوگا چاہے وہ مطعوم ہو یا نہ ہو۔ اس اعتبار سے احناف کا یہ اصول ہے کہ اگر دونوں اوصاف قدر و جنس جمع ہوں، یعنی باہم تبادلہ کی جانے والی دونوں چیزیں مکملات یا موزونات میں سے ہوں اور ہم جنس بھی ہوں تو کمی بیشی کے ساتھ تبادلہ کرنا ناجائز ہے اور ادھار معاملہ کرنا بھی ناجائز ہے۔ یہ معاملہ مثلاً بمثل اور یداً بیداً ہونا چاہئے۔ اور اگر ایک وصف موجود ہو یعنی دونوں چیزیں ہم جنس ہو، لیکن کیلی یا وزنی نہ ہوں یا دونوں کیلی یا وزنی ہوں لیکن ہم جنس نہ ہوں تو تقاضل (کمی بیشی کے ساتھ معاملہ کرنا) جائز ہوتا ہے، اور ادھار معاملہ کرنا حرام ہوتا ہے، اور اگر دونوں اوصاف معدوم ہوں یعنی باہم تبادلہ کی جانے والی دونوں چیزیں الگ الگ جنس کی ہوں اور کیلی یا وزنی بھی نہ ہوں تو تقاضل (کمی بیشی کے ساتھ معاملہ کرنا) بھی جائز ہوتا ہے اور ایک طرف سے ادھار معاملہ کرنا بھی جائز ہوتا ہے۔

دوسری رائے: علت ربا: مطلق ثمنیت ہے، یہ قول (مشہور مذہب کے برخلاف) مالکیہ کا ہے اور یہی رائے امام محمد (بیع فلس بفلسین کے مسئلہ میں) امام ابن تیمیہ کی بھی ہے اور نقد میں علت ربا کے بیان میں شیخ خزشی بھی یہی لکھتے ہیں: "هل علتہ الثمنیة أو مطلق الثمنیة؟ ... بأن غلبة الثمنیة هو المشہور، ومطلق الثمنیة هو خلاف المشہور" (۴۱)۔ امام ابن تیمیہ <sup>بمطلق ثمنیت</sup> کے بارے میں لکھتے ہیں: "الأظهر أن العلة فی تحریم الربا فی الدنانیر والدراہم هو الثمنیة، لا الوزن" نیز اس کے بعد اس علت کے مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں: "والتھلیل بالثمنیة تعلیل بوصف مناسب ... فان المقصود من الأثمان أن تكون معیاراً للأموال، يتوسل بها إلى معرفة مقادیر الأموال، ولا يقصد الانتفاع بعینها، فمتی بیع بعضها ببعض إلى أجل قصد بها التجارة التي تناقض مقصود الثمنیة، و اشتراط الحلول والتقابض فیها تکمیل لمقصودها، ... فإذا صارت الفلوس أثماناً صار فیها المعنی، فلا یباع ثمن

بشمن إلى أجل“ (۴۲)۔

تیسری رائے: علت ربا غلبہ شمنیت ہے: شوائع، مالکیہ (مشہور مذہب میں)، امام احمد کے نزدیک (ایک قول میں) نقدین میں علت ربا غلبہ شمنیت ہے۔ امام نووی فرماتے ہیں: ”أما الذهب والفضة فالعلة عند الشافعي فيهما كونهما جنس الأثمان غالباً، وهذه علة قاصرة عليهما لا تتعداهما، إذ لا توجد في غيرهما“ (۴۳)۔

امام غزالی کا بیان ہے: ”وعلة الربا في النقدين كونهما جوهرى الأثمان“ (۴۴)۔

ابن رشد فرماتے ہیں: ”العلة في منع التفاضل في الذهب والفضة: هو الصنف الواحد، مع كونهما رؤوساً للأثمان، وقيماً للمتلفات، وهذه العلة هي التي تعرف عندهم - أي المالكية - بالقاصرة؛ لأنهما ليست موجودة عندهم في غير الذهب والفضة، ثم قال: ووافق الشافعي مالكا في علة التفاضل والنساء في الذهب والفضة، أعنى أن كونهما رؤوساً للأثمان وقيماً للمتلفات، هو عندهم علة منع النسيئة إذا اختلف الصنف، فإذا اتفق منع التفاضل“ (۴۵)۔

ابن قدامة لکھتے ہیں: ”أن العلة في الأثمان الثمنية، روى ذلك عن أحمد جماعة“ (۴۶)۔

جب کہ طعام میں مالکیہ کے نزدیک علت ربا اقتیات (اصلاح قوت) وادخار (عرف کے مطابق زیادہ مدت تک باقی رہنے کی صلاحیت) ہے۔ اور شوائع کے نزدیک نقدین کے علاوہ میں علت ربا مطعوم ہونا ہے۔

مناقشہ: مذکورہ بالا آراء میں سے پہلی رائے جس کی نمائندگی احناف کرتے ہیں، اس پر شوائع کی طرف سے یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ قدر کی علت ضعیف ہے اس لئے کہ اس سے ہر

تعارفی تحریر

موزون چیز کا ان دونوں (سونے چاندی) سے حکم میں الحاق لازم آتا ہے جیسے تانبا، لوہا اور روئی وغیرہ، جب کہ ان دونوں کو ان کے علاوہ کے ساتھ تبادلہ کی شکل بیع سلم میں دینا جائز ہے جس پر اجماع ہے، اگر علت وزن ہوتی تو جائز نہ ہوتا جیسا کہ گہوں کا جو سے تبادلہ سلم میں ناجائز ہے۔ المجموع میں یہ عبارت آئی ہے: "يجوز إسلام الذهب والفضة في غيرهما من الموزونات بالإجماع، كالحديد وغيره، فلو كان الوزن علة لم يجز، كما لا يجوز إسلام الحنطة في الشعير، والدرهم في الدينير"۔ دوسرا اشکال امام ابوحنیفہ کے مذہب سے ماخوذ ہے، اور وہ یہ کہ امام ابوحنیفہ کے نزدیک ڈھلے ہوئے تانبے، لوہے کو ایک دوسرے کے تبادلہ میں کمی بیشی کے ساتھ بیچنا جائز ہے، اگر علت وزن ہوتی تو جائز نہ ہوتا، اس سلسلہ میں مجموع کی عبارت ہے: "بان ابا حنيفة جوز بيع المضروب من النحاس والحديد والرصاص بعضه ببعض متفاضلا، ولو كانت العلة الوزن لم يجز" (المجموع ۹/۴۴۴)۔ چنانچہ احناف کے نزدیک سونا چاندی حکم میں لوہے اور روئی سے مختلف ہیں جب کہ دونوں میں علت کے دونوں اوصاف (جنس اور وزن) موجود ہیں، احناف کا جواب یہ ہے کہ دونوں ہم جنس نہیں اور متفق قدر بھی الگ ہے، ثمن کا وزن، مٹمن کے وزن سے جدا ہے، علامہ کاسانی لکھتے ہیں: "بان المجانسة ظاهرة الانتفاء، وأما القدر المتفق فلا ن وزن الثمن يخالف وزن المٹمن، ألا ترى أن الدرهم بالمثاقيل؟ والقطن والحديد يوزنان بالقبان، فلم يتفق القدر، فلم توجد العلة، فلا يتحقق الربا" (بدائع الصنائع ۷/۳۱۱۳)۔

جہاں تک دوسری رائے کا تعلق ہے: جس کی نمائندگی مالکیہ (خلاف مشہور قول میں)، امام محمد ("بیع فلس بفلسین" میں ان کے مسلک کی روشنی میں) اور امام ابن تیمیہ کرتے ہیں۔ اس کی تائید کرتے ہوئے ڈاکٹر جاشم لکھتے ہیں کہ یہی رائے میرے نزدیک راجح اور قابل

عمل ہے جس میں دونوں کی خوبی پائی جاتی ہے اور وہ علت بننے کی سب سے زیادہ مستحق ہو اس لئے کہ علت کا متعدی ہونا ہی شریعت کے مقاصد میں سے ہے، ان کے الفاظ ملاحظہ ہوں: ”فہذا الراى يجمع بين مزيتى الراين السالفين، وتصلح حجتھما حجة له، فيعتبر الثمنية علة فى الذهب والفضة، ولا يقصرها عليهما، بل يعدى حكمھما إلى غيرھما، إذا وجدت فيه علتھما، فلا يحصر تعدية الحكم فيما اقتصر عليه أصحاب الراى الأول بل يعديه إلى كل ما يصلح أن يكون ثمنًا، وتعدية العلة من مقاصد الشرع وحكمته، وإلا لم يعد للتعليل فائدة“ (۴۷)، ”ولم يبعد الإمام مالک حين لاحظ هذا المعنى فقال: ”ولو أن الناس أجازوا بينهم الجلود حتى يكون لها سكة وعین لكرهتها أن تباع بالذهب والورق نظرة“ (۴۸)۔

جہاں تک تیسری رائے کا تعلق ہے جس کی نمائندگی شوافع و مالکیہ (مشہور مذہب میں) کرتے ہیں اس پر بھی یہی اعتراض وارد ہوتا ہے جو پہلی رائے پر تھا چونکہ اس رائے میں علت ثمنیت قاصرہ ہے (یعنی صرف سونے و چاندی میں منحصر ہے) متعدیہ نہیں، مجموع میں ہے: ”أما الذهب والفضة فإنه يحرم فيهما الربا لعدة واحدة وهو أنهما من جنس الأثمان، فيحرم الربا فيهما، ولا يحرم في سواهما من الموزونات... أنه لا يجوز أن يكون تحريم الربا لمعنى يتعداهما إلى غيرهما من الأموال؛ لأنه لو كان لمعنى يتعداهما إلى غيرهما لم يجز إسلامهما فيما سواهما من الأموال؛ لأن كل شيئين جمعتهما علة واحدة فى الربا يجوز إسلام أحدهما فى الآخر: كالذهب والفضة والحنطة والشعير، فلما جاز إسلام الذهب والفضة فى الموزونات والمكيلات وغيرهما من الأموال، دل على: أن العلة فيهما لمعنى لا يتعداهما، وهو أنه جنس الأثمان“ (المجموع ۱/۹، ۴۴۳)۔

چنانچہ احناف اعتراض کرتے ہوئے کہتے ہیں: ”بان علتکم قاصرة كما ذكرتم فهي لا تتعدى الذهب والفضة في حين أنهما الأصل الذي استبطنتم منه العلة، وعندكم في العلة وجهان لأصحاب الشافعية:

أحدهما: أنها فاسدة، لا يجوز التعليل بها، لعدم الفائدة منها، فإن حكم الأصل قد عرفناه، وإنما مقصود العلة أن يلحق بالأصل غيره.

ثانيهما: أن العلة القاصرة صحيحة، ولكن المتعدية أولى، قالوا: فعلتكم مردودة على الوجهين؛ لأن حكم الذهب والفضة عرفناه بالنص؛ ولأن علتكم قد توجد ولا حكم، وقد يوجد الحكم ولا علة، كالفلوس بخراسان وغيرهما، فإنها أثمان ولا ربا فيها عندكم، والثاني كأواني الذهب والفضة يحرم الربا فيها، مع أنها ليست أثماناً“ (بدائع الصنائع ۷/۳۱۰۶)۔

۴۔ فلوس (پیسے) نامی کرنسی اور اس کی شرعی حیثیت فقہاء کے اقوال کی روشنی میں:  
لغوی معنی:

فلس جمع فلوس عربی زبان میں پیسے کے معنی میں استعمال ہے، ابن منظور کہتے ہیں:  
”الفلس معروف والجمع فی القلة أفلس، و فلوس فی الكثير، وأفلس الرجل: صار ذا فلوس بعد أن كان ذا دراهم، يفلس أفلاسا: صار مفلسا“ (۴۹)۔

یہ لفظ یونانی زبان سے معرب ہے، جس کی اصل (أفلس یا فولیس) ہے، یہ ایشیائی سکے ہے، کہا جاتا ہے کہ فلس چھوٹا تانبے کا نقد ہے جو چھوٹی چھوٹی اشیاء کے خریدنے کے لئے مستعمل ہوتا ہے، اور یہ مطبوع و غیر مطبوع دونوں طرح مستعمل تھا (۵۰)۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس کا اطلاق صرف اسی تانبے کے سکے پر ہوتا ہے بلکہ اس کا اطلاق ہر اس سکے پر ہوگا جس

نے عرف و قانون میں کرنسی کا درجہ حاصل کر لیا ہو (۵۱)۔

اس سکہ کا استعمال کافی قدیم ہے، امام سیوطی لکھتے ہیں: "التعامل بالفلوس قدیم" (۵۲)۔ اور بعض علماء کے نزدیک یہ عہد اسلامی کی ابتدا ہی سے موجود ہے، اور عرب بھی اس سے لین دین کرتے تھے (دیکھئے: المعجم الاقتصادي ۳۳۵)، لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ رسول اکرم ﷺ نے بھی فلوس سے معاملہ کیا ہے چونکہ اس سلسلہ میں آپ ﷺ سے کوئی روایت منقول نہیں، جب کہ راجح گمان یہ ہے کہ صحابہ کرامؓ سے جانتے تھے لیکن ان سے اس کے ذریعہ تبادلہ کرنا عام نہ تھا (دیکھئے: العملۃ و احکامها، مجلۃ الشریعۃ، ۲۹۱)، جس کی قوی دلیل مسند احمد کی وہ روایت ہے جسے عبد اللہ بن عبادۃ بن صامتؓ نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے: "عن عبد اللہ بن الصامتؓ أنه کان مع ابی ذرؓ فخرج عطاؤه ومعہ جاریۃ لہ فجعلت تقضی حوائجہ قال: ففضل معها سبع قال فأمرها أن تشتري به فلوسا قال: قلت لہ: لو ادخرته للحاجة تنوبک أو لضیف ینزل بک قال: إن خلیلی عہد إلی أن ایما ذهب أو فضة أو کي علیہ فهو جمر علی صاحبه حتی یفرغه فی سبیل اللہ عزوجل" (۵۳)۔

اس روایت کے اعتبار سے فلوس کا حکم عروض کا ہے، چونکہ فعل صحابی سے عروض کا ہونا ثابت ہوتا ہے، اور ساتھ میں ان سکوں کا اٹھان ہونے کا بھی علم ہوتا ہے۔ اگر اس فعل کے صدور کو عصر رسول میں مان لیا جائے اور حضور کے علم کے بعد تقریر سمجھی جائے تو حدیث کا حکم اختیار کر لے گا، لیکن چونکہ اس میں اس کی تصریح نہیں اس لئے مذہب صحابی کی تو اسے پوری حیثیت حاصل ہے، جب کہ اس کی اسناد بھی صحیح ہے۔

مذکورہ بالا تصریحات سے یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ فلوس نامی کرنسی کے ذریعہ تبادلہ و تعامل قدیم زمانہ سے ہی ایک حقیقت و امر واقعہ ہے جس سے انکار ناممکن ہے، یہ بھی متفق علیہ ہے کہ یہ

عربی اصطلاحی اثمان ہیں جن کی ذاتی قیمت ان کی فعلی اسی قیمت کے برابر نہیں ہوتی، لیکن اس کو ذریعہ تبادلہ کے طور پر استعمال کرنا اور اس کی عام مقبولیت کے ساتھ اس پر لوگوں کو اعتماد کرنا، ان سب چیزوں نے اسے اثمان اور چیزوں کی قیمت اور ذریعہ تبادلہ کی حیثیت عطا کر دی جسے فقہاء [الفلوس النافقة یا الفلوس] سے تعبیر کرتے ہیں اور نقد کے اعتبار سے اسے مانتے ہیں، نہایت اکتاج میں ہے: "إن الفلوس لا تدخل في النقد إلا مجازاً" (۵۴)۔

یہ فلوس حقیقت میں آج کی دھاتی اور نوٹوں کی کرنسی سے مماثلت رکھتے ہیں، دونوں ہی تبادلہ کا موثوق ذریعہ ہیں اور دونوں کی اصلی ذاتی قیمت اس کی عربی اسی قیمت سے مساوی نہیں ہوتی، اسی وجہ سے فقہاء کرام نے اس کے سلسلہ میں تفصیلی عملی احکام مستنبط کئے ہیں جس کے مباحث بالتفصیل بیوع، صرف، ربا وغیرہ میں ملتے ہیں۔ اس بحث کا بنیادی مقصد موجودہ کاغذی نوٹوں کی کرنسی کے سلسلہ میں حکم شرعی کا تلاش کرنا ہے جو اصل میں فلوس نامی کرنسی کے مماثل ہے، اسی اصل پر قیاس کر کے ہم موجودہ کرنسی کی صحیح حیثیت تک پہنچ سکتے ہیں، اسی لیے اس بحث میں مقیس علیہ کی حقیقت پر فقہاء کرام کے اقوال کے تحت مکمل روشنی ڈالی جائے گی تاکہ صحیح حکم تک پہنچنا آسان ہو، وباللہ نستعین۔

فلوس کے سلسلے میں فقہاء کے درمیان محل خلاف کی نشاندہی:

فلوس کے سلسلے میں محل نزاع کی نشاندہی ضروری ہے تاکہ مسئلہ کا سمجھنا آسان ہو، یہ جاننا ضروری ہے کہ فلوس صرف اصطلاح و عرف کی وجہ سے ہی اثمان میں شمار کئے جاتے ہیں اور ان کی اصل حقیقت و ذاتی حیثیت سے کوئی خاص معین احکام متعلق نہیں ہوتے، لیکن اختلاف اس صورت میں پیش آتا ہے جب انہیں اثمان و سکہ کرنسی قرار دے دیا جائے، اور اشیاء کی قیمت ہونے میں ذریعہ تبادلہ کے طور پر ان کا استعمال مقبول و عام ہو جائے اور وہ سونے چاندی کی جگہ اختیار کر لیں۔



اگر یہ صورت حال ہو جاتی ہے تو پھر فقہاء کرام قیاس کر کے ان پر نقدین (سونا، چاندی) کے احکام صادر کرنے پر غور کرتے ہیں، چنانچہ اصل مقیاس علیہ پر اختلاف واقع ہو جاتا ہے، اور یہ سوال اٹھتا ہے کہ ان پر معلل ہونے کی وجہ سے قیاس درست ہے یا ان پر قیاس کرنا ان کے غیر معلل ہونے کی وجہ سے درست ہی نہیں؟ اگر معلل مان لیا جائے تو پھر ان کے اندر علت ربا کیا ہے جس کی فلوس میں پائے جانے پر بحث ہو؟ کیا یہ جنس و وزن ہے یا مطلق شمئیت ہے یا خلقی اصلی ذاتی مالی غلبہ شمئیت ہے جو متعدی نہیں؟ اگر علیت میں فلوس نقدین سے مماثل نہیں تو پھر کیا ان کا شمار سامان تجارت میں ہو؟

اس سلسلے میں فقہاء کے درمیان اختلاف واقع ہو گیا، لہذا بعض نے انہیں نقدین پر قیاس کر کے حکم صادر کیا، جب کہ فلوس کی شمئیت و قیمت اصطلاحی ہے اور نقدین کی شمئیت ذاتی، خلقی ہے، جس سے مقیاس اور مقیاس علیہ میں مخالفت پائی جاتی ہے۔ بعض دوسرے علماء نے انہیں سامان تجارت میں شمار کر کے حکم لگایا جب کہ فلوس مقصد و اہمیت میں نقدین سے زیادہ قریب ہیں، اور دونوں اپنے کام میں مکمل مماثل ہیں، پھر آیا اگر انہیں سامان تجارت تسلیم کر لیں تو کیا ان پر ہر حال میں سامان تجارت کا ہی حکم لگے گا چاہے وہ رائج ہوں یا نہ ہوں، چاہے انہیں تجارت کے لئے رکھا گیا ہو یا جمع کرنے کے لئے؟ پھر اگر یہ فلوس (عروض کے حکم میں) اثمان و رأس المال کی مکمل حیثیت اختیار کر لیں تو کیا حکم ہوگا؟ الغرض انہیں نقدین کے حکم میں شمار کیا جائے یا سامان تجارت میں یا کوئی مستقل تیسرا درجہ دیا جائے، اور اس پر قواعد شریعت اور ابواب فقہ میں بیوع و ربا و صرف کی روشنی میں از سر نو حکم لگایا جائے؟

اس کے جواب سے پہلے اگر ہم فلوس نامی کرنسی کی حقیقی حیثیت کو بھی پہچان لیں جس کی وجہ سے ہی فقہاء کے درمیان اختلافات پیدا ہوئے ہیں کہ ان کی حیثیت ذاتی ہے یا اعتباری؟ اسی پر حکم شرعی منحصر ہے۔ فقہاء کے اقوال کی روشنی میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فلوس کی ذاتی کوئی

خاص حیثیت نہیں، اس کو صرف اعتباری حیثیت حاصل ہے۔ جو بعض اعتبارات سے نقدین کی حیثیت و حقیقت سے ملتی ہے اور بعض دوسرے اعتبارات سے سامان تجارت کی حیثیت و حقیقت سے مماثل معلوم ہوتی ہے، ان ہی اعتبارات کی وجہ سے اختلاف ہوا، جس کو مانے اور جانے بغیر مسائل منضبط نہیں ہو سکتے۔ شاید اسی کی طرف امام ابن عابدین نے اشارہ کیا ہے، آپ لکھتے ہیں:

”إن الفلوس لها حكم العروض من وجه، و حكم الثمن من وجه“ (۵۵)، اور اسی کو بیان کرتے ہوئے علامہ خرشی یوں رقم طراز ہیں: ”إن الفلوس محل التوهم“ (الخرشی علی خلیل ۵۵/۵ وحاشیۃ الرزقانی علی خلیل ۶۰/۵)۔

فلوس کے بارے میں فقہاء کرام کے مذاہب:

مذکورہ بالا محل خلاف کی تحدید کے بعد فقہاء کے اختلاف کو سمجھنا آسان ہو جاتا ہے، اس سلسلے میں ان کی آراء فقہیہ اس طرح ہیں:

مذہب حنفی:

فقہ حنفی کے معتبر مراجع و ماخذ میں فلوس پر دو اعتبار سے حکم ملتا ہے:

☆ ایک اعتبار سے انہیں سامان تجارت میں شامل کر کے حکم لگایا گیا ہے، لہذا ان میں سونا چاندی کی طرح ربا و صرف کے احکام جاری نہ ہوں گے۔ اس سلسلے میں ان کی عبارت اس طرح ہے: ”فیجوز بیع الفلوس بالفلسین بأعیانہما عند أبی حنیفة، و أبی یوسف“ لأنہما بالتعین أبطال الثمنیة، فأصبحت كالعروض، فیجوز التفاضل فیہا حینئذ، وخالف محمد بن الحسن فی ذلك فقال: بعدم الجواز لعدم إسقاط ثمنیتہا، باعتبارها رائجة، فہی ثمن بالاصطلاح، فلیس للمتعاقدین تعینہما“ (۵۶)۔

علامہ کاسانی ایک فلس کو دو فلس کے بدلہ میں بیچنے کے جواز کی علت بیان کرتے ہوئے

فرماتے ہیں: ”بأنه مما يباع عدداً، والعدد ليس من أوصاف علة الربا ..... ويجوز بيع المدروعات والمعدودات المتفاوتة واحداً باثنين يدا بيد كبيع ثوب بثوبين نحو ذلك بالإجماع، اس کے بعد مزید فرماتے ہیں: ”يجوز بيع المعدودات المتقاربة من غير المطعومات بجنسها متفاضلاً عند أبي حنيفة وأبي يوسف بعد أن يكون يداً بيد كبيع الفلاس بالفلسين بأعيانهما، وعند محمد لا يجوز، لأن الفلوس أثمان، فلا يجوز بيعها بجنسها متفاضلاً كالدرهم والدنانير“ (۵۷)۔

سرخسی فرماتے ہیں: ”وإذا اشترى فلوساً بدرهم ونقد الثمن ولم تكن الفلوس عند البائع، فالبيع جائز بأن الفلوس الرائجة ثمن كالنقود“ (۵۸)۔

☆ دوسرے اعتبار سے انہیں نقود کی عرفی اصطلاحی حیثیت دیکر حکم لگایا گیا ہے جس کی رو سے ان پر بھی دراهم و دنانیر کی طرح احکام ربا و صرف جاری ہوں گے، چنانچہ اس سلسلہ میں علامہ سرخسی فلس کی بیع فلسین کے بارے میں لکھتے ہیں: ”أن يبيع فلوساً بغير عينه بفلسين بغير أعيانهما لا يجوز لأن الفلوس الرائجة أمثال متساوية قطعاً لاصطلاح الناس على سقوط قيمة الجودة فيها فيكون أحد الفلسين فضلاً خالياً عن العوض مشروطاً في البيع، وذلك هو الربا بعينه، وإن باع فلوساً بعينه بفلسين بغير أعيانهما لم يجز أيضاً، فأما إذا باع فلوساً بعينه بفلسين بأعيانهما يجوز في قول أبي يوسف، وهو قول أبي حنيفة، ولا يجوز في قول محمد، وهذا ينبغي على أن الفلوس لا تتعين بالتميين ما دامت رائجة عند محمد وعلى قولهما تتعين بالتميين إذا قوبلت بجنسهما“۔

امام سرخسی ”فلوس“ میں صفت شمیت اور اصطلاحی شمیت کے اشکال کو دفع کرتے ہوئے

فرماتے ہیں:

”إن صفة الثمنية في الفلوس ليست بصفة لازمة، ولا هو ثابت بأصل الخلقة، بل بعارض اصطلاح الناس والعاقده أن قصد تصحيح العقد، ولا وجه لتصحيح العقد إلا بأن تتعين الفلوس، وتخرج من أن تكون رائجة ثمننا في حقهما فيجعل كأنهما أعرضا عن ذلك الاصطلاح“۔

اور اصطلاحی ثمنیت کی وضاحت اس طرح کرتے ہیں: ”والدلیل علی أن معنی الثمنية فی الفلوس بالاصطلاح أنه یصلح ثمن الخسیس من الأشياء دون النفیس، وأنه یروج بعض الأشياء دون البعض، ویروج فی بعض المواضع دون البعض بخلاف الذهب والفضة“ (۵۹)۔

لیکن اگر فلوس سے رائجہ کی صفت ختم ہو جائے اور کاسدہ بن جائیں تو پھر وہ سامان کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں: ”أما إن كانت كاسدة فهي مبیعة، لا یصح العقد علیها ما لم تتعین، لأنها سلع“ (۶۰)۔

لیکن ماوراء النہر کے احناف غطارفہ (وہ دراہم جن کی نسبت غطریف بن عطاء الکندی، خراسان کے حاکم کی طرف ہے جو رشید کے عہد میں تھا، یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ رشید کے ماموں تھے) اور عدالی (عدل کی طرف یا اس نام کے بادشاہ کی طرف منسوب دراہم) نامی کرنسی میں تفاضل کے ساتھ بیع کے جواز کے قائل نہیں تاکہ ربا کا باب بند ہو جائے۔

ابن ہمام لکھتے ہیں: ”إن مشایخ ماوراء النہر من بخاری و سمرقند لم یفتوا بجواز ذلك، ای بیعها بجنسها متفاضلا فی العدالی والغطارفة، مع أن الغش فیها أكثر من الفضة، لأنها أعز الأموال فی دیارنا، فلو أبیح التفاضل فیها ینفتح باب الربا الصریح، فإن الناس حینئذ یعتادون التفاضل فی الأموال

الفیسة، فیتدرجون إلى ذلك فی النقود الخاصة، فممنع ذلك حتما لمة  
الفساد“ (شرح فتح القدر ۵/۳۸۲، نزدیکھے: رد المحتار علی الدر ۳/۱۸۳-۱۸۴)۔

## مذہب مالکی:

مالکیہ کے نزدیک بھی فلوس کا حکم دو حالتوں یا دو اعتبارات پر مبنی ہے:

☆ پہلی حالت یا اعتبار اول: یہ کرنسی کی حیثیت سے دراہم و دنانیر سے مشابہ ہیں چونکہ یہ اپنی اصل سے نکل کر نقدین کے کام کے طور پر مستعمل ہوتے ہیں اور لوگوں نے کرنسی کی شکل میں اسے ذریعہ تبادلہ کے طور پر استعمال کرنا شروع کر دیا ہے، اسی لئے ربا، صرف، اور بیع کے ابواب میں ان کا حکم دراہم و دنانیر کی طرح ہوگا، لیکن اس میں حکم کراہت کا ہوگا نہ کہ حرمت کا، دلیل نہ ہونے کی وجہ سے اور چونکہ یہ ہر طرح سے دراہم و دنانیر سے مماثل نہیں ہوتے۔ چنانچہ ہم جنس سے تبادلہ کی حالت میں ادھار یا کمی زیادتی کے ساتھ خرید و فروخت مکروہ ہے۔ المدونۃ الکبریٰ میں ہے:

قال مالک: ”لا یصلح الفلوس بالفلوس جزافا، ولا وزنا مثلا بمثل، ولا کیلا مثلا بمثل، یدا بیدا، ولا الی أجل، والفلوس ما هنا فی العدد بمنزلة الدراهم والدنانیر فی الورق، وقال مالک: أکره ذلك فی الفلوس، ولا أراه حراما کتحریم الدنانیر والدراهم، وسئل ابن القاسم: رأیت أن اشتریت فلسا بفلسین أ یجوز هذا عند مالک؟ قال: لا فلسا بفلسین وسئل عن مراطلة الفلوس بالنحاس واحدا باثنین، یدا بیدا؟ قال: لا خیر فی ذلك“ امام مالک کے اس قول کی تعلیل بیان کرتے ہوئے ابن القاسم کہتے ہیں: ”لأن الفلوس لا تباع الا عددا، فاذا باعها وزنا کان من وجه المخاطرة، فلا یجوز بیع الفلوس جزافا، فلذلك

کرہ مالک رطل الفلوس برطلین من النحاس، اسی پر تخریج کرتے ہوئے کہتے ہیں:  
ولو اشتری رجل رطل فلوس بدرهم لا یجز ذلک، مزید لکھتے ہیں: سالت مالکا  
عن الفلوس تباع بالدرهم والدنانیر نظراً، ای مؤجلۃ، او یباع الفلوس  
بالفلسین، فقال مالک: إنی أکره ذلک وما أراه مثل الذهب والورق فی  
الکراهیة“ (المدونۃ لجلد اول ۲/۲۹۲ والجلد الرابع ۱۱۵/۹)۔

بیع سلم اور فلوس: مدونہ میں ہے: فیمن أسلم فلوسا فی طعام؟ قال مالک:  
لا بأس به، وكذا فی إسلام الطعام فی الفلوس، ثم قال: فإن أسلم دراهم فی  
فلوس، قال مالک: لا یصلح ذلک، وكذلك الدنانیر إذا أسلمها فی  
الفلوس، وكذلك لو باع فلوسا بدرهم إلى أجل، وبدنانیر إلى أجل، ذلک  
لا یصلح“، اس کی تعلیل یہ بیان کی کہ: ”بان الفلوس عین، ولأن هذا صرف،... قال  
مالک: لا یصلح السلم فی الفلوس“ (المدونۃ لجلد الرابع ۲۰/۹)۔

☆ دوسری حالت یا اعتبار ثانی: یہ اس اعتبار سے سامان تجارت سے مشابہ ہیں، اس  
لئے ان میں زکاۃ نہیں، یہی مالکیہ کا مشہور مذہب ہے، ہاں اگر انہیں ارادۃ تجارت کی غرض سے  
لیا گیا ہے تو پھر ان پر سامان تجارت کی زکاۃ لازم آئے گی چاہے ڈھلے ہوں یا نہ ہوں، اس حالت  
کے اعتبار سے فلوس ان کے نزدیک اموال ربویہ میں نہیں۔ اسی وجہ سے سامان تجارت کی طرح  
ان کی قیمت پر زکاۃ ہوگی نہ کہ عین پر، اور اگر تجارت کے لئے نہ ہوں تو ان پر زکاۃ نہیں (دیکھئے:  
مرجع سابق)۔

مذہب شافعی:

صحیح قول کے مطابق شوافع کے یہاں فلوس میں مطلقاً رہا نہیں ہے چاہے رائج ہوں یا

نہ ہوں، امام شافعی فرماتے ہیں: ”لا باس فی السلف بالفلوس الی اجل؛ لأن ذلک لیس مما فیہ ربا“ (۶۱)۔

مذہب حنبلی:

فلوس کے سلسلہ میں حنابلہ کے یہاں دو موقف ہیں:

پہلا موقف: یہ ہے کہ وہ اموال ربا میں سے نہیں ہیں چاہے رائج ہوں یا نہ ہوں اس

لئے کہ وہ نہ مکیلات میں سے ہیں اور نہ ہی موزونات میں سے۔

دوسرا موقف: یہ ہے کہ ان میں بھی ربا پایا جاتا ہے اس لئے ایک فلس دو فلس کے عوض

نہیں بیچا جاسکتا۔ (۶۲)

۵۔ موجودہ زیر بحث کاغذی کرنسی (العملۃ الورقیۃ Paper Money) اور فقہاء کرام:

جیسا کہ شروع ہی میں ہم کاغذی کرنسی کی حقیقت و امتداد پر روشنی ڈال چکے کہ اب یہ محض اصطلاحی کرنسی ہے جس کی اسی قانونی قیمت کا دراصل اس کی حقیقی مادی سونے چاندی کی قیمت سے کوئی تعلق ہی نہیں، اسی لئے معاصر فقہاء کرام اس کرنسی کی تخریج کئی چیزوں پر کرتے ہیں جنہیں ہم مندرجہ ذیل سطور میں پیش کرتے ہیں:

تخریج اول: یہ کاغذی کرنسی قرض کی معتمد تحریری تصدیق ہے۔ (سندات دین): اس کا مطلب ہے کہ اس کے حامل کو اس کی حقیقی سونے چاندی کی شکل میں قیمت اس کے طلب کرنے پر ادا کی جائے گی، جیسا کہ پہلے تھا، اس صورت میں یہ بذات خود کوئی مال نہیں، بلکہ یہ صرف رسید کے مانند ہیں، انہیں دکھا کر اس کی حقیقی قیمت کا مال حاصل کیا جاسکتا ہے، اس اعتبار سے یہ حوالہ کے حکم میں ہوگا اور اس پر حوالہ کے سارے احکام جاری ہوں گے (۶۳)۔

اس کی نظیر سنتجہ ہے جس کی صورت یہ ہوتی تھی: ”ان یدفع الی تاجر مالا قراضا

إلى صديقه، وإنما يدفعه قرضا لا أمانة ليستفيد به سقوط خطر الطريق، فكأنه  
أحال الخطر المتوقع على المستقرض، فكان في معنى الحوالة وقيل في  
صورتها أيضا هي كتاب صاحب المال لو كيله أن يدفع مالا قرضا يأمن به من  
خطر الطريق“ (۶۳)۔

اس کاغذی کرنسی کو قرض کی تصدیق ماننے سے بہت سے آثار مرتب ہوں گے جن میں  
سے چند یہ ہیں:

(۱) سونے چاندی کی خرید و فروخت ناجائز ہوگی چونکہ دین ہے جس سے مجلس میں  
قبضہ کی شرط نہیں پائی جائے گی۔

(۲) زکاۃ میں اس کو دینا اس وقت تک درست نہ ہوگا جب تک کہ مستحق اس کی حقیقی  
قیمت حاصل کر کے اس پر قابض نہ ہو جائے۔

(۳) یہ بیع سلم میں راس المال نہیں بن سکتے؛ چونکہ اس سے بیع الکالی بالکالی لازم  
آئے گی جو جائز نہیں۔

(۴) کسی اموال کی کمپنی میں راس المال نہیں ہو سکتے چونکہ اس کا عین ہونا ضروری ہے  
اور یہاں وہ مفقود ہے۔

(۵) اس کی زکاۃ دین کی زکاۃ کے حکم میں ہوگی۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے: مجلہ  
الشریعہ ۱۱/۳۱ وما بعدھا)۔

لیکن کرنسی نوٹوں کو وثیقہ دین قرار نہیں دیا جاسکتا جسے عام طور سے قدیم فقہاء ذکر  
کرتے ہیں بلکہ وہ تو ایسی کرنسی کا نام ہے جس کے ذریعہ تمام چیزوں کا تبادلہ کسی سے کسی وقت بھی  
ہو سکتا ہے چنانچہ وہ وثیقہ دین نہیں ہو سکتا بلکہ نقدین ہی کی طرح اثمان ہیں جیسا کہ شیخ محمد حسنین  
مخلف فرماتے ہیں: ”فإن حالة الدين المضمون بهذه الأوراق لا تتفق تماما مع



الاعتبارات الفقہیة التي تراعى في باب الدين، لأن الدين ليس في ذمة معينة حقيقية، ولا روعي في تحرير سنده أن يكون لشخص معين، ولكن مسألة الزكوة شيئاً وتحرير سند الدين وتقريره في ذمة معينة شيئاً آخر، ولا نزاع في أن صاحب الورقة مالك لنصاب حال عليه حول يمكنه أن يقبضه نقداً ذهباً أو فضة في أي وقت شاء، ومن أي شخص كان، وأن يستبدل به مقوماً، أو يهبه، أو يتصدق به على شخص آخر بواسطة هذه الورقة التي يعتبر وصولها إلى يد أخرى حوالة على المصرف الذي أصدرها أصالة، بحيث إذا قدمت إليه أو إلى من أنابه عنه لزمه قبولها، و دفع قيمتها كمبادلة النقدين سواء“ (۶۵)۔

دوسرے اعتبار سے دین کا تحریری تصدیق نامہ صرف وثیقہ کی حیثیت رکھتا ہے جب کہ کاغذ کے نوٹ کرنسی ہیں جو اصطلاحی طور پر اٹمان ہیں، اسی طرح دین نامی نہیں جب کہ کاغذی کرنسی نامی و رائج ہوتی ہے۔ ان سب وجوہات کی بنیاد پر کاغذی نوٹوں کی کرنسی کو وثیقہ دین قرار نہیں دیا جاسکتا۔ یہی فیصلہ مختلف فقہی اکیڈمیاں بھی کر چکی ہیں، مثال کے طور پر اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا (۶۶)۔

تخریج دوم: یہ فلوس کی نظیر ہیں جس کی تفصیل گذر چکی ہے، اسی پر بہت سے معاصرین فقہاء و علماء نے تخریج کی ہے جس کی وجہ سے اس کے حکم میں بھی وہی اختلاف رونما ہوا جو فلوس کے حکم میں گذر چکا ہے، چونکہ یہ فلوس کا حکم علت ربا کے تعین پر مبنی تھا۔ چنانچہ نوٹوں کی کرنسی کو فلوس پر قیاس کرتے ہوئے فقہ حنفی کی نمائندگی کرتے ہوئے مفتی زید صاحب نے کہا ”غور کرنے سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ فلوس و کرنسی گونفقود کی طرح ثمن اور ان کے قائم مقام ہیں لیکن من کل الوجوہ نہیں بلکہ من بعض الوجوہ اسی لئے ان کی بیع، بیع صرف نہیں کہلاتی اور یہ دونوں ہی امر فقہاء سے ثابت ہیں: ”لأن الفلوس الرائجة ثمن كالنقود وبيع الفلوس

بالدراہم لیس بصر ف“ (مبسوط ۱۳/۲۳)، خلاصہ کلام یہ کہ مختلف کرنسیوں میں علت قدریہ من وجہ موجود من وجہ مفقود ہے، لہذا دونوں جہت کے لحاظ سے ایک جانب میں نقد ہونا شرط اور دوسری جانب میں ہونا شرط نہیں البتہ جانبین میں ادھار ہو تو ناجائز ہے، اور ایک ملک کی کرنسیوں میں اس ایک جہت کا لحاظ کر کے تقاضل اس واسطے جائز نہیں کہ ایک ہی ملک کی کرنسیاں باہم امثال مساویہ ہیں برخلاف مختلف ممالک کی کرنسیوں کے کہ وہ امثال مساویہ نہیں بلکہ متفاوتہ ہیں لہذا ایک ہی ملک کی کرنسی جو مختلف الاجناس ہو مثلاً ایک طرف گلت کے دو روپے دوسری طرف کاغذ کا ایک نوٹ جو مختلف الاجناس ہیں پھر بھی ان میں تقاضل جائز نہ ہوگا؛ کیوں کہ یہ امثال مساویہ ہیں۔ اس کے برخلاف دوسرے ممالک کی کرنسیاں جو بظاہر صورتاً متحد الجنس ہوں لیکن امثال متفاوتہ ہونے کی وجہ سے باہم تقاضل جائز ہوگا“ (مجلد فقہ اسلامی ص ۵۵-۵۸، مقالات سیمینار ۹-۱۱ اگست ۱۹۹۱ء)۔

جیسا کہ معلوم ہے کہ علت ربا کی بنیاد پر ہی فلوس کے حکم میں اختلاف پیدا ہوا ہے، اور بقول مولانا عتیق صاحب ”فقہاء اربعہ سے منقول و مصرح علت ربا کی روشنی میں جب کاغذی نوٹوں کا جائزہ لیتے ہیں تو واضح ہوتا ہے کہ یہاں کسی کی بیان کردہ علت ربا موجود نہیں ہے... ائمہ اربعہ کے نزدیک ربا کی جو علت ہے اس کی روشنی میں میرے خیال میں کرنسی نوٹ اموال ربویہ کے دائرہ میں نہیں آتے۔۔۔ فقہ حنفی کے اصول ربا کے اعتبار سے ایک ملک کی کرنسی کا تبادلہ اسی ملک کی کرنسی کے ساتھ کمی بیشی کے ساتھ جب کی عوضین افراد متعین جائز ہونا چاہئے بشرط یہ کہ یہ معاملہ نقد ہو ادھار نہ ہو... دو ملک کی کرنسیاں دو جنس ہیں لہذا جنسیت کا وصف مفقود ہوا اور قدریت کا نہ ہونا تو ظاہر ہے، اور دونوں اوصاف کے معدوم ہونے کی صورت میں تقاضل اور نساء دونوں جائز ہوتا ہے ہاں اس بات کا خیال ضروری ہے کہ عوضین میں سے دونوں ادھار نہ ہوں بلکہ کم از کم ایک نقد ضرور ہوتا کہ ”بیع الکالی بالکالی“ لازم نہ آئے“ (مرجع سابق) جو حرام ہے۔

لیکن علت ربا کی علت مطلق ثمنیت متعدیہ کے نمائندے اگرچہ قدیم زمانہ میں کم تھے لیکن عصر حاضر کی کرنسی کی صورت حال اور منتشر ربا کے مختلف رائج طریقوں کی روشنی میں اکثر مجامع فقہیہ اور معاصر علماء نے اسی رائے کو علت ربا تسلیم کر کے نوٹوں کی کرنسی پر شرعی حکم صادر کیا ہے، اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا نے دوسرے سمینار منعقدہ ۸ تا ۱۱ دسمبر ۱۹۸۹ء میں کرنسی نوٹ سے متعلق یہ فیصلہ کیا کہ: ”عصر حاضر میں نوٹوں نے ذریعہ تبادلہ ہونے میں مکمل طور پر زر خلقی (سونا چاندی) کی جگہ لے لی ہے اور باہمی لین دین نوٹوں کے ذریعہ انجام پاتا ہے اس لئے کرنسی نوٹ بھی احکام میں ثمن حقیقی کے مشابہ ہیں۔ لہذا ایک ملک کی کرنسی کا تبادلہ اسی ملک کی کرنسی سے کمی بیشی کے ساتھ نہ تو نقد جائز ہے نہ ادھار“۔ اسی میں تیسری دفعہ تھی کہ: ”دو ملکوں کی کرنسیاں دو اجناس ہیں اس لئے ایک ملک کی کرنسی کا تبادلہ دوسرے ملک کی کرنسی سے کمی بیشی کے ساتھ حسب رضائے فریقین جائز ہے“ (نئے مسائل اور فقہ اکیڈمی کے فیصلے ص ۱۲۲)۔ اور رابطہ عالم اسلامی کے مجمع الفقہی نے ۸ تا ۱۶ ربیع الآخر ۱۴۰۲ھ مکہ مکرمہ میں منعقدہ سمینار میں بھی یہی فیصلہ کیا ہے (دیکھئے: روداد سمینار)۔ یہی رائے ڈاکٹر جاشم کی بھی ہے (دیکھئے: مجلۃ الشریعہ، ۳۱۷)۔

تخریج سوم: یہ کاغذ و نوٹ کی نظیر ہیں۔ جنہیں بعض قرض کا وثیقہ تسلیم کرتے ہیں پھر اس پر وہ سارے احکام منطبق ہوتے ہیں جو تخریج اول میں گذرے، اور بعض علماء انہیں عروض تجارت کی نظیر مانتے ہیں (۶۷)۔

## ۶- رائے رائج اور نتائج بحث:

سابقہ تفصیل سے یہ بات واضح ہے کہ موجودہ حالات میں علت ربا: مطلق ثمنیت قرار دینا زیادہ قابل عمل اور مقاصد شریعت سے زیادہ قریب تر ہے ورنہ ربا کا دروازہ کھل جائے گا اور فقراء و مساکین اور ضرورت مندوں کا حق ضائع ہوگا۔ اسی وجہ سے اکثر فقہی مجامع نے اسی رائے کو اختیار کیا ہے، کاغذی کرنسی کو موجودہ عالمی قانونی کرنسی ہونے کے ساتھ ذریعہ تبادلہ کی

عمومی مقبولیت کی وجہ سے اسے وثیقہ دین قرار نہیں دیا جاسکتا، اسی طرح سے وہ ہر طرح کے معاملات میں مستعمل ہونے کی وجہ سے ثمنیت میں فلوس سے زیادہ قوی ہے اگرچہ فلوس اپنی اصلی دھات کی قیمت میں اس سے زیادہ قیمتی ہوتا تھا چونکہ اگر اس کاغذی کرنسی کی عرفی اصطلاحی قانونی قیمت ختم ہو جائے تو صرف کاغذ کی کیا قیمت و اعتبار ذاتی ہے؟ لیکن قانونی عرفی حیثیت کی وجہ سے وہ دراہم و دنانیر سے ثمنیت کی علت میں مشترک ہے جب کہ سونے چاندی نقد ہونے میں اصلی و خلقی قیمت کے حامل ہیں اور کاغذی کرنسی کا ان سے کوئی مقابلہ نہیں، اگر ان کا اعتبار ختم ہو جائے تو اشتراک علت بھی ختم ہو جائے گا، اس کے ختم ہونے سے حکم بھی بدل جائے گا، اور جیسا کہ شروع میں ہم بتا چکے ہیں کہ اس کاغذی کرنسی کا شروع میں تو اس کی اصل سونے یا چاندی سے تعلق تھا لیکن آہستہ آہستہ اس کاغذ کا اب سونے یا چاندی سے کوئی ربط نہیں رہا، لہذا کاغذی نوٹ مستقل بالذات ایک الگ کرنسی ہے جو ذریعہ تبادلہ ہونے میں سونے چاندی کے دراہم و دنانیر کے قائم مقام ہے لیکن وہ ان کی جنس سے نہیں، اسی وجہ سے کرنسی کا اتار چڑھاؤ آئے دن کا مشغلہ ہو گیا ہے جس سے اصل رأس المال کی قیمت بھی خطرہ میں پڑ جاتی ہے، اور جب تک اسے سونے یا چاندی سے نہیں جوڑا جائے گا کرنسی کے اتار چڑھاؤ کا کھیل ختم نہ ہوگا جس کی وجہ سے عالمی معاشیات بھی خطرہ سے دوچار ہو جاتی ہیں، اس سلسلہ میں کچھ آوازیں اٹھ رہی ہیں لیکن اس وقت کے عالمی تناظر میں کافی دقت طلب امر ہے، فی الحال کاغذی کرنسی کو قانونی طور پر ثمن کی حیثیت حاصل ہے اور یہی رائے اس بحث سے بھی ثابت ہوتی ہے نیز اسی پر بہت سے مجامع علمیہ و فقہیہ نے بھی قرارداد پاس کی ہیں۔

مذکورہ تفصیل کے نتیجے میں بحث مندرجہ ذیل نتائج پر پہنچی کہ:

۱۔ ان کاغذی نوٹوں کی زکاۃ فرض ہو جائے گی جب ان میں نقدین کی زکاۃ کی شرطیں

پائی جائیں۔

۲- ان کاغذی نوٹوں میں ربا و صرف کے احکام جاری ہوں گے۔

۳- ایک ملک کی کاغذی کرنسی ایک جنس شمار ہوگی۔

۴- ہر ملک کی کرنسی الگ جنس شمار ہوگی، اس طرح دو یا دو سے زیادہ ملکوں کی کاغذی

کرنسیاں مختلف جنسیں ہیں۔

موجودہ کرنسی کی شرعی حیثیت کے ضمن میں سوالنامہ کا جواب یہ ہے:

چونکہ یہ بات تو یقین کے درجہ میں امر واقع ہے کہ اس کاغذ کو وثیقہ ثمن ماننے کو نہ تو

کوئی بنک تیار ہے اور نہ ہی کوئی ملک، اور نہ ہی کوئی بینک اس کی اصل قیمت کی چاندی یا سونا

دینے کو تیار ہے، تو پھر اس کی حقیقی قدر کے لئے کوئی پیمانہ بھلا کیسے ممکن ہے، لہذا ماہرین

معاشیات کی طرف سے مقرر کردہ اندازہ پر مبنی اشاریہ بھی کرنسی کے اتار چڑھاؤ کی طرح غیر

مستقر ہوگا اس لئے اسے معیار قرار نہیں دیا جاسکتا؛ جب کہ سونے اور چاندی کی قیمتوں میں ایک

حد تک استحکام ہوتا ہے اس لئے طویل الامد یا مؤخر مطالبوں مثلاً قرض، مہر، پیشن، ادھار خریداری

کی رقم اور وقت پر ادا نہ ہونے والی تنخواہوں کی ادائیگی سونے یا چاندی کی قیمتوں کے ذریعہ عمل میں

لائی جائیں تو اصل راس المال کی حفاظت ممکن ہے، لہذا نوٹوں کی شکل میں قرض دیتے وقت یا مہر

کے تقرر کے وقت یا ادھار فروختگی کے وقت طرفین واجب الادا نوٹ کی مالیت سونے یا چاندی

میں طے کر لیں اور بوقت ادائیگی اسی قدر سونے یا چاندی کی قیمت کے مساوی نوٹوں کی ادائیگی

عمل میں آئے تو جائز ہوگا۔

جب کہ اس طرح کے تعاملات میں کرنسی کو قیمتوں کے اشاریہ سے وابستہ کرنا عدم

انضباط، اور عوام کے درمیان باہمی مستقل تنازعہ کا موجب ہوگا، نیز اس طرح سو روپے کے

بدلے پانچ سو روپے کی ادائیگی باب ربا کو کھولنے کا ذریعہ بنے گی۔ واللہ اعلم بالصواب

## ۷۔ حواشی و مراجع:

- (۱) مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: Davies, Glyn (1996), "A history of money from ancient times to the present day", University of Wales Press, U.K., (PP. 1-50.)
- (۲) ملاحظہ ہو: النقود الالکترونیة، ماہیتہا، متخاظرہا وتنظیمہا القانونی للدکتور محمد ابراہیم محمود الشافعی، مجلۃ الامن والقانون، دبی، السنۃ الثانیۃ عشر، العدد الاول، یناریہ ۲۰۰۲م۔
- (۳) لسان العرب والقاموس المحیط مادة: نقد۔
- (۴) معنی المحتاج ۳۸۹/۱۔
- (۵) الموجز فی النقود والبنوک للدکتور أحمد عبده محمود، دار المعارف مصر ۱۹۶۸، ص: ۱۸، والنظرية النقدية للدکتور حازم البیلاوی، ص: ۱۱ مطبوعات جامعة الكويت ۱۹۷۱، وأصول الاقتصاد للدکتور أحمد أبو اسماعیل، ص ۳۸۹، دار التالیف مصر ۱۹۶۶۔
- (۶) الموجز فی النقود والبنوک للدکتور أحمد عبده محمود، دار المعارف مصر ۱۹۶۸۔
- (۷) تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: (الموجز فی النقود والبنوک للدکتور أحمد عبده، ص: ۸ وما بعدها، والنظرية النقدية للدکتور حازم البیلاوی، ص: ۳۸ وما بعدها، وأصول الاقتصاد للدکتور أحمد أبو اسماعیل ۳۹۳ وما بعدها)۔
- (۸) العملة وأحكامها فی الفقه الاسلامی للدکتور عجلیل جاشم الشمی، مجلۃ الشریعة، ص: ۲۷۰۔
- (۹) فتوح الیلدازان للامام أبی الحسن البلاذری، ص: ۳۵۲-۳۵۳، طبع دار الکتب العلمیة، بیروت، ۱۳۹۸ھ-۱۹۷۸ء۔ مزید تفصیل کے لئے دیکھیں: (الأحكام السلطانية للماوردي، ص: ۱۳۸، عیسیٰ الحلی مصر الطبعة الثانیة، ۱۳۹۶ھ-۱۹۶۶ء، ومعالم السنن لأبى سليمان الخطابي، تحقیق: محمد الفتی ۵/۳۳، طبع دار المعرفۃ، بیروت ۱۴۰۰ھ-۱۹۸۰ء)۔
- (۱۰) العملة وأحكامها فی الشریعة الإسلامیة، للدکتور عجلیل جاشم، مجلۃ الشریعة

کویت، عدد ۱۱، ۱۹۸۸ء۔

- (۱۱) سنن أبی داؤد [مع شرحه عون المعبود] ۶/۲۲۴، رقم الحدیث: ۳۳۳۸، واللفظ له، کتاب البیوع، باب قول النبی ﷺ: المکیال...، و سنن النسائی برقم: ۲۵۱۹ و ۴۶۰۸۔
- (۱۲) الاحکام السلطانیة للماوردی اردو، ص: ۳۳۵، ۳۳۷۔
- (۱۳) الاحکام السلطانیة للماوردی، اردو ترجمہ، ص: ۳۳۸۔
- (۱۴) عون المعبود شرح سنن أبی داؤد ۶/۲۲۵ والحاوی للفتاوی للعلامة جلال الدین السیوطی ۱/۱۰۲، دار الفکر بیروت، وفتح الربانی لترتیب مسند الامام أحمد بن حنبل للشیخ عبدالرحمن البنا ۱/۲۳۶، الطبعة الأولى ۱۳۵۶ھ، و المجموع شرح المهدب لأبی زکریا النووی ۶/۱۹۔
- (۱۵) المصباح المنیر للعلامة الفیومی۔
- (۱۶) التمهید لابن عبدالبر۔
- (۱۷) فتوح البلدان للبلاذری، ص: ۲۵۳۔
- (۱۸) الأموال لأبی عبید، ص: ۵۲۰۔
- (۱۹) العملة وأحكامها فی الفقه الاسلامی للدكتور عجلیل جاشم النشمی، مجلة الشریعة، ص: ۲۷۳۔
- (۲۰) الاحکام السلطانیة للماوردی ۱/۱۰۲۔
- (۲۱) الاحکام السلطانیة للعلامة ابی الحسن الماوردی، ترجمہ: مفتی انتظام اللہ شہابی۔ قرآن محل کراچی، ص: ۳۳۶، امام بلاذری نے بھی درہم کے اس اختلاف کو ذکر کیا ہے، دیکھئے: فتوح البلدان ۳۵۱۔
- (۲۲) الأموال لأبی عبید، ص: ۵۲۰۔
- (۲۳) کتاب الاموال ۲/۲۸۷-۲۸۹ الامام ابو عبید القاسم بن سلام، ترجمہ: عبدالرحمن طاہر سورتی، ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد، طباعت کی تاریخ کتاب میں موجود نہیں۔
- (۲۴) مقدمة ابن خلدون بتحقیق الدكتور علی عبدالواحد ۲/۱۱، مطبعة لجمہ البیان مصر، الطبعة الثانية ۱۳۸۴ھ۔

(۲۵) دیکھئے: الخراج والنظم المالية للدولة الاسلامية للدكتور محمد ضياء الدين الريس ص: ۳۳۰ وما

بعدها، الطبعة الثالثة ۱۹۶۹ء مصر، فقہ الزکاة للدكتور يوسف القرضاوی ۱/۲۵۹، الطبعة الثالثة

۱۹۷۷ء، النظم الاسلامية للدكتور صبحي الصالح ص: ۴۲۷، دار العلم للملايين بيروت ۱۹۸۰ء۔

(۲۶) دیکھئے: زکاة النقود الورقية المعاصرة للدكتور محمود الخالدي، ص: ۱۵۱، مكتبة الرسالة، ۱۹۸۵ء،

ڈاکٹر يوسف القرضاوی نے ان کی آراء کا مناقشہ و مواخذہ کیا ہے، دیکھئے: فقہ الزکاة ۱/۲۵۷۔

(۲۷) الاموال اردو، ۱۵۹/۲۔ دینار و درہم کی زکاة کے نصاب کے سلسلے میں کتب فقہ میں مفصل

بحث ہے دیکھئے: الحکلی للامام ابن حزم الظاہری ۶/۶۹ طبع المنیریہ، نیل الاوطار للامام محمد بن

علی الشوکانی ۳/۱۵۶ طبع مصطفیٰ البابی الحکمی، فقہ الزکاة للدكتور يوسف القرضاوی ۱/۲۳۶۔

(۲۸) الاموال اردو، ۱۶۹/۲-۱۷۲۔

(۲۹) لسان العرب مادة ربو۔

(۳۰) ابن عابدین ۳/۱۷۶۔

(۳۱) معنی المحتاج ۲/۲۱۔

(۳۲) البقرة: ۲۷۵۔

(۳۳) صحیح مسلم۔

(۳۴) مرجع سابق۔

(۳۵) مرجع سابق۔

(۳۶) أخرجه البيهقي۔

(۳۷) دیکھئے: الأحكام ۸/۳۶۷۔

(۳۸) چوتھی رائے میں سونا و چاندی غیر معطل ہیں جب کہ پانچویں رائے میں علت ربا مالیت

ہے: بدائع الصنائع للامام علاء الدین بن مسعود الکاسانی، ۷/۳۱۰۶، الطبعة الاولى ۱۹۱۰ء

مطبعة الجمالية مصر. الاختيار لتعليل المختار لأبي عبد الله الموصلي، ۲/۳۰، الطبعة الثالثة ۱۹۷۵ء

مصر. المغني لابن قدامة المقدسي ۳/۱۲۸ و فتاوى شيخ الاسلام أحمد بن تيمية ۲۹/۷۰، الطبعة



الاولیٰ ۱۳۸۳ھ بمطابق الریاض، المجموع ۲۳۶/۹۔

(۳۹) بدائع الصنائع ۳۱۰۶/۷۔

(۴۰) المغنی ۲/۲ مطابیح جبل العرب ۱۹۶۹ء، جبکہ ان کے نزدیک حونا چاندی کے علاوہ دوسری اہتمام میں علت ربامکلیات جنس ہیں (ابن عابدین ۲/۶۷۱ء، المغنی ۲/۳-۸)۔

(۴۱) الخری علی خلیل بحاشیۃ العدوی ۵۶/۵۔

(۴۲) فتاویٰ ابن تیمیہ ۲۹/۲۷۱۔

(۴۳) المجموع ۲۳۳/۹ و ۲۳۶/۹۔

(۴۴) الوجیز للامام ابی حامد الغزالی ۱۳۶/۱، مطبوعۃ الآداب مصر ۱۳۱۷ھ۔

(۴۵) بدایۃ المجتہد ونہایۃ المقتصد للامام أحمد بن رشد ۲/۱۲۸، مکتبۃ الکلیات الأزہریۃ مصر ۱۹۶۶ء۔

(۴۶) المغنی ۳/۵۔ اس رائے کی حجیت پر امام ابن قیم نے مفصل بحث کی ہے، دیکھئے: اعلام الموقعین ۲/۱۳۷، الطبعة الثانية ۱۹۵۵ء، مطبوعۃ السعادة مصر۔

(۴۷) مجلۃ الشریعۃ ص: ۲۸۸۔

(۴۸) المدونۃ الکبریٰ للامام مالک بن انس، المجلد الثالث ۳۹۶/۸ مطبوعۃ السعادة مصر، ۱۳۲۳ھ۔

(۴۹) لسان العرب ۱۵۸/۷، دار الحدیث، القاہرۃ، ۲۰۰۳ء۔

(۵۰) تفصیل کے لئے دیکھئے: المعجم الاقتصادی للدكتور أحمد الشرباصی ۳۳۳/۳، دار الجیل بیروت ۱۹۸۱ء، والموسوعة العربیۃ المیسرہ لطلاب شفیق غربال ۲/۱۳۰۹، طبعة بیروت ۱۹۶۵ء۔

(۵۱) دیکھئے: حاشیۃ الدسوقی علی الشرح الکبیر للامام محمد عرفۃ الدسوقی ۳/۲۵، دار احیاء الکتب العربیۃ، مصر۔

(۵۲) الحاوی للفتاویٰ ۱۰۴/۱۔

(۵۳) مسند أحمد، ۱۵/۵۱۰، رقم: ۲۱۲۸، وقال محققه: اسنادہ صحیح۔ دار الحدیث، القاہرۃ مصر، الطبعة

الاولیٰ ۱۹۹۵ء۔

(۵۴) مجلہ الشریعہ ۲۹۱ بحوالہ: نہایت المحتاج الی شرح المنہاج للامام محمد بن ابی العباس الرطبی ۳/۳۹۷، المکتبۃ الاسلامیہ۔

(۵۵) رد المختار علی الدر المختار للعلامة محمد امین المعروف بابن عابدین ۳/۱۸۲، طبع الامیریہ مصر ۱۳۲۳ھ۔

(۵۶) شرح فتح القدر لابن ہمام ۳/۱۸۲ و ۵/۳۸۲، الطبعة الامیریہ مصر ۱۳۱۶ھ۔ ودرر الحکام فی شرح غرر الأ حکام للعلامة ملا خسر ووبہامشہ حاشیۃ العلامة الشرنبلالی ۲/۵ فی کلامہ علی ماغلب فیہ الغش، وحاشیۃ ابن عابدین ۳/۲۵، والاختیار ۲/۲۱۔

(۵۷) البدائع ۷/۳۱۱۰، وشرح القدر ۵/۳۸۲۔

(۵۸) المبسوط للسرخسی ۱۳/۲۴۔

(۵۹) المبسوط للسرخسی ۱۳/۲۴، حاشیۃ ابن عابدین ۳/۲۵۔

(۶۰) شرح فتح القدر ۵/۳۸۲، ودرر الحکام ۲/۲۰۶۔

(۶۱) الام للامام ابی عبداللہ محمد بن ادریس الشافعی المجلد الاول ۳/۲۸ (شواہد کے مراجع اس بات

سے پُر ہیں کہ فلوس سامان تجارت کے قبیل سے ہیں جن میں ربا نہیں پایا جاتا چنانچہ فلوس کو ایک

دوسرے کے ساتھ کمی زیادتی سے نیز ادھار بھی بیچا جاسکتا ہے) تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: المحلی

علی منہاج الطالبین للنووی بحاشیۃ قلیوبی وعمیرة ۲/۱۷۰ و ۳/۵۱، طبع دار احیاء الکتب العربیہ

مصر، تحفۃ المحتاج بحاشیۃ الشردانی وابن القاسم ۳/۲۵۶، ونہایۃ المحتاج ۳/۳۹۷، والحاوی

للفتاویٰ للسیوطی ۱/۱۰۴، والمجموع ۹/۴۴۶، وروضۃ الطالبین ۱۲/۳۷۸۔

(۶۲) دیکھئے: منخ الشفاء، الشافیات فی شرح المفردات للعلامة منصور بن یونس البھوتی ۱۵۹-۱۶۰،

والمغنی مع الشرح الکبیر ۳/۱۲۸ ومابعدها۔

(۶۳) حوالہ کے مباحث دیکھئے: المہذب ۱/۳۳۷ و امہات کتب الفقہ۔

(۶۴) المغرب فی ترتیب المعرب لناصر الدین الطرزی، نشر دار الکتب العربیہ بیروت، والمصباح

المیر للرافعی، والتعریفات للجرجانی۔

(۶۵) رسالۃ التبیان فی زکاة الأثمان للشیخ محمد حسنین مخلوف ص: ۳۸، طبعة المعاهد مصر ۱۳۴۳ھ۔

(۶۶) نئے مسائل اور فقہ اکیڈمی کے فیصلے ص: ۱۲۲۔

(۶۷) تفصیل دیکھئے: العملة واحكامها فی الشریعة الاسلامیة للدکتور جاشم، ص: ۳۱۸ وما بعدها، نقلًا

من: القول الخ المصبوط فی جواز التعامل ووجوب الزکاة فیما یتعلق بورق النوط للشیخ السید ابی

بکر بن محمد شطاء، ص ۹، مطبعة الانصاف، والحلی علی المنہاج ۲/۲۸۔



# جدید فقہی تحقیقات

تیسرا باب

تفصیلی مقالات



## قرض، اجرت وغیرہ کو اشتاریہ سے مربوط کرنا۔ ایک شرعی جائزہ

مولانا مفتی اقبال محمد ٹنکاروی ☆

پچھلے دور میں سونا چاندی کے سکے رائج تھے، جنہیں درہم و دینار کہا جاتا تھا، لیکن مختلف تاریخی اسباب اور مرور زمانہ کی بنیاد پر سونا چاندی کے سکوں کا رواج اٹھتا گیا، اور ان کی جگہ کرنسی نوٹوں نے لے لی، اور ایک عرصہ تک اس کو وثیقہ محض اور رسید کی حیثیت سے جانا گیا، لیکن اب زندگی کے تمام کاروبار کرنسی نوٹوں سے ہی چلنے لگے، اس لئے اب اسے صرف وثیقہ محض کی حیثیت دینا مشکل ہو گیا، ہاں! اتنی بات مسلم ہے کہ نوٹ سونا چاندی کے مماثل نہیں، لیکن وہ شمن عرفی ہے اور سونا چاندی شمن خلقی ہے، کیوں کہ نوٹ کو شمنیت عرف عام کی وجہ سے حاصل ہوتی ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر عرف تبدیل ہو جائے یا حکومت اس کو منسوخ اور غیر معتبر قرار دے، تو اس کی حیثیت کاغذ کے پزروں سے زیادہ کی نہیں رہے گی، اس کے برخلاف درہم اور دینار کی شمنیت خلقی ہے، اس کی شمنیت عرف عام کے تابع نہیں ہے، اگر عرف عام میں اس کا رواج موقوف ہو جائے یا حکومت اس کو غیر معتبر قرار دے، تب بھی فی نفسہ اس کی شمنیت ختم نہیں ہوگی، کم از کم اس کی ذاتی قیمت ضرور رہ جائے گی۔

دوسری بات یہ ہے کہ درہم و دینار میں شمنیت کے ساتھ وزن بھی معتبر ہے، اور اسی وجہ سے ان کا باہم تبادلہ کی بیشی سے جائز نہیں ہے۔

☆ مہتمم دارالعلوم اسلامیہ عربیہ ماٹلی والا، بھروج، گجرات۔

علامہ شامی فتاویٰ شامی (۵/۷۷۱) میں تحریر فرماتے ہیں:

”فاستقرض مائة دينار من نوع فلا بد أن يوفى بدلها مائة من نوعها  
الموافق لها في الوزن أو يوفى بدلها وزناً لا عدداً“ (ایک آدمی نے ایک قسم کے سو  
دینار قرض لئے تو ضروری ہے کہ اسی قسم کے دینار اس کے بدلہ میں واپس کرے، جو وزن میں اس  
کے برابر ہوں، یا قرض کی ادائیگی وزن سے کرے، نہ کہ عدد سے)۔

امام شافعی کتاب الام (۳/۹۸) میں تحریر فرماتے ہیں:

”أرأيت الذهب والفضة مضروبين دنانير أو دراهم..... لا يحل  
الفضل في واحد منهما على صاحبه لا ذهب بدنانير ولا فضة بدراهم إلا مثلاً  
بمثل وزناً بوزن وما ضرب منهما وما لم يضرب سواء لا يختلف..... الربوا  
في مضروبه وغير مضروبه سواء“ (ڈھالے ہوئے سونا اور چاندی کے بارے میں آپ  
کی کیا رائے ہے؟ خواہ دینار ہوں یا درہم..... ان میں سے کسی میں بھی ایک دوسرے پر تقاضل  
جائز نہیں، نہ سونے کی بیع میں دینار کے بدلہ میں، اور نہ چاندی کے بیع میں درہم کے بدلہ میں،  
صرف برابر برابر بیع جائز ہوگی، اور یہ برابری وزن کے اعتبار سے ہوگی، ڈھالا ہوا سونا چاندی  
بغیر ڈھالے ہوئے سونا چاندی یعنی سکے اور غیر سکے دونوں ربا کے باب میں برابر ہیں..... دونوں  
میں ربا کا تحقق زیادتی و تقاضل کی صورت میں ہوگا)۔

اس عبارت میں امام شافعی نے وزن کا خاص اعتبار کیا ہے، اور غیر مضروب اور  
مضروب ہونے کی صورت میں کسی بھی فرق کے قائل نہیں ہوئے۔

ان دونوں عبارتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ سونا چاندی میں ثمنیت کے ساتھ وزن کا  
خاص لحاظ کیا گیا ہے، جب کہ نوٹ میں وزن کا لحاظ کوئی معنی نہیں رکھتا، وہاں صرف ثمنیت میں  
مساوات ضروری ہے، اگرچہ گنتی اور عدد کے اعتبار سے مساوات موجود نہ ہو۔

غرض سونا چاندی اور کرنسی نوٹ کے درمیان خلقتی اور عرفی ہونے کی حیثیت سے فرق ہے، اور یہاں فرق اس معنی میں ثابت کر رہے ہیں کہ سونا چاندی کی ثمنیت بدیہی ہے، جس پر علماء و فقہاء کا اتفاق ہے، اور نوٹ کی ثمنیت نظری ہے، جسے دلائل سے ثابت کرنا پڑ رہا ہے۔

بہر حال نوٹ کی شرعی حیثیت کے متعلق اس مقام پر طویل بحث کرنا منظور و مقصود نہیں ہے، کیوں کہ ۱۹۹۸ء میں منعقدہ سمینار میں اس موضوع پر علماء و مفتیان کرام کے مفصل مقالات اور ان کی تحقیقی آراء کی روشنی میں نوٹ کو ثمن عرفی کی حیثیت سے تسلیم کیا گیا ہے اور ایسا ہونا ہی امت کے حق میں تیسیر اور سہولت ہے، بہر حال اس تعیین کے بعد اس میں اہم ترین مسئلہ یہ ہے کہ دیون یعنی موخر مطالبے مثلاً قرض، پنشن، اور ادھار خریداری کی رقم وغیرہ کی ادائیگی کو قیمتوں کے اشاریہ سے وابستہ کرنا جائز ہوگا یا نہیں؟ اور کیا یہ اشاریہ ممکن بھی ہے یا نہیں؟ اور کیا فی دقین اصول پر قائم شدہ معیار باہمی تنازعہ کا موجب ہوگا اور اس طرح دئے گئے دس روپے کے عوض بیس سو روپے لینا دینا ربا اور سود نہیں سمجھا جائے گا؟

اس مسئلہ کے بارے میں یہ بات ضرور یاد رکھنی چاہئے کہ اسلامی شریعت کے مزاج میں بڑی سادگی ہے، ادھر ادھر کی موثر گافیوں اور پیچیدگیوں کو اسلام پسند نہیں کرتا، خصوصاً اس وقت جب کہ عوام الناس کے پریشان ہونے کا مسئلہ ہو اور کاروبار کے بگڑ جانے اور نیز تنازعات پیدا ہونے کا قوی اندیشہ ہو، اسی وجہ سے آپ ﷺ کا یہ فرمان ابوداؤد شریف ج: ۱، ص: ۱۳۷ میں موجود ہے:

”نحن أمة أمية لا نكتب ولا نحسب“ کہ ہم امی جماعت ہیں، حساب کتاب نہیں جانتے، مطلب یہ ہے کہ باریک حسابات اور فنی تدقیقات و تحقیقات جو عوام کے بس میں نہ ہوں اور ان کی دسترس سے باہر ہوں وہ مذہب اسلام کو پسند نہیں، کیونکہ اسلامی نظام حیات خواص و عوام سب کے لئے یکساں ہیں، اس لئے وہ نظام حیات میں ایسے اصول تیار کرتا ہے جس میں



سادگی بھی ہو اور عوام و خواص ہر طبقہ کے لئے یکساں دلچسپی کا حامل ہو۔

اس لئے ایسا نظام بنانا یا ایسے اصول بنانا جس سے مزاج شریعت پر زور پڑتی ہو، اور اس میں قانونی یا فنی پیچیدگی پیدا ہوتی ہو اس کی اسلام اجازت نہیں دے گا، قرضوں کو قیمتوں کے اشاریہ سے منسلک کرنے سے متعلق مسئلہ کا حل چند سوالات کے حل ہونے پر مبنی ہے۔

قیمتوں کے گھٹنے بڑھنے کا مطلب کیا ہے اور اس کے لئے معیار کیا ہے؟ قیمتوں کی کمی بیشی اضافی ہے یا حقیقی؟ روایات میں جو مثل ضروری قرار دیا گیا ہے، اس سے کیا مراد ہے؟ یہ برابری اور مثل مقدار میں ضروری ہے یا قیمت و مالیت میں ضروری ہے؟ اس مسئلہ کو ایک مثال سے حل کیجئے کہ آج سے پانچ سال قبل ایک مخصوص برانڈ کی گھڑی کی قیمت ۵۰۰ روپے تھی، جب کہ اس وقت اس کی قیمت ۸۰۰ روپے ہو گئی ہے، تو اب کیا کہا جائے گا، کہ گھڑی کی قیمت بڑھ گئی؟ یا روپیہ کی قیمت گھٹ گئی ہے یا پھر طرفین میں تبدیلی ہوئی؟

عام محاورات میں دونوں طرح کی باتیں کہی جاتی ہیں، کوئی کہتا ہے کہ گھڑی کی قیمت بڑھ گئی ہے، کوئی کہتا ہے کہ روپیہ کی قیمت گھٹ گئی ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ روپیہ تو شمن ہے، اس کی قیمت میں کیسے کمی بیشی ہوئی؟ وہ تو اپنے حال پر باقی ہے؟ البتہ سامان کی قیمت میں اضافہ ہوا ہے، اور سامان کی گرانی اور ارزانی کا تعلق طلب و رسد پر ہے، اگر طلب زیادہ ہے اور رسد کم ہے تو سامان کی قیمت بڑھ جائے گی، کبھی اقتصادی حالات کے پیش نظر حکومت وقت ٹیکس میں اضافہ کر دیتی ہے، اور تجارت ٹیکس والی رقم قیمت بڑھا کر حاصل کر لیتے ہیں، مطلب یہ کہ قیمتوں کے گھٹنے بڑھنے کا تعلق سامان سے ہے، نوٹ اور کرنسی سے نہیں ہے۔

معلوم ہوا کہ روپے کی قیمت کا بڑھنا گھٹنا ایک اضافی امر ہے، کوئی حقیقی امر نہیں ہے، یہ تو ہم محاورات میں کہتے ہیں، ورنہ حقیقت میں گرانی و ارزانی کا حقیقی تعلق اشیاء سے ہے، نہ کہ روپے سے، اس مقام پر اگر کوئی یوں کہے کہ نوٹ شمن خلقی نہیں عرفی ہے، اس لئے اس میں قیمت

کا اعتبار کر کے ایک سو روپے کے بدلہ پانچ سو روپے لے سکتے ہیں، تو یاد رہے کہ اس کی تردید اس جزئیہ سے ہو جاتی ہے، جو ابوداؤد شریف ج: ۲، ص: ۵۲۶ پر موجود روایت میں مذکور ہے:

عن عمرو بن شعيب عن أبيه عن جده قال كانت قيمة الدية على عهد رسول الله ﷺ، ثمان مائة دينار أو ثمانية آلاف درهم، فكان ذلك كذلك حتى استخلف عمر رضي الله عنه فقال خطيباً: ألا إن الإبل قد غلت قال: ففرضها عمر رضي الله عنه على أهل الذهب ألف دينار وعلى أهل الورق اثني عشر ألف درهم۔

(فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ کے زمانہ میں دیت کی قیمت آٹھ سو دینار یا آٹھ ہزار درہم تھی اور دیت کی یہ مقدار اسی طرح رہی یہاں تک کہ حضرت عمرؓ نے سونا والوں پر ایک ہزار دینار اور چاندی والوں پر بارہ ہزار درہم مقرر فرمائے۔)

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کے زمانہ ہی سے اونٹ کی قیمت بارہ ہزار درہم پہنچ گئی تھی اور آپ ﷺ نے بارہ ہزار درہم دیت کے لئے مقرر فرمائے۔ سنن نسائی حدیث نمبر: ۴۸۱۲، باب ذکر الدية من الورق میں ہے:

عن ابن عباس رضي الله عنه قال: "قتل رجل رجلاً على عهد رسول الله ﷺ فجعل النبي ﷺ ديته اثني عشر ألفاً۔"

اور دازی میں حدیث نمبر ۲۳۶۸/۴۵۳۶ میں ہے: "إن رسول الله ﷺ فرض على أهل الذهب ألف دينار" (قبیلہ بنو عدی کا ایک آدمی قتل کر دیا گیا تو نبی کریم ﷺ نے اس کی دیت بارہ ہزار درہم مقرر فرمائی اور سونا والوں پر ایک ہزار دینار مقرر فرمائی)۔

تو اب یہاں پر کیا کہا جائے گا؟ آیا اونٹ کی قیمت میں اضافہ ہو گیا تھا یا درہم و دینار کی

قیمت گھٹ گئی تھی؟ یا پھر اونٹ اپنے حال پر تھے اور درہم و دینار کی قیمت میں کمی واقع ہوئی تھی تو اس صورت میں کیا مسئلہ ہوگا؟ جب کہ ایک آدمی نے آٹھ ہزار درہم اس وقت قرض لیے تھے جب کہ اتنے میں سواونٹ خریدے جاسکتے تھے، اور اس وقت واپس کر رہا ہے جب کہ سواونٹ کی قیمت بارہ ہزار ہو چکی ہے، تو قرض کی ادائیگی میں قیمت کا اعتبار کر کے چار ہزار درہم کے اضافہ کے ساتھ بارہ ہزار درہم میں قرض کی ادائیگی درست ہوگی؟ اور کیا یہ مفہوم ربا میں داخل نہیں ہوا؟ اس صورت میں علماء متفقہ طور پر فرماتے ہیں کہ ایک درہم کی زیادتی بھی ربا اور سود میں داخل ہوگی، معلوم ہوا کہ ثمن کی قیمت میں کمی بیشی نہیں ہوئی، بلکہ چیزوں میں مہنگائی بڑھ جاتی ہے، اس لئے پہلے جس مقدار ثمن پر وہ چیز مل جایا کرتی تھی، اس مقدار سے بڑھا کر ادا کرنے پر اب وہ چیز مل سکتی ہے، لہذا یہ خیال اور نظریہ شرعی اور عقلی ہر اعتبار سے بالکل غلط ہے کہ ثمن کی قیمت میں کمی بیشی ہو سکتی ہے۔ یہاں یہ بات بھی مد نظر رکھنی چاہئے کہ سکہ وغیرہ میں کمی بیشی کا اختیار اگر کسی کو ہو سکتا ہے تو وہ حکومت وقت کے لئے ہے اور اولاً اس کا احساس اسی کو ہو سکتا ہے، لیکن حکومت نے کبھی ایسا قدم نہیں اٹھایا تو پھر بغیر کسی قرینہ و علامت کے یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ کرنسی نوٹ میں کمی بیشی واقع ہوتی ہے۔ نوٹ کے بارے میں حکومت کا سلوک مسلسل یہی رہا ہے کہ نوٹ کی قیمت یکساں رہتی ہے، مثلاً ہم ملک کے کسی بھی بینک میں چاہے روپے جمع کرائیں اور دس سال بعد جب ہم ان روپیوں کو اٹھاتے ہیں تو بینک اتنے ہی روپے واپس کرتی ہے جتنے ہم نے جمع کرائے ہیں اور جو کچھ زیادتی وہ دیتی ہے تو وہ سود ہے جو سود کے عنوان سے دیا جاتا ہے، معلوم ہوا کہ حکومت کے نزدیک بھی نوٹ، کرنسی کی قیمت میں کمی بیشی واقع نہیں ہوتی، خواہ اشیاء کی قیمت میں کتنا ہی اضافہ ہوتا چلا جائے نوٹ کی قیمت اتنی ہی رہتی ہے۔

ہمارا موضوع بحث مسئلہ قرضوں کو قیمتوں کے اشاریہ سے منسلک کرنا ہے تو منسلک کرنے کا مقصد کیا ہوتا ہے؟ اس پہلو کو متعین کرنے سے بات واضح بھی ہو جائے گی اور اس پر حکم

لگانا بھی آسان ہو جائے گا۔

قیمتوں کے اشاریہ (INDEX) میں اشیاء کی قیمتوں میں جس تناسب اور حساب سے اضافہ ہوا ہے اسی تناسب سے قرض دار قرض خواہ کو قرض واپس کرے گا، لئے ہوئے قرض کے برابر روپیہ واپس نہیں کرے گا۔ مثلاً اگر کسی شخص نے ۱۰۰ روپے قرض لئے ہے اور قیمتوں کے اشاریہ میں دس فیصد کے تناسب سے بڑھوتری ہوئی ہے تو واپسی کے وقت دس فیصد قرض میں اضافہ کر کے ایک سو دس روپے واپس کرے گا۔

قرض اور قیمتوں کے اشاریہ کے مابین ربط و تعلق کے جوڑ سے متعلق بعض ماہرین معاشیات یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ یہ جو زیادتی قرض دار واپس کر رہا ہے یہ حقیقی زیادتی نہیں بلکہ وہ اسی مالیت کو واپس رہا ہے جو قرض دار نے بطور قرض قرض خواہ کو دی تھی، اس لئے کہ سو روپے کی Value بوقت قرض زیادہ تھی اور بوقت ادا یگی قرض وہ کم ہو گئی ہے، تو اسے دس فیصد زیادہ دیکر برابر کر رہا ہے۔ اب اگر اس صورت میں وہ ۱۰۰ روپے ہی واپس کرتا ہے تو دائن پر زیادتی ہوگی کہ وہ اسے نوٹ واپس کر رہا ہے جس کی مالیت فی الحال اتنی نہیں رہی ہے جتنی کے قرض لیتے وقت تھی، اور دس فیصد زیادہ دینے میں اس کی پوری مالیت ادا کرنا ہوگا، لہذا یہ زیادتی باب ربایں داخل ہو کر حرام نہیں بن جاتی کیوں کہ یہ حقیقی زیادتی نہیں ہے۔

ماہرین کا اس زیادتی کو جائز قرار دینا از روئے شریعت و قواعد شریعت درست اور صحیح نہیں ہے۔ کیوں کہ قرض کی ادا یگی کے باب میں شریعت نے اسی قرض کے مقدار کی ”مثل“ ادا کرنا واجب اور ضروری قرار دیا ہے۔ اور یہ امر متفق علیہ ہے اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے حتیٰ کہ اشاریہ سے متعلق قرار دینے والا گروہ بھی ”مثل“ کا قائل ہے، تو اب ضروری ہے کہ مثل کی تعیین کی جائے کہ ”مثل“ سے کیا مراد ہے؟ آیا مقدار مراد ہے یا پھر مالیت؟ اور یہی اس مسئلہ میں بنیادی سوال ہے، چنانچہ کتاب و سنت میں تتبع اور لوگوں کے معاملات کا مشاہدہ اور معاینہ کرنے

کے بعد یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ مقدار اور کیفیت میں برابری واجب ہے مالیت اور قیمت میں نہیں۔

اس سلسلے میں چند دلائل حضرت مولانا مفتی تقی صاحب دامت برکاتہم نے اپنی تصنیف ”فقہی مقالات“ (۱/ ۵۳) میں نقل فرمائے ہیں جس کو یہاں تحریر کرتا ہوں:

”اگر ایک شخص دوسرے سے ایک کلو گندم بطور قرض لے اور قرض لیتے وقت ایک کلو گندم کی قیمت پانچ روپے تھی اور جب وہ قرض دار اپنا قرض واپس کرنے لگا تو اس وقت ایک کلو گندم کی قیمت دو روپے ہو گئی تھی تو اب بھی وہ ایک کلو گندم واپس کرے گا زیادہ نہیں کرے گا۔ باوجود یہ کہ ایک کلو گندم کی قیمت پانچ روپے سے کم ہو کر دو روپے ہو گئی ہے۔ اور اس مسئلہ میں تمام فقہاء متقدمین و متاخرین کا اجماع ہے، فقہاء میں سے کوئی بھی یہ نہیں کہتا ہے کہ اس صورت میں جب کہ گندم کی مالیت کم ہو گئی ہے صرف ایک کلو گندم واپس کرنا قرض خواہ پر ظلم ہے؛ اس لئے گندم کی قیمت میں جتنی کمی واقع ہوئی ہے اسی نسبت سے اضافہ کر کے قرض خواہ کو واپس کرے؛ یعنی ایک کلو گندم کے بجائے اب قرض دار ڈھائی کلو گندم واپس کرے؛ اس لئے کہ ڈھائی کلو گندم کی مالیت اب وہی ہے جو قرض لیتے وقت ایک کلو گندم کی تھی۔“

یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ قرض میں جس مثلثیت اور برابری کا اعتبار شریعت میں ضروری ہے وہ مقدار اور کیفیت میں برابری ہے، قیمت اور مالیت میں برابری معتبر نہیں۔

اس دلیل کا بعض حضرات یہ جواب دیتے ہیں کہ گندم تو سامان اور اشیاء کی قبیل سے ہے اور اس کی اپنی ذاتی مالیت اور حیثیت ہے، بخلاف ان کاغذی نوٹوں کے کہ ان کی ذاتی مالیت اور حیثیت کچھ بھی نہیں ہے اس لئے گندم کو نوٹوں پر قیاس کرنا درست نہیں۔

لیکن یہ جواب دراصل خلط مبحث پر مبنی ہے؛ اس لئے کہ یہاں پر اصل مسئلہ یہ ہے کہ قرض کی واپسی میں مثلثیت اور برابری کونسی معتبر ہے؟ جب دلیل سے یہ بات واضح ہو گئی کہ قرض

میں مثلثیت مطلوبہ مقدار اور قیمت کی مثلثیت ہے، قیمت اور مالیت میں مثلثیت کا اعتبار نہیں ہے، اس لئے اب یہاں گندم اور نوٹوں میں ماہیت اور اصلیت کے فرق سے حکم میں کوئی فرق نہیں پڑتا؛ اس لئے کہ گندم اور نوٹ دونوں میں مقدار بھی موجود ہے اور قیمت بھی، لہذا اگر گندم میں مثلثیت مطلوبہ مقدار اور قیمت ہوگی، اسی طرح اگر گندم میں قیمت اور مالیت کے فرق کا اعتبار نہیں بالکل اسی طرح نوٹ میں بھی قیمت اور مالیت کا فرق معتبر نہیں ہوگا۔

۲- تمام لوگوں کے نزدیک یہ بات مسلم ہے کہ قرضوں کی واپسی میں برابری کی شرط صرف سود سے بچنے کے لئے ہے اور حضور اقدس ﷺ نے اس مطلوبہ برابری کو رب الفاضل کی احادیث میں پوری تشریح کے ساتھ واضح فرمادیا ہے۔

جامع الاصول لابن الاثیر (۱/۴۵۳) میں یہ روایت مذکور ہے:

”أبو سعيد الخدری قال: كنا نرزق تمر الجمع على عهد رسول الله

ﷺ وهو الخلط من التمر فكنا نبيع صاعين بصاع فبلغ ذلك رسول الله

ﷺ فقال: لا صاعين تمرا بصاع ولا صاعين حنطة بصاع ولا درهما

بدرهمين“۔

(حضرت ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے کہ عہد رسول اللہ ﷺ میں ہمارے پاس ملی

جلی کھجوریں آیا کرتی تھیں، تو ہم دو صاع کھجور کو ایک صاع کھجور کے عوض بیچ دیتے تھے۔ جب

حضور ﷺ کو اس کی اطلاع ہوئی تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ دو صاع کھجور کو ایک صاع کھجور

کے بدلہ میں مت بیچو اور نہ ہی دو صاع گندم کو ایک صاع گندم کے بدلے میں بیچو، اور ایک درہم کو

دو درہم کے بدلے میں مت بیچو)۔

آپ ﷺ کو معلوم تھا کہ جو ایک صاع کھجور ہے وہ قیمتی ہے دو صاع کھجور کی نسبت،

اس کے باوجود آپ ﷺ اس پر راضی نہ ہوئے اور قیمت کا اعتبار کئے بغیر مقدار اور ناپ میں

مماثلت کا حکم فرمایا۔

جامع الاصول (۲۵۸/۱) پر روایت مذکور ہے: ”عن ابی سعید و ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہما أن رسول اللہ ﷺ استعمل رجلا علی خبیر، فجاءہم بتمر جنیب فقال: أکل تمر خبیر هكذا قال: إنا لناخذ الصاع بالصاعین، والصاعین بالثلاث قال: لا تفعل، بع الجمع بالدرہم ثم ابتع بالدرہم جنیبا وقال: فی المیزان مثل ذلك“۔

(حضرت ابو سعید خدریؓ اور حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے ایک آدمی کو خبیر کا عامل بنا کر بھیجا، وہ عامل جب واپس آئے تو آپ ﷺ کی خدمت میں جنیب کھجور پیش کی (یہ ایک عمدہ قسم کی کھجور ہے) تو آپ ﷺ نے یہ سوال کیا کہ کیا خبیر کی تمام کھجوریں اسی طرح کی ہوتی ہیں؟ انہوں نے جواب دیا کہ ہم ایک صاع (عمدہ کھجور) کو دو صاع (گھٹیا کھجور) کے عوض اور دو صاع کو تین صاع کھجور کے عوض میں تبدیل کر لیتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ایسا مت کرو، بلکہ ملی جلی کھجوروں کو پہلے درہم کے عوض میں فروخت کر دو پھر ان درہموں سے جنیب کھجور خرید لیا کرو)۔

اس روایت سے بھی صاف واضح ہو جاتا ہے کہ اموال ربویہ میں مطلوبہ تماثل اور برابری مقدار میں ہے قیمت اور مالیت میں نہیں ہے۔ اور مذکورہ روایت میں آپ ﷺ نے عمدہ اور گھٹیا ہونے کا بالکل اعتبار نہیں فرمایا بلکہ وزن میں تماثل کو ضروری بتلایا۔

اسی طرح آگے (۳۶۰/۱) حدیث نمبر ۳۶۰ میں ان الفاظ میں مروی ہے: ”عن ابی ہریرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ قال: قال رسول اللہ ﷺ: الذهب بالذهب وزنا بوزن مثلا بمثل، والفضة بالفضة وزنا بوزن مثلا بمثل فمن زاد أو استزاد فهو ربأ“۔

(حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا: سونا سونے کے بدلہ وزن کر کے بیچو برابر برابر، اور چاندی چاندی کے عوض برابر برابر بیچو، ان میں جو شخص زیادتی کرے یا زیادتی کا طلب گار ہو تو وہ زیادتی سو ہے۔)

آگے جامع الاصول (۴۲۶/۱) پر یہ حدیث ذکر کی گئی ہے: ”وفی رواية أبي داؤد أن رسول الله ﷺ قال: ”الذهب بالذهب بتبرها وعينها والفضة بالفضة بتبرها وعينها والبر بالبر بمدین بمدین والتمر بالتمر بمدین بمدین والملح بالملح بمدین بمدین فمن زاد أو ازداد فقد أربى“۔

(ابو داؤد کی روایت میں حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: سونے کو سونے کے بدلہ میں چاہے وہ سونے کا ٹکڑا ہو یا ڈھلا ہو یا سکہ ہو، چاندی کو چاندی کے بدلے میں چاہے وہ چاندی کا ٹکڑا ہو یا ڈھلا ہو یا سکہ ہو، اور دو مد گندم کے عوض میں اور دو مد چھوہاروں کے عوض میں اور دو مد نمک کو دو مد نمک کے عوض میں (برابر کر کے بیچو) جس نے زیادتی کی یا زیادتی طلب کی اس نے سو لیا۔)

جامع الاصول (۴۶۴/۱) پر حضرت فضالہ بن عبید رضی اللہ عنہ سے منقول ایک روایت میں آپ ﷺ کے یہ کلمات مروی ہیں: ”ثم قال لهم رسول الله ﷺ: الذهب بالذهب وزنا بوزن“ (پھر آپ ﷺ نے ان سے فرمایا سونے کو سونے کے بدلے میں وزن کر کے بیچو)۔

ان روایات کے بارے میں مفتی تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم تحریر فرماتے ہیں: ”مندرجہ بالا تمام احادیث اس بات کو واضح طور پر بیان کر رہی ہیں کہ شریعت میں جو مماثل اور برابری معتبر ہے وہ مقدار میں برابری ہے، اموال ربویہ میں قیمت کے تفاوت کا بالکل اعتبار نہیں ہے، یہ احکام اس صورت میں ہیں جب بیع نقد ہو رہی ہو، اور اگر معاملہ قرض کا ہو جس



میں اصل سود جاری ہوتا ہے جس میں ہر قسم کی زیادتی بلکہ زیادتی کے شبہ سے بھی بچنا ضروری ہے تو پھر اس میں قیمت کے تفاوت کا لحاظ کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اس مسئلہ میں ایک حدیث اور ہے جو خاص کر قرض ہی میں مثلیت اور زیادتی کو واضح

کرتی ہے:

سنن ابو داؤد: کتاب البیوع؛ رقم الحدیث: ۳۳۵۲ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے

روایت ہے، اور یہ روایت امام ترمذیؒ نے باب الصرف میں اور امام نسائیؒ نے باب بیع الفضة

بالذهب میں نقل فرمائی ہے: "عن ابن عمر رضی اللہ عنہما قال: كنت أبيع الإبل

بالبقيع فأبيع بالدنانير وأخذ الدراهم وأبيع بالدراهم وأخذ الدنانير، أخذ هذه من

هذه، وأعطى هذه من هذه فأتيت رسول الله ﷺ وهو في بيت حفصة فقلت: يا

رسول الله! رويدك، أسألك إني أبيع الإبل بالبقيع، فأبيع بالدنانير وأخذ الدراهم

وأبيع بالدراهم وأخذ الدنانير أخذ هذه من هذه وأعطى هذه من هذه فقال رسول

الله ﷺ: "لا بأس أن تأخذها بسعر يومها، ما لم تفترقا وبينكما شيء"۔

(حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا: میں مقام بقیع میں اونٹ بیچا کرتا تھا، تو

میں دینار کے عوض بھاؤ کر کے بیچتا تھا اور دراہم لے لیتا، اور کبھی دراہم کے عوض بیچتا تھا اور دنانیر

لے لیتا، اور میں دراہم کو دینار کے بدلے میں اور دینار کو دراہم کے بدلے میں وصول کرتا اور ادا

کرتے وقت بھی دراہم کے بدلے دینار اور دینار کے بدلے دراہم ادا کرتا، ایک بار میں نبی کریم

ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، اس وقت آپ ﷺ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہ کے گھر پر تھے،

میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ! ذرا ٹھہریے، میں آپ سے سوال کرنا چاہتا ہوں، وہ یہ ہے

کہ میں مقام بقیع میں اونٹ بیچتا ہوں، کبھی میں دینار کے عوض بھاؤ کر کے بیچتا ہوں اور دراہم

لے لیتا ہوں، اور کبھی دراہم کے عوض میں بیچتا ہوں اور دنانیر لے لیتا ہوں، یعنی میں دراہم کو دینار

کے بدلہ میں وصول کرتا ہوں، دینار کو درہم کے بدلہ میں وصول کرتا ہوں، اور ادا کرتے وقت بھی درہم کے بدلے دینار اور دینار کے بدلے درہم ادا کرتا ہوں، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اس طرح کرنے میں کوئی حرج نہیں مگر اس شرط کے ساتھ کہ اس روز کے بھاؤ کے برابر لو اور تمہارے درمیان اس حالت میں جدائیگی نہ ہو کہ تمہارے درمیان کوئی لین دین باقی رہے۔

اس روایت کا طریقہ استدلال حضرت مفتی تقی صاحب ”فقہی مقالات“ (۱/۵۷)

پر اس طرح تحریر فرماتے ہیں:

”حضور ﷺ نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے لئے اس چیز کو جائز اور مباح قرار دیا کہ جب بیع دینار کے ذریعہ ہو تو ادائیگی کے روز دینار کی جو قیمت ہو اس قیمت کے برابر درہم وصول کر لیں، جس روز ذمہ میں واجب ہوئے ہوں اس روز کی قیمت کا اعتبار نہیں، مثلاً بیع میں ایک دینار طے ہوا اور بیع کے روز ایک دینار کی قیمت دس درہم تھی اور اس وقت مشتری نے قیمت ادا نہیں کی، کچھ روز بعد جب مشتری نے قیمت ادا کرنا چاہا تو اس وقت اس کے پاس درہم تو تھے مگر دینار نہیں تھے اور اس روز ایک دینار کی قیمت گیارہ درہم ہو گئی تو اب مشتری بائع کو گیارہ درہم ہی ادا کرے گا۔“

اس سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ ادائیگی کے روز کی قیمت کا اعتبار ہوتا ہے، جس روز ذمہ میں واجب ہوئی تھی اس روز کی قیمت کا اعتبار نہیں ہوتا، اگر قرضوں میں قیمت کے اعتبار سے مثلیت معتبر ہوتی ہو تو قرض کی ادائیگی میں واجب ہونے کے روز کی قیمت کی ادائیگی ضروری ہونی چاہئے، حالانکہ آپ ﷺ نے ”بعسریومہا“ فرمایا جو صاف حکم ہے کہ ادائیگی کے روز کی قیمت کا اعتبار ہوگا۔

الفقہ اسلامی وادلتہ (۶/۲۳۳) پر ڈاکٹر وہبہ زحیلی تحریر فرماتے ہیں:

”والخلاصة أن تبادل الأموال الربوية يجب فيه التساوي في

الکمیات المبادلة فی الجنس الواحد“ (خلاصہ یہ ہے کہ اموال ربویہ کے تبادلہ میں ضروری ہے جنس واحد کے تبادلہ کے وقت کمیات (مقدار) میں مساوات کا پایا جانا)۔

مثلیت مقدار میں ضروری ہے اس بات کی وضاحت اس بات سے ہوتی ہے جس کو صاحب فتح القدر نے (۱۳۵/۷) پر تحریر فرمایا ہے، وہ فرماتے ہیں:

نعم حدیث الخدری فی البخاری عنہ صلی اللہ علیہ وسلم: لا تبیعوا الذهب بالذهب إلا مثلاً بمثل الخ..... وقوله وزنا بوزن بعد ذلك ولا تشفوا فی حدیث البخاری المذكور تفسیر لمثلاً بمثل، فإن المثلیة أعم ففسرها بانها من حیث المقدار۔

(حدیث بخاری میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان کہ سونا سونے کے عوض میں مت بیچو مگر برابر سرا برا الخ..... پھر اس کے بعد آپ کا وزنا بوزن اور اسی حدیث بخاری میں ولا تشفوا (زیادتی مت کرو) یہ مثلاً بمثل کی تفسیر ہے، اس لئے کہ مثلیت میں عموم ہے تو اس کی تفسیر فرمادی کہ وہ مقدار کے اعتبار سے ہے)۔

نیز فتح القدر (۱۳۲/۷) کے حاشیہ چلپی پر جو فرمایا گیا ہے اس سے بھی مثلیت سے مقدار کی مثلیت مراد ہے، یہ بات واضح طور پر معلوم ہوتی ہے، وہ تحریر فرماتے ہیں: ”الذهب بالذهب مثلاً بمثلاً“ الحدیث والمراد به المماثلة فی القدر لا فی الصفة لقوله صلی اللہ علیہ وسلم: ”جیدھا وردیھا سواء“ کہ حدیث میں مذکور مثلاً بمثل سے مراد مقدار میں مماثلت ہے نہ کہ صفت میں، کیوں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس کا عمدہ اور ردی دونوں برابر ہیں۔

الغرض ثمن کے باب میں ماضی کا کوئی ایک واقعہ بھی ایسا نہیں ملتا ہے کہ جس میں ادائیگی قرض کے باب میں وجوب کے وقت کی قیمت اور مالیت کا اعتبار کر کے قرض کی ادائیگی کو ضروری قرار دیا گیا ہو، نیز ثمن کی مالیت اور قیمت میں کمی بیشی کا تصور ہی غلط ہے اور جو کچھ کمی بیشی

ہوتی ہے وہ اشیاء کی قیمتوں میں کمی بیشی ہوتی ہے جس کے کئی اسباب ہو سکتے ہیں جیسا کہ رسد و طلب، قلت و کثرت، حکومتی ٹیکس وغیرہ۔

نوٹ کے بارے میں حکومت نے کبھی بھی ایسا رویہ اختیار نہیں کیا جس سے معلوم ہو کہ نوٹ کی قیمت میں کمی بیشی ہوتی ہے بلکہ اس کا سلوک تو اس قسم کا سمجھ میں آتا ہے کہ نوٹ کی قیمت یکساں رہتی ہے، مثلاً جیسا کہ پیچھے بتلایا کہ سرکاری وغیر سرکاری بینک میں جمع شدہ رقم واپس لیتے وقت اتنی ہی واپس کرتے ہیں جتنی کہ جمع کروائی تھی، کبھی حکومت نے یا حکومتی بینک نے یہ کہہ کر نوٹ میں اضافہ نہیں کیا کہ جمع کرتے وقت کی مالیت زیادہ تھی اور اس وقت کی مالیت نصف ہو گئی ہے لہذا (۱۰۰۰) کے بجائے (۲۰۰۰) کے نوٹ آپ کو واپس کئے جاتے ہیں، بلکہ اتنے ہی واپس کئے جاتے ہیں، اور زیادتی تو سود کے نام سے معینہ شرح سے ملتی ہے، یہ رویہ اس امر کی واضح دلیل ہے کہ حکومت کے نزدیک بھی نوٹ کی قیمت یکساں رہتی ہے، خواہ اشیاء کی قیمتوں میں کتنا ہی اضافہ ہو جاتا ہو۔

قرآن و سنت اور فقہی روایات سے یہ بات مسلمہ طور پر ثابت ہوتی ہے کہ قرض کی واپسی کے وقت مقدار میں مثلیت اور برابری شرط ہے، اٹکل اور اندازہ یعنی تخمینہ سے واپس کرنا جائز اور درست نہیں، بہت سی فقہی روایات اور جزئیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اٹکل و اندازہ صحیح بھی ہو تب بھی تخمینہ سے ایک صاع واپس کرنا بھی حلال اور جائز نہیں ہے اور اسی وجہ سے بیع مزابنہ حرام ہے۔

اب اگر قرضوں کو قیمتوں کے اشاریہ سے منسلک کرے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ادائیگی قرض میں مطلوبہ حقیقی مثلیت کا اعتبار نہیں کیا بلکہ ایک تخمینہ مثلیت پر بنیاد رکھی گئی، کیوں کہ قیمتوں میں کمی زیادتی کا حساب اور تناسب محض تقریبی اور تخمینہ ہوگا، اور اس کی اساس ایک مخصوص حسابی طریقہ پر ہوئی ہے۔

## کرنسی کی مثلثیت میں عرف کو فیصل بنانا:

اس مقام پر اس نظریہ اور تصور کو بھی زیر بحث لانا ہے کہ بعض ماہرین معاشیات قرضوں کے اشاریہ کے جواز میں یوں استدلال کرتے ہیں کہ مثلثیت کا اعتبار تو ہوتا ہے اور مثلثیت واجب اور ضروری بھی ہے، لیکن مثلثیت کا تعین عرف و عادت سے ہوگا؛ کیوں کہ فقہی قاعدہ ہے: "العادة محكمة" یعنی عادت شرعاً معتبر ہے، اسی طرح مادہ ۴۵ "التعین بالعرف كالتعین بالنص" کہ جو چیز عرف سے متعین ہوتی ہے وہ ایسی ہی ہے جیسا کہ وہ نص سے متعین ہوئی ہو، لہذا جس مثلثیت کا عرف میں اعتبار ہے اس مثلثیت کا شرعاً بھی اعتبار کرنا چاہئے؛ کیوں کہ کرنسی کی وہ قیمت جو اشاریہ کی بنیاد پر نکالی گئی ہو موجودہ معاشیات کے عرف میں اس کی ادائیگی کے واسطے لیے ہوئے قرض کی رقم کے مثل اور برابر سمجھی جاتی ہے، تو ادائیگی کے باب میں شریعت کو بھی اس عرف کا لحاظ رکھنا چاہئے۔

ماہرین کا یہ استدلال غلط، بے بنیاد اور باطل ہے، اولاً تو اس وجہ سے کہ عرف و عادت کا اعتبار وہاں ہوتا ہے، جہاں نصوص کی خلاف ورزی نہ ہوتی ہو نیز وہ حکم شرعی نص سے ثابت نہ ہو "العادة محكمة" کی تشریح میں شرح القواعد الفقہیہ میں ص: ۲۱۹ پر مرقوم ہے: إن العادة عامة كانت أو خاصة تجعل حكماً لإثبات حكم شرعی لم ينص علی خلافه بخصوصه۔

یہ تمام نصوص جو سود کی حرمت پر دلالت کرتی ہیں جن کا گزشتہ تذکرہ ہو چکا ہے، ان سے مثلثیت کے معنی کا تعین بالکل صراحت کے ساتھ ہو جاتا ہے کہ مثلثیت کا اعتبار مقدار میں ہے، قیمت میں اس کا اعتبار نہیں، لہذا اس مسئلہ کا تعلق عرف و عادت سے نہیں، نیز عرف و عادت کے اعتبار کے بارے میں شرح القواعد الفقہیہ کے مذکورہ قاعدہ کے تحت تحریر فرماتے ہیں: فالمراد بها حينئذ مالا يكون مثابراً لما عليه أهل الدين والعقل المستقيم ولا منكرافي

نظر ہم“ کہ عادت و عرف سے مراد وہ عادت و عرف ہے جو اس نظریہ سے بالکل مغائر نہ ہو جس کو اہل دین و شریعت اور سلیم العقل حضرات نے اپنایا ہو اور نہ ہی وہ ان کی نظر میں منکر اور غیر پسندیدہ ہو، جب قیمت میں برابری کا تصور اہل دین کی اکثریت کا نہیں ہے بلکہ اس تصور کو اہل دین و شریعت پسند ہی نہیں کرتے تو پھر ایسا عرف معتبر بھی نہیں ہوگا۔

ثانیاً یہ عرف و عادت تمام جگہوں میں رائج و غالب ہونی چاہئے، جب کہ مالیت اور قیمت کو مثل قرار دینے کا تصور ماہرین معاشیات کا عرف غالب بھی نہیں ہے کہ اس کا اعتبار کیا جائے کیوں کہ ”العادة محكمة“ اور ”التعيين بالعرف كالتعيين بالنص“ کی تشریح میں ”شرح القواعد الفقہیہ ص: ۲۹۱ پر مرقوم ہے: أن تكون مطردة أو غالبية في جميع البلدان ..... فالاطراد والغلبة شرط لاعتبارها سواء كانت عامة أو خاصة کہ عرف و عادت مطرد ہو یا تمام جگہوں میں غالب ہو پس عرف و عادت کا اعتبار کرنے میں اطراد اور غلبہ شرط ہے، چاہے عرف و عادت عام ہو یا خاص ہو۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کے اکثر ممالک قرضوں کو قیمتوں سے مربوط کرنے کے نظریہ سے متفق نہیں ہیں اور یہ ان کے عمل سے ثابت ہوتا ہے، اسی طرح اس نظریہ کو ایک عام اصول کے طور پر تسلیم کرنا اور جاری کرنا ممکن بھی نہیں ہے، کیوں کہ اشاریہ میں کس چیز کو بنیاد بنایا جائے گا؟ بعض مرتبہ اناج کی قیمت بڑھتی ہے لیکن سونے کی قیمت نہیں بڑھتی، اسی طرح دوسری اشیاء کہ اس میں قیمتوں کے گھٹنے اور بڑھنے کا کوئی اصول نہیں، اور یہ ضروری نہیں ہے کہ ایک چیز کی قیمت گھٹ گئی یا بڑھ گئی تو دوسری چیزوں کی قیمت بھی اسی تناسب سے گھٹے یا بڑھے، اور اگر کوئی ایسا اشاریہ بنا دیا گیا جیسا کہ حکومت ملازمین کی اجرت میں مہنگائی بھتہ کے اضافہ سے بناتی ہے تو ہر وقت نوٹوں کی قیمت میں کمی بیشی کا عمل کرتے رہنا ہوگا، ظاہر ہے کہ یہ سب باتیں ذہنوں کو الجھا دینے والی اور مسائل کو بجائے سلجھانے کے الجھانے والی ہیں اور باہمی نزاع پیدا کرنے کا باعث ہوں گی، قرض کی ہر قسط ادا کرتے وقت

نیا حساب لگانا ہوگا، ظاہر ہے اس کو نہ لوگوں کا مزاج قبول کر سکتا ہے اور نہ اسلام کی سادہ اور سہل شریعت اس کو قبول کر سکتی ہے۔

عرف عام اور عادیۃ الناس بھی یہی ہے کہ قرضوں کی ادائیگی (جب کہ غیر سودی ہوں) خواہ وہ کتنے ہی عرصہ کے بعد کیوں نہ ہو اتنے ہی روپے کرنسی نوٹوں میں ادا کی جاتی ہے جتنے روپے کے کرنسی نوٹ لئے گئے تھے، یا واجب تھے، قیمتوں کے اشاریہ کے حساب سے واجبات کی ادائیگی کا تصور بالکل نیا، ناقابل عمل اور باعث نزاع ہے، ضروری نہیں کہ ہر وقت اشیاء کی قیمتیں بڑھتی رہتی ہوں، اگر کسی وقت قیمتیں گھٹ گئیں تو کیا واجبات کی ادائیگی کم روپیوں میں کی جائے گی۔

فقہی مقالات (۱۱۷) پر مولانا تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم تحریر فرماتے ہیں کہ ”ہم دیکھتے ہیں کہ ایسے بہت سے معاشین جو قرضوں کی ادائیگی میں ”حقیقی قیمت“ کے نظریہ کی تائید کرتے ہیں اس بات کی بھی وضاحت کرتے ہیں کہ ہم اس نظریہ کو ان ”صرفی قرضوں“ کی ادائیگی میں جاری نہیں کرتے جو قرضے انسان اپنی ضروریات پوری کرنے کے لئے حاصل کرتا ہے، جیسے کوئی شخص ایک ہزار روپے اس لئے قرض لیتا ہے تاکہ اس کے ذریعہ وہ اپنے کھانے، پینے اور اوڑھنے کی ذاتی ضروریات پوری کر سکے، تو ان معاشین کے نزدیک بھی اس قسم کے قرض کو ”قیمتوں کے اشاریہ“ کے ساتھ جوڑ دینا مناسب نہیں، بلکہ وہ اس حقیقی قیمت کے نظریہ کو صرف ”سرمایہ کاری کے قرضے“ میں جاری کرتے ہیں، کیا یہ خود ان معاشین کی طرف سے اس بات کا اعتراف نہیں ہے کہ ”صرفی قرضوں“ میں ”حقیقی قیمت“ معتبر نہیں ہے؟ تو اگر ”صرفی قرضوں“ میں اس کا اعتبار نہیں تو پھر ”سرمایہ کاری کے قرضوں“ میں کیوں اعتبار کیا جاتا ہے؟ اس لئے کہ مثلیت اور برابری تو ایک حقیقت ہے جو قرضوں کے اقسام کے اختلاف سے مختلف نہیں ہونی چاہئے؟“۔

بہر حال یہ بات بھی دیکھنے میں آئی کہ ماہرین معاشیات قرضوں میں حقیقی قیمت کے

اعتبار کرنے کے نظریہ کی افراط زر کی صورت میں تو تائید کرتے ہیں لیکن تفریط زر کی صورت میں کوئی بھی اس کی تائید نہیں کرتا۔ تفریط زر کی صورت میں اگر دس فیصد قیمت گھٹ گئی تو کون شخص گوارا کرے گا کہ اس کو اپنے قرض دار سے ایک سو روپے کے بجائے ننانوے روپے مل جائے۔ مطلب تفریط زر کی صورت میں لاحق ہونے والے نقصان کو کوئی بھی قبول کرنے کے لئے تیار نہیں، اور اس نقصان کے خوف سے کوئی بھی اپنا روپیہ بینک میں رکھنے کے لئے تیار نہیں۔ معلوم ہوا کہ ”Real Value حقیقی قیمت“ کا یہ نظریہ کوئی ٹھوس اور مبنی بر حقیقت بنیادوں پر قائم نہیں؛ بلکہ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ افراط زر کے نقصان سے بچنے کے لئے ”حقیقی قیمت“ کو محض ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جا رہا ہے۔

کیا یہ جائز ہوگا کہ نوٹوں کی شکل میں قرض دیتے وقت یا مہر مقرر کرتے وقت طرفین واجب الاداء نوٹ کی مالیت سونے یا چاندی میں طے کر لیں اور بے وقت ادائیگی اس قدر سونے یا چاندی کی قیمت کے مساوی نوٹوں کی ادائیگی عمل میں آئے؟

Real Value ”حقیقی قیمت“ کا معیار اور اشاریہ مقرر کر کے قرض دیتے وقت ہی دونوں معاملہ کرنے والوں کو اس بات کا پابند بنایا جائے کہ سونا چاندی کی قیمت معلوم کر کے دستاویزی شکل میں اپنے قرض کی رقم کی قیمت محفوظ رکھیں، تو اس طرح کرنے سے وہ پریشانیوں سے بچیں گی جو تصور سے باہر ہیں۔

پھر قیمتوں میں کمی بیشی کا معیار کیا ہے اور اس معیار کو سمجھنا خواص کے لئے مشکل ہے تو پھر عوام الناس جس کا قرض کا معاملہ زیادہ ہوتا ہے تو کیسے آسانی سے سمجھ سکیں گے، پھر شریعت کا تعلق عوام و خواص دونوں طبقہ کے لئے یکساں ہے اور شریعت نے سہولت کو ہمیشہ ملحوظ رکھا ہے بلکہ حرج و عسر کو دور کرنے کی حمایت کی ہے، نیز اس طرف رغبت بھی دلائی ہے: ”وما جعل علیکم فی الدین من حرج“ کہ اللہ نے تمہارے لئے دین میں تنگی پیدا نہیں فرمایا ”الحرج



مدفوع“ اور ”الدین یسر“ کہ حرج مدفوع ہے اور بیشک دین و شریعت آسان ہے۔ جا بجا آسانی اور سہولت پیدا کرنے کے احکام اور رغبت دلائی گئی ہے، تو پھر ایسے حساب سے توتنگی اور پریشانی کا ایک سلسلہ جاری ہو جائے گا اور ایسی ایسی اصولی اور فنی تحقیقات اور تدقیقات کرنی پڑے گی جو اسلام کی سادگی اور یسر و سہولت یعنی مزاج شریعت کے منافی ہے۔

اس کے علاوہ نوٹوں سے قرض کا رواج عام ہو چکا ہے، اگر نوٹ ذوات القیم میں سے ہوتی یعنی اس کی قیمت کا اعتبار ہوتا تو اس سے قرض کا جواز ہی نہیں ہو سکتا تھا، جب کہ تمام فقہاء، علماء اور مسلمان غرض خواص و عوام سب ہی نوٹوں سے قرض کا معاملہ کرتے ہیں اور بوقت ادائیگی نوٹوں ہی سے ادا کرتے ہیں اور اس میں کوئی نزاع بھی نہیں ہوتا، جو اس بات کی کھلی علامت ہے کہ نوٹ ذوات الامثال سے ہے اس لئے اس کے تمام معاملات میں ”سواء بسواء“ اور ”مثلاً بمثل“ کا لحاظ کرنا ضروری ہوگا جس طرح کے درہم و دنانیر میں ہے۔

۱- لہذا نوٹوں کی شکل میں دئے ہوئے قرض کو سونے یا چاندی کی مالیت میں طے کرنا اور بوقت ادائیگی اس قدر سونے یا چاندی کی قیمت کے مساوی نوٹوں کی ادائیگی پر معاملہ کرنا جائز نہ ہوگا؛ کیوں کہ یہ سود کی صورت ہے، کرنسی نوٹ ایک جنس ہے اور اس کی اسی جنس سے تبادلہ کی صورت میں ادائیگی سواء بسواء اور مثلاً بمثل کے اصول پر ہونی چاہئے اور یہ ضروری ہے، فقہی نقطہ نظر سے دیکھئے تو ٹھمن کا تبادلہ سونے کی مقدار سے ادھار ہے اور پھر سونے کی مقدار کو ٹھمن کی شکل میں اضافہ کے ساتھ حاصل کرنا ہے اس لئے اس کے جواز کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔

۲- مہر کے معاملہ میں فریقین مہر کو ابتداء ہی سے سونایا چاندی ہی کی شکل میں طے کر لیں، اس تکلف کی آخر کار کیا ضرورت ہے؟ کہ نوٹوں میں مہر مقرر کیا جائے اور سونایا چاندی میں اس کی مالیت طے کی جائے، پھر ادائیگی کے وقت سونایا چاندی کی قیمت کے مساوی نوٹ حاصل کئے جائیں۔ صاف اور سیدھی بات یہی ہے کہ سونایا چاندی کی شکل میں طے کر لے، اب

اگر عورت چاہے تو اس وقت سونے یا چاندی کے بازاری نرخ سے نوٹ وصول کر سکتی ہے اور اس میں شرعاً کوئی قباحت اور حرج بھی نہیں، عورت کو کوئی خسارہ بھی نہیں اور مرد پر کوئی زائد بوجھ بھی نہیں آتا۔

وقت پر ادانہ ہونے والی تنخواہوں اور اجرتوں کو اشاریہ سے مربوط کرنے کے سلسلے میں شرعی نقطہ نظر:

اجرتوں اور تنخواہوں کے باب میں حکم قرضوں جیسا ہی ہوگا جب کہ اجرت قرض بن جائے یعنی اس میں بھی مقدار میں مثلیت معتبر ہوگی قیمت اور اشاریہ سے جوڑنا جائز نہیں ہوگا۔

در اصل اجرت اور تنخواہ وغیرہ کو اشاریہ سے منسلک کرنے کی چند صورتیں ہو سکتی ہیں:

پہلی صورت: اجرت کو نوٹوں کے ذریعہ طے کی جائے، کہ اتنی اجرت یا تنخواہ دی جائے گی اور پھر مالک و مزدور یا کمپنی یا حکومتی ادارہ اور اس کے ملازمین کے درمیان یہ بات بطور معاہدہ طے ہو جائے کہ اجرت اور تنخواہ اشاریہ کی زیادتی کے تناسب سے بڑھتی جائے گی اور دونوں اس پر رضامند بھی ہو گئے، اب کتنی اجرت ہر سال بڑھے گی اس کا تناسب معلوم نہیں، اس صورت میں اجیر یعنی ملازم یا مزدور کی تنخواہ فی الحال مثلاً چار ہزار روپے ماہانہ ہے، اب جب نیا سال شروع ہوگا تو قیمتوں کا اشاریہ دیکھا جائے گا اور اس میں سال بھر جس تناسب سے زیادتی ہوئی ہے اسی تناسب سے اجرت اور تنخواہ میں زیادتی ہوگی مثلاً ۱۰ فیصد اضافہ ہوا ہے تو اب اس ملازم کی تنخواہ چار ہزار چار سو ہو جائے گی اور ہر سال اس زیادتی پر عقد کی تجدید ہوگی۔ شرعی نقطہ نظر سے یہ صورت جائز ہے؛ کیوں کہ دونوں ہر سال ایک معین زیادتی پر راضی اور متفق ہو گئے ہیں، اگرچہ تناسب مجہول ہے لیکن وہ پیمانہ معلوم ہے جس سے تناسب کی زیادتی کی جہالت دور ہو جاتی ہے، اس لئے زیادتی کے مقدار میں جو جہالت کا شبہ تھا وہ دور ہو گیا؛ کیوں کہ ایسے عقود میں جہالت یسیرہ قابل تحمل ہے، جب کہ اس کا ازالہ بھی ہو جاتا ہو، لہذا یہ صورت جائز ہوگی۔

فناوی ہندیہ (۲۱۲/۲) پر مرقوم ہے:

”وإن كان في البلد نقود مختلفة فإن كانت في الرواج على السواء ولا فضل للبعض على البعض فالعقد جائز ويعطى المستاجر أى النقود شاء وإن كانت الأجرة مجهولة لأن هذه الجهالة لا تفضي إلى المنازعة“۔

الموسوعة الفقهية (۱/۲۶۳) پر مرقوم ہے: ”ولو كانت في الأجر جهالة

مفضية للنزاع فسد العقد“۔

مذکورہ بالا دونوں عبارتوں سے صرف یہ بتلانا ہے کہ اجرت کی جہالت مفضی الی المنازعة ہوتی تو عقد فاسد ہو جاتا ہے، اور اگر جہالت یسیرہ ہو، مفضی الی المنازعة نہ ہو، اور کسی طرح اس کا ازالہ ہو جاتا ہو تو یہ قابل تحمل ہے، اور عقد صحیح ہو جاتا ہے۔ اجرت کی مذکورہ صورت میں تناسب مجہول ہے، مگر اس کو معلوم کرنے کا معیار تیار کردہ اشاریہ موجود ہے، جس سے جہالت کا ازالہ ہو جاتا ہے؛ لہذا یہ جہالت صحت عقد کے لئے مانع نہیں ہے۔

اجرت کو اشاریہ سے مربوط کرنے کی دوسری صورت یہ ہے کہ اجرت کی تعیین نوٹوں کی ایک معلوم مقدار پر ہو جائے، مثلاً کسی نے زید کو ایک مہینہ کی ملازمت کے لئے رکھا اور یہ بات طے ہوئی کہ مہینہ کے اخیر میں اس ملازم کو قیمتوں کے اشاریہ کا لحاظ کرتے ہوئے اتنی رقم اجرت میں دے گا جو فی الحال ایک ہزار روپیہ کے مساوی ہوگی۔ مگر اس شرط کے ساتھ کہ مالک کے ذمہ یہ معلوم مقدار واجب الاداء نہیں بلکہ مہینہ کے اخیر میں قیمتوں کے اشاریہ کے لحاظ سے اس مقدار معلوم (ایک ہزار) کے مساوی اور برابر واجب الاداء ہے۔

اب مہینہ کے اخیر میں دیکھا تو قیمتوں کے اشاریہ میں دو فیصد کے تناسب سے قیمتوں میں اضافہ ہوا ہے، تو اب مالک زید کو اخیر میں ایک ہزار بیس روپے ادا کرے گا؛ کیوں کہ اس وقت یہ ایک ہزار بیس روپے مہینہ کی شروعات کے ایک ہزار روپے کی مالیت اور قیمت کے مساوی

اور برابر ہیں۔ پھر جب مہینہ کے اخیر میں یہ طے ہو گیا کہ اجرت ایک ہزار بیس روپے ہے، تو اب یہ اجرت دائمی طور پر اتنی ہی رہے گی، اس میں اشاریہ کے اضافہ سے اضافہ نہیں ہوگا، چاہے مالک نے ادائیگی میں ایک سال کی مدت لگا دی، پھر بھی اب ایک ہزار بیس روپے ہی ادا کرنے ہیں۔

شرعی نقطہ نظر سے اس شرط کے ساتھ یہ صورت بھی جائز ہونی چاہئے کہ اشاریہ اور اس کے حساب کا طریقہ فریقین کو اچھے طریقے سے معلوم ہو، تاکہ اشاریہ اور حساب کے طریقے سے جہالت باہمی نزاع کا باعث نہ بنے۔

حضرت مفتی تقی عثمانی دامت برکاتہم نے اس مسئلہ کو ایک اور مسئلہ سے تشبیہ دی ہے، اس کو یہاں نقل کرتا ہوں۔ فقہی مقالات: ج ۱، ص: ۶۷ آپ تحریر فرماتے ہیں کہ ”جیسے کہ ایک شخص نے کسی کو ملازم رکھا اور اجرت میں طے کی کہ مہینہ کے اخیر میں دس گرام سونے کی قیمت جو ہوگی وہ مالک کے ذمہ ادا کرنی واجب ہوگی، جب مہینہ کے اخیر میں دیکھا تو دس گرام سونے کی قیمت دو ہزار روپے تھی، تو خود بخود طے ہو گیا کہ اجرت دو ہزار روپے ہے۔ اب اس کے بعد اس اجرت میں نہ تو زیادتی ہوگی اور نہ کمی ہوگی، چاہے سونے کی قیمت اس کے بعد زیادہ ہو جائے یا کم ہو جائے اس سے اجرت پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔“

بہر حال یہ تو ایسا ہی ہے جیسا کہ کسی پر ایک دینار واجب والا داء ہے، جس کی ادائیگی مہینہ بعد ہے، اور واجب ہونے کے دن ایک دینار کی قیمت دس درہم ہے لیکن ادائیگی کے دن اس کی قیمت گیارہ درہم ہوگئی تو اس پر اس وقت گیارہ درہم واجب ہوں گے۔ جیسا کہ وہ اس روایت جس میں آپ ﷺ نے فرمایا: ”لا بأس أن تأخذها بسعیر یومها“ (پوری حدیث گذر چکی ہے) سے ثابت ہوتا ہے، لہذا یہ صورت جائز ہوگی۔

تیسری صورت اشاریہ سے اجرتوں کو مربوط کرنے کے متعلق یہ ہے کہ اجرت تو معینہ مقدار پر طے ہو جائے اور شرط بھی کر لی جائے کہ مالک اس اجرت کو ادا کرنے کا ذمہ دار ہے جو

اس عقد میں طے ہوئی ہے، لیکن مالک ادا کرتے وقت قیمتوں کے اشاریہ میں جس تناسب سے اضافہ ہوا ہے اسی تناسب سے اجرت میں بھی اضافہ کرے گا۔

جس کی مثال یہ ہے کہ کسی شخص نے ایک ہزار روپے کے عوض میں ملازمت پر کسی کو رکھا اور دونوں کے درمیان طے ہو گیا کہ اجرت ایک ہزار روپے ہے، لیکن مالک پر یہ ضروری ہوگا کہ ادائیگی کے وقت اشاریہ میں جس تناسب سے اشیاء کی قیمت میں اضافہ ہوگا اسی تناسب سے وہ بھی ہزار روپیہ میں اضافہ کرے گا۔ لہذا مہینہ کے آخری دن میں اشاریہ میں دو فیصد اضافہ ہوا ہے تو ایک ہزار بیس روپے ادا کرے گا، اور اگر یہ اجرت سال کے بعد ادا کی اور قیمتوں کے اشاریہ میں دس فیصد اضافہ ہوا ہے، تو سال کے بعد دس فیصد کا اضافہ کر کے ادا کرے گا۔

اس صورت کا حکم قرضوں کو اشاریہ سے مربوط کرنے کی طرح ہے کہ وہ ناجائز ہے، لہذا یہ بھی ناجائز ہے؛ کیوں کہ مالک نے مہینہ کے بعد یہ تنخواہ ادا نہیں کی بلکہ پورا سال گزر گیا تو یہ تنخواہ مالک کے ذمہ قرض ہوگئی، اب وہ اگر سال گزرنے کے بعد تنخواہ ادا کرتا ہے تو اس وقت اشاریہ میں دس فیصد کا اضافہ ہوا ہے، تو تنخواہ میں بھی دس فیصد اضافہ کر کے دے گا، شرعی نقطہ نظر سے یہ صورت ناجائز ہے؛ کیوں کہ یہاں بھی اجرت (جو کہ میعاد گزرنے پر قرض بن چکی ہے) کو قیمتوں کے اشاریہ سے مربوط کیا گیا، اور قرض کو اشاریہ سے مربوط کرنا باب ربا کو کھولنا بلکہ اس کو رائج کرنا، نیز تقویت دینا ہے۔ معادوسری خرابی یہ ہے کہ اس صورت میں اجرت مجہول ہو جاتی ہے اور صحت عقد اجارہ کے لئے اجرت کا معلوم و متعین ہونا ضروری ہے، جیسا کہ کتب فقہ میں اس طرح کی عبارت منقول و مذکور ہے: "ولو كان في الأجر جهالة مفضية للنزاع فسد العقد" (الموسوعة الفقهية ۲۶۳/۱)، یعنی کہ اجرت کی مفضی الی النزاع جہالت عقد اجارہ کو فاسد کر دیتی ہے، لہذا اس صورت میں بھی اجرت کو اشاریہ سے مربوط کرنا جائز نہیں ہوگا۔

هذا ما عندي والله أعلم بالصواب۔

## کرنسی کو اشاریہ سے مربوط کرنا وضاحت اور شرعی حکم

مولانا راشد حسین ندوی ☆

افراط زر کا مسئلہ:

پہلے زمانہ میں سونے چاندی کے سکے رائج تھے، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ طویل عرصہ تک کرنسی کی قوت خرید یکساں رہتی تھی، اور فرق ہوتا بھی تھا تو بہت معمولی، اور طویل مدت کے بعد واقع ہوتا تھا، لیکن موجودہ دور میں سونے چاندی کے سکوں کی جگہ نوٹ نے لے لی ہے، شروع میں اس نوٹ کا تعلق سونے سے رہا کرتا تھا، لیکن خاص اسباب کے تحت بعد میں یہ تعلق بھی ختم ہو گیا، چنانچہ مولانا تقی عثمانی صاحب لکھتے ہیں:

”اس طرح اب سونا کرنسی کے دائرہ سے بالکل خارج ہو چکا ہے، اور اب سونے کا کرنسی سے کوئی تعلق باقی نہیں رہا ہے، اور نوٹوں اور زرعمامتی (یعنی کم قیمت کے سکوں) نے پوری طرح سے سونے کی جگہ لے لی ہے، اب نوٹ نہ سونے کی نمائندگی کرتے ہیں نہ چاندی کی، بلکہ ایک فرضی قوت خرید کی نمائندگی کرتے ہیں“ (فقہی مقالات ۱/۲۱)۔

اس کا نتیجہ اب یہ نکلا ہے کہ نوٹ کی قوت خرید کا تعلق اب چیزوں کی مہنگائی اور ان کے

☆ مدرسہ ضیاء العلوم مکیہ، رائے بریلی۔

ستا ہونے سے ہے، خود اپنی ذات سے اس میں سستا مہنگا سونے کی صلاحیت نہیں ہے، نہ پیدائشی دھاتوں کی قیمتوں میں کمی بیشی سے اس میں فرق پڑتا ہے۔

مولانا عثمانی فرماتے ہیں:

”موجودہ علم معاشیات کے الفاظ میں اس کی تشریح اس طرح کی جاسکتی ہے کہ آج کے دور میں کرنسی کی اندرونی قیمت کا مدار ملک میں افراط زر اور تفریط زر پر ہوتا ہے، اگر ملک میں افراط زر ہو جائے تو کرنسی کی قیمت کم ہو جاتی ہے، اور جب تفریط زر ہو جائے تو کرنسی کی قیمت بڑھ جاتی ہے“ (ایضاً ۱۱۹)۔

آگے اس کو سمجھاتے ہوئے فرماتے ہیں:

تفریط زر کے وقت ہم کرنسی کے ذریعہ اشیاء صرف کی بڑھتی مقدار خرید سکتے ہیں، مثلاً اس وقت ہم سو روپے میں مندرجہ ذیل اشیاء خرید سکتے ہیں:

گندم ۲۰ کلو

نمک ۲۰ کلو

کپڑا ۱۰ میٹر

آگے فرماتے ہیں: ”افراط زر کے وقت وہی اشیاء مندرجہ ذیل مقدار میں خرید

سکیں گے:

گندم ۱۰ کلو

نمک ۱۰ کلو

کپڑا ۵ میٹر“ (ایضاً ۱۲۰)۔

اب سوال یہ ہے کہ اگر ایک شخص نے تفریط زر کے وقت کسی سے سو روپے ادھار لیے،

یا ایک ہزار مہر مقرر کی، یا اسی کے مثل کوئی مؤخر مطالبہ اپنے ذمہ لیا، اور ان چیزوں کی ادائیگی وہ

افراط زر کے وقت کر رہا ہے، تو ادائیگی کے وقت جتنا اس نے لیا تھا یا جتنا اس پر لازم تھا اتنی رقم ہی کا ادا کرنا اور اس میں کمی بیشی نہ کرنا اس پر لازم ہے، ورنہ سود لازم آئے گا، لیکن مسئلہ یہ ہے کہ اگر وہ صرف سو روپے واپس کر رہا ہے تو کیا جتنا اس پر لازم ہوا تھا اتنا اس نے ادا کیا؟ صاف ظاہر ہے کہ لزوم تفریط کے وقت ہوا، واپسی افراط کے وقت ہو رہی ہے، لہذا جتنی اشیاء سو روپے سے لیتے وقت مل سکتی تھیں اب نہیں مل سکتی ہیں، تو کیا صرف سو روپے کی واپسی مقرض پر ظلم نہیں؟ اور چونکہ افراط زر ہی زیادہ تر ہوا کرتا ہے اس لئے مقرض ہمیشہ ہی گھائے میں رہتا ہے، تو یہ تو عجیب بات ہے کہ وہ کسی کی امداد بھی کرے اور اس کو مزید گھائے میں بھی مبتلا کر دیا جائے۔

اس فکر کے تحت بعض ماہرین معاشیات نے یہ حل نکالا کہ کیوں نہ اس طرح کی ادائیگیوں کو قیمتوں کے اشاریہ (Price Index) سے مربوط کر دیا جائے، اس سے مقرض اس نقصان سے محفوظ رہے گا، برازیل، آسٹریلیا اور اسرائیل جیسے چند ممالک نے اس نظام کو پسند کیا اور اپنا بھی لیا، ہمیں اس شکل کا شرعی حکم دریافت کرنا ہے، لہذا پہلے ہم کو اس پرائس انڈیکس کا مطلب سمجھنے کی ضرورت ہے، اس لئے کہ یہ خالص اقتصادی اصطلاح ہے، مولانا تقی عثمانی صاحب اس کو سمجھاتے ہوئے فرماتے ہیں:

”زیر بحث مسئلہ کا شرعی حکم جاننے کے لئے قیمتوں کا اشاریہ وضع کرنے کا طریقہ اور کرنسی کی قیمت میں اس کے استعمال کو جاننا ضروری ہے، لہذا قرضوں کا قیمتوں کے اشاریہ کے ساتھ تعلق کے مسئلہ میں ماہرین معاشیات جو طریقہ اختیار کرتے ہیں اس کا خلاصہ ہم آپ کے سامنے پیش کرتے ہیں:

جاننا چاہئے کہ کرنسی چاہے دھات کی ہو یا کاغذی کرنسی ہو وہ بذات خود مقصود نہیں ہوتی، اس لئے کہ وہ کرنسی بذات خود نہ تو بھوک مٹا سکتی ہے اور نہ اس سے جسم کو ڈھانپا جاسکتا ہے، اور نہ اس کے ذریعہ خواہش پوری کی جاسکتی ہے، اور نہ اس کے ذریعہ تکلیف دور کی جاسکتی ہے،



بلکہ اس کرنسی کے ذریعہ انسان اپنی ضروریات زندگی کی اشیاء و خدمات خریدتا ہے، اس لحاظ سے دیکھا جائے تو ہر کرنسی کی دو قیمتیں ہوتی ہیں، ایک اس کی ظاہری قیمت (Face Value) یہ وہ قیمت ہے جو اس کرنسی پر رکھی ہوتی ہے، دوسری اس کی واقعی قیمت (Real Value) یعنی اس کرنسی کا حقیقی عملی فائدہ جو ایک انسان اپنی ضروریات میں اس کرنسی کو خرچ کر کے حاصل کرتا ہے، اس کو دوسرے لفظوں میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ اس کرنسی کی حقیقی قیمت اشیاء اور خدمات کا وہ مجموعہ ہے جو ایک انسان کے لئے اس کرنسی کے ذریعہ خریدنا ممکن ہو، آج کل اقتصاد بین اشیاء کے اس مجموعہ کا نام ”اشیاء کی ٹوکری“ (Basket of Goods) رکھتے ہیں، لہذا کرنسی کی حقیقی قیمت وہ اشیاء کی ٹوکری ہے جس کو کرنسی کے ذریعہ خریدنا ممکن ہو“ (ایضاً ص ۵۹)۔

پھر آگے موصوف نے تفصیل سے سمجھایا ہے کہ یہ قوت خرید یکساں نہیں رہتی، اس میں تغیر ہوتا رہتا ہے، اگر ۲۰۰۹ء میں پانچ ہزار روپے میں اشیاء کا ایک خاص مجموعہ ملتا ہے تو ۲۰۱۲ء میں ہو سکتا ہے کہ یہ مجموعہ ۱۰ ہزار میں ملے، مولانا فرماتے ہیں:

”اگر ہم فرض کریں کہ ۱۹۸۰ء میں ایک شخص کی ماہانہ تنخواہ پانچ ہزار روپے تھی، اور ۱۹۸۷ء میں اس کی تنخواہ زیادہ ہو کر دس ہزار روپے ہو گئی، تو اس کی ماہانہ تنخواہ کی قیمت اور حیثیت کا حساب مندرجہ ذیل طریقہ سے کیا جائے گا:

سال	تنخواہ کی ظاہری قیمت	نرخ نامہ میں زیادتی کا تناسب	حقیقی قیمت
۱۹۸۰ء	۵۰۰۰ روپے	۱۰۰	۵۰۰۰
۱۹۸۷ء	۱۰۰۰۰ روپے	۲۰۵	۴۰۰۰

مندرجہ بالا مثال میں آپ دیکھیں گے کہ اگرچہ اس شخص کی تنخواہ کی ظاہری قیمت دس ہزار روپے ہو گئی لیکن اس کی تنخواہ کی حقیقی قیمت ۱۹۸۰ء کی قیمتوں کی سطحوں پر نظر رکھتے ہوئے چار ہزار روپے ہو گئی، اس لئے کرنسی کی حقیقی قیمت کو دیکھتے ہوئے ۱۹۸۷ء کے دس ہزار روپے

۱۹۸۰ء کے چار ہزار روپے کے مساوی ہو گئے“ (ایضاً، ص ۶۲، ۶۳)۔

اس طرح اگر کسی نے ۱۹۸۰ء میں چار ہزار روپے قرض لئے تھے، تو اگر ہم قرضوں کی ادائیگی کو قیمتوں کے اشاریہ کے ساتھ وابستہ کر دیں تو ۱۹۸۷ء میں اسے دس ہزار واپس کرنے ہوں گے، اس لئے کہ اس کی حقیقی قیمت معتبر ماننے کا مطلب یہی ہوگا۔

مسئلہ کی وضاحت کے بعد سوال پر شرعی حیثیت سے نگاہ ڈالتے ہیں:

مسئلہ مختلف فیہ ہے:

اس مسئلہ کے شرعی جواب میں علماء کے دو فریق ہو گئے ہیں: مجوزین، اور مانعین، ہم دونوں کے دلائل ترتیب وار لکھتے ہیں؛ تاکہ مسئلہ کی حقیقت تک پہنچنا اور صحیح صحیح حکم شرعی دریافت کرنا آسان ہو جائے۔

مجوزین کے دلائل:

اشاریہ سے وابستہ کرنے کو جائز قرار دینے والے مندرجہ ذیل دلائل سے استدلال کرتے ہیں:

۱- قرآن مجید میں کئی مقامات میں ناپ تول میں برابری کی تائید کی گئی ہے، ارشاد ہے:

”أوفوا الكيل والميزان بالقسط“ (سورۃ الانعام، ۱۵۲)۔

(اور ناپ تول پوری پوری کیا کرو)۔

”وزنوا بالقسطاس المستقیم“ (سورۃ الشعراء، ۱۸)۔

(اور سیدھی ترازو سے تول لا کرو)۔

ایفاء بالقسط کا یہ حکم صرف کیلی اور وزنی چیزوں ہی کے لئے نہیں ہے، اس کا تعلق تمام

مالی معاملات سے ہے، اور موخر مطالبات چاہے قرض ہو یا مہر ہو، اگر ادائیگی کے وقت افراط زر

ہو گیا ہے، تو صرف لی گئی تعداد کی ادائیگی کو اس کی حقیقی قیمت کی ادائیگی نہیں قرار دیا جاسکتا ہے، ہاں اگر اس کو اشاریہ سے منسلک کر دیا جائے تو یہ ضرر دور ہو سکتا ہے (استعراض للمؤلفات الاسلامیہ ص ۱۵ و ۲۳ بحوالہ النجوت القہیہ المعاصرۃ، العدد الثانی والثلاثون ۱۳۱۷ھ، ص ۶۱)۔

۲- حدیث شریف میں اموال ربویہ کی ایک دوسرے سے بیع کے وقت، مثلاً بمثل کا حکم ہے، چنانچہ حضرت ابوسعید خدریؓ کی روایت میں ہے:

”عن ابی سعید الخدریؓ أن رسول اللہ ﷺ قال: ”لا تبیعوا الذهب

بالذهب إلا مثلاً بمثل“ (بخاری: بیوع، باب بیع الفضة بالفضة، رقم: ۲۱۷۷، مسلم، مساقاة، باب الربا رقم: ۱۵۸۷) (سونے کو سونے سے نہ بیچو مگر برابر برابر)۔

اس کا تقاضہ یہ ہے کہ دین یا قرض کی ادائیگی کے وقت اس کی حقیقی قیمت واپس کی جائے، اور یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب اشاریہ سے وابستہ کر کے واپسی کی جائے، اگر ایک شخص نے ایک ہزار روپے کا پنکھا خریدا، یا دس ہزار روپے قرض لیا، یا بیوی کا مہر پانچ ہزار روپے مقرر کیا، اور ان مطالبات کی واپسی دس سال بعد کی، تو اگر اس نے اشاریہ سے وابستہ نظام یعنی اشیاء کی ٹوکری کا اعتبار کر کے ان مطالبات کی ادائیگی کی تو اس نے درحقیقت ان رقوم کا صحیح مثل ادا کیا ہے، اور اگر ایسا نہیں کیا تو اس نے مقرض پر گویا ظلم کیا ہے، جب کہ فقہ کا مسلمہ قاعدہ ہے: ”الضرر یزال“ اور اشاریہ سے منسلک کر کے اس ضرر کو آسانی سے دور کیا جاسکتا ہے (مجلد مذکور بحوالہ ربط المعاملات بمستوی الاسعار، ص ۱۶)۔

۳- سامان کو نقد بیچتے وقت الگ قیمت پر اور ادھار بیچتے وقت الگ قیمت پر بیچنا جائز

ہے (المبسوط السنخسی ۸/۱۳، معجم المفتی ۱/۱۳۰، مسئلہ: ۱۰۹)، یہ مسلک جمہور کا ہے اس سے معلوم ہوا کہ ان حضرات نے بھی تسلیم کیا ہے کہ کسی چیز کی قیمت الگ الگ زمانہ میں الگ الگ ہو سکتی ہے (ربط

المعاملات، ص ۲۳)۔

۴- امام ابو یوسف کے فلوس کے سلسلہ میں مسلک سے بھی ان حضرات کا استدلال ہے، ان کا قول علامہ شامی نے المہنتقی کے حوالہ سے ان الفاظ سے نقل کیا ہے:

”وفی المنتقی: إذا غلت الفلوس قبل القبض أو رخصت قال أبو یوسف: قولی وقول أبی حنیفة فی ذلک سواء ولیس له غیرها، ثم رجع أبو یوسف، وقال: علیہ قیمتہا من الدراہم یوم وقع البیع ویوم وقع القبض“ (الی) هكذا فی الذخیرة والخلاصة بالعزو إلى المنتقی، وقد نقله شیخنا فی بحرہ وأقره، فحیث صرح بأن الفتوی علیہ فی کثیر من المعتبرات فیجب أن یعول علیہ إفتاء وقضاء (الی قوله) یوم وقع البیع ای فی صورة البیع وقوله ویوم وقع القبض ای فی صورة القرض كما نبه علیہ فی النہر“ (شامی ۲۶۱، ۲۷۰ کتاب البیوع مطلب مہم فی احکام القود إذا کسدت، وتنبیہ الرقود علی مسائل القود، رسائل ابن عابدین ۶۰/۲، سہیل اکیڈمی لاہور)۔

(اور المہنتقی میں ہے: جب قبضہ سے پہلے فلوس کی قیمت گراں ہو جائے یا سستی ہو جائے تو امام ابو یوسف فرماتے ہیں: میرا اور امام صاحب کا قول اس کے بارے میں یکساں ہے، اور اس کو وہی فلوس ملیں گے، پھر امام ابو یوسف نے رجوع کر لیا اور فرمایا: اس کے اوپر دراہم سے ان فلوس کی اس روز کی قیمت لازم ہوگی جس روز بیع واقع ہوگی اور جس روز قبضہ واقع ہوا (آگے ہے) الذخیرہ اور الخلاصہ میں المہنتقی کے حوالہ سے یہی ہے، ہمارے شیخ نے البحر میں نقل کر کے اس کا اثبات کیا ہے، تو جبکہ بہت سی معتبرات میں تصریح کی گئی ہے کہ فتویٰ اسی پر ہے تو ضروری ہے کہ فتویٰ اور قضاء میں اس پر اعتماد کیا جائے (آگے ہے) مصنف کا قول: جس روز بیع واقع ہوئی ہوگا مطلب ہے بیع ہونے کی صورت میں اور مصنف کا قول جس روز قبضہ واقع ہوا ہوگا مطلب قرض کی صورت میں)۔

ظاہر بات ہے کہ فلوس ٹمن اصطلاحی قرار دیئے جاتے ہیں، اور نوٹ بھی ٹمن اصطلاحی ہیں، لہذا جب فلوس کے سلسلہ میں امام ابو یوسف کا مفتی بہ قول اس کی یوم بیع و یوم قبض والی قیمت کا لحاظ کر کے ادائیگی کا ہے تو کوئی شبہ نہیں کہ یہ قول قرضوں کے اشاریہ کے ساتھ مربوط کرنے کو کھلی تائید کرتا ہے، اس لئے کہ نوٹ کے ٹمن اصطلاحی ہونے پر علماء کا اتفاق ہو چکا ہے، چنانچہ فقہ اکیڈمی کی قرارداد میں ہے:

۱۔ کرنسی نوٹ سند و حوالہ نہیں ہے، بلکہ ٹمن ہے، اور اسلامی شریعت کی نظر میں کرنسی نوٹ کی حیثیت زر اصطلاحی و قانونی کی ہے (نئے مسائل اور فقہ اکیڈمی کے فیصلے ص ۱۱۶، تجاویز دوسرا فقہی سمینار بعنوان کرنسی نوٹ کی شرعی حیثیت)۔

### مانتین ربط کے دلائل:

جو حضرات اشاریہ سے وابستگی کے خلاف ہیں ان کا استدلال مندرجہ ذیل دلائل سے ہے:

۱۔ نوٹ کی حیثیت اب ٹمن حقیقی یعنی سونے چاندی جیسی مان لی گئی ہے؛ چنانچہ مجمع الفقہ الاسلامی۔ جو مؤتمر اسلامی کا ذیلی ادارہ ہے۔ اپنی قرارداد نمبر (۹/۳۷/۱۰۷) میں کہتی ہے:

”إنها نقود اعتبارية فيها صفة الثمنية كاملة ولها الأحكام المقررة للذهب والفضة من حيث أحكام الربا والزكاة والسلام وسائر أحكامها“ (مجلة البحوث التنموية العاصرة، العدد الثاني والثلاثون ۱۳۱۷ھ، ص ۶۸)۔

(یہ ایسے اعتباری سکے ہیں جن میں مکمل ثمنیت پائی جاتی ہے، اور سود، زکوٰۃ سلم اور تمام احکام میں اس کو سونے چاندی کے مقررہ احکام حاصل ہیں)۔

اور مجمع الفقہ الاسلامی التابع لرابطة العالم الاسلامی کی قرارداد میں ہے:

”إن العملة الورقية نقد قائم بذاته له حكم النقدين من الذهب والفضة“ (ایضاً)۔

(کاغذی نوٹ مستقل کرنسی ہے، اس کو نقدین یعنی سونے چاندی کا حکم حاصل ہے)۔ اور جب ہم یہ تسلیم کر لیں کہ یہ سونے چاندی کے حکم میں ہے تو یہ بات متفقہ ہے کہ چاندی یا سونے کے سکہ سے بیچ کی جائے تو باعتبار نوع و عدد وہی سکہ متعین ہو جاتا ہے جس کا نام لیا ہے، چاہے اس کی قیمت گھٹ جائے یا بڑھ جائے:

”والدی يغلب على الظن ويميل إليه القلب أن الدراهم المغلوبة الغش أو الخالصة إذا غلت أو رخصت لا يفسد البيع قطعاً ولا يجب إلا ما وقع عليه العقد من النوع المذكور فيه، فإن أثمان عرفاً وخلقاً ولا يجري في ذلك خلاف أبي يوسف“ (تنبیہ الرقود، رسائل ابن عابدین ۲/۶۳)۔

(اور جس کا ظن غالب ہے اور جن کی طرف دل کا میلان ہے یہ ہے کہ جن دراهم پر کھوٹ غالب ہو یا جو خالص ہوں جب گراں ہو جائیں یا ارزاں ہو جائیں تو بیع قطعاً فاسد نہیں ہوگی اور جس پر عقد واقع ہوا ہے یعنی ذکر کردہ نوع، وہی واجب ہوگی، اس لئے کہ وہ عرفاً اور خلقاً شمن ہیں، اور اس میں امام ابو یوسف کا اختلاف جاری نہیں ہوگا)۔

۲- حدیث شریف میں صاف صاف فرمایا گیا ہے:

”لا تبیعوا الدینار بالدینارین، ولا الدرهم بالدرهمین“ (مسلم، مساقاة، باب

الربا، رقم: ۴۰۵۷)۔

(ایک دینار کی دو دینار سے اور ایک درہم کی دو درہم سے بیع نہ کرو)۔

جب سونے کی بیع سونے سے اور چاندی کی بیع چاندی سے ہو رہی ہو تو صریح طور سے

اس میں زیادتی کرنے کو سود قرار دیا گیا:

”الذهب بالذهب وزنا بوزن، مثلاً بمثل والفضة (الی) فمن زاد أو استزاد فهو ربا“ (مسلم: مساقاة، باب الصرف، رقم: ۴۰۶۹)۔

(سونے کی بیچ سونے سے ہم وزن اور مثلیت کے ساتھ اور چاندی کی چاندی سے (آگے ہے) تو جو زیادہ دے یا زیادتی طلب کرے تو سود ہوگا)۔

پھر جب ہم نے نوٹ کو بھی نقدین کی طرح مان لیا تو اس میں بھی مکمل طور سے یہی احکام جاری ہونے چاہئیں، اور اشاریہ سے منسلک کرنے میں یہ بات لازمی طور سے ہوگی۔

۳۔ یہ مسلک کھلے طور پر ایک حدیث سے متضاد ہے:

”عن ابن عمر رضی اللہ عنہما قلت: یا رسول اللہ! انی أبيع الإبل بالبقیع فأبيع بالدنانیر وأخذ هذه من هذه و أعطی هذه من هذه، فقال رسول الله ﷺ: لا بأس أن تأخذها بسعر یومها ما لم تفترقا و بینكما شیئ“ (ابوداؤد: بیوع، باب فی اقتضاء الذهب من الورق، رقم: ۳۳۵۴، مسند احمد، رقم: ۶۲۳۹، والحاکم بیوع ۳۰۱/۲، رقم: ۲۲۸۵، وقال: صحیح علی شرط مسلم ووافقه الذہبی)۔

(حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے، فرماتے ہیں: میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! میں بقیع (یا نقیج) میں اونٹ فروخت کرتا ہوں، تو دیناروں کے بدلہ بیچتا ہوں اور دراہم لیتا ہوں اور دراہم سے بیچتا ہوں اور دینار لیتا ہوں، اور اس کے بدلہ اس کو لیتا ہوں، اور اس کے بدلہ اس کو دیتا ہوں، تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اس میں کوئی حرج نہیں کہ تم اس کو اسی دن کے بھاؤ میں لے لو بشرطیکہ تم دونوں اس حال میں جدا نہ ہو کہ تمہارے درمیان کوئی چیز (باقی) ہو)۔

معلوم ہوا کہ جس دن دراہم کے بدلہ میں دینار یا دینار کے بدلہ میں دراہم دیتے ہیں، اسی دن ان کے قیمت کا اعتبار کیا جا رہا ہے، یہ نہیں دیکھا جا رہا ہے کہ معاملہ کے دن ان کی کیا قیمت تھی، جب کہ اشاریہ کا تقاضہ یہ ہے کہ یوم عقد کی قیمت کا اعتبار کیا جائے۔

۴- مؤخر مطالبات کی تمام انواع میں تعیین شرط ہے، چاہے بیع کی شمن ہو، چاہے مہر ہو، اسی طرح قرض لیا تو اس میں بھی مثلیت مشروط ہے، اشاریہ سے ربط کرنے میں اس میں جہالت ہوگی، صحیح مقدار بائع مشتری، مقرض، مستقرض، شوہر بیوی کسی کو بھی معلوم نہیں ہوگی، اس لئے نہ تو اس طرح قرض لینا صحیح ہوگا، نہ عقد بیع صحیح ہوگا، نہ تعیین مہر صحیح ہوگی۔

۵- اگر ہم اشاریہ سے ربط کو جائز قرار دیں تو یہ بھی جائز ہونا چاہئے کہ گیہوں وغیرہ جیسے سامان کو قرض لے کر ان کو بھی اشاریہ سے جوڑ دیں جب کہ اس کا کوئی بھی قائل نہیں ہے۔ علامہ ابن قدامہ فرماتے ہیں:

”يجب رد المثل في المكيل والموزون لا نعلم فيه خلافاً“

(المغنی ۳/۵۷۳، بیوع، باب القرض، ط مکتبہ دارالبیان)۔

( کیلی اور وزنی چیزوں میں مثل کا لوٹانا واجب ہے، اس کے متعلق ہمیں کسی اختلاف کا علم نہیں ہے)۔

۶- اصل یہ ہے کہ اشیاء کی قیمت کا اندازہ نقد سے کیا جائے، اور اشاریہ کا قائل ہونے پر یہ لازم آئے گا کہ نقد کا اندازہ سامانوں سے کیا جائے، یہ بلاشبہ قلب موضوع ہے۔

دلائل کا جائزہ:

۱- جہاں تک اشاریہ کے حامیوں کی پہلی دلیل کا تعلق ہے تو وہ بہت کمزور ہے، اس لئے کہ یہاں حکم پوری پوری ناپ تول کا ہے کہ جب دوسرے کے لئے تو لا جائے تو اسی طرح پورا پورا دیا جائے جیسا کہ اپنے لئے تولتے وقت پورا پورا لیا جاتا ہے۔

تفسیر ابن کثیر میں فرماتے ہیں:

”ای إذا دفعتم للناس فكملاوا الكيل لهم، ولا تبخسوا الكيل فتعطوه

ناقصاً، وتأخذوه إذا كان لكم تاماً وافية ولكن خذوا كما تعطون، وأعطوا كما



تأخذون“ (تفسیر ابن کثیر ۳/۳۳۳، طواریج بیروت، فی تفسیر قولہ تعالیٰ: أوفوا للکلیل ولا تکنوا من الخاسرین-سورۃ الشعراء/۱۸۱)۔

(یعنی جب لوگوں کو دینے لگو تو ان کا پیمانہ مکمل کرو، اور پیمانہ میں کمی نہ کرو کہ ادائیگی تو ناقص کرو اور جب تمہیں لینا ہو تو پورا پورا لو، لیکن جس طرح دیتے ہو اسی طرح لو اور جس طرح لیتے ہو اسی طرح دو)۔

اس اعتبار سے یہ دلیل تو مانعین ربط کی ہے، اس لئے کہ اس کا تقاضہ ہے کہ جتنا دیا ہے ٹھیک ٹھیک وزن اور ناپ کے ذریعہ اتنا ہی لیا جائے، اس سے کمی بیشی نہ کی جائے، آیت کریمہ میں وزن اور کیل کے علاوہ کسی اور چیز کو معیار بنانے کی صاف طور سے نفی ہے، اور اشاریہ سے مربوط کرنے میں وزن اور کیل کے بجائے دوسری مبہم چیزوں پر نگاہ ہوتی ہے، جس کی وجہ سے مقرض اور دائن نے جتنا دیا ہے وزن، کیل اور عدد میں اس سے زیادہ لیتا ہے، اور یہ تو کھلا ہوا ربا الفضل ہے۔

۲- جہاں تک ”مثلاً بمثل“ والی حدیث کا تعلق ہے تو اس سے استدلال کرنا بھی صحیح نہیں ہے، اس لئے کہ شریعت میں مثل سے مثل صوری مراد ہے نہ کہ مثل معنوی، چنانچہ مثل کی تعریف کرتے ہوئے فقہاء نے اس کی مثال کیل، وزن اور عدد متقارب سے دی ہے: ”المثلی ہو ما یوجد مثله فی السوق بدون تفاوت یعتد بہ“ (الدر المختار ۵/۱۱۷، ۱۱۸، نیز المغنی ۶/۳۲۵، بدائع الصنائع ۷/۱۵۰)۔

(مثلی وہ ہے جس کا مثل بازار میں بغیر کسی قابل اعتبار تفاوت کے پایا جائے)۔  
اسی لئے حدیث میں صراحت سے جنس کو جنس سے بیچتے وقت کیل یا وزن سے برابری کا حکم دیا گیا، قیمت کی طرف ادنی التفات بھی نہیں کیا گیا:

”عن ابی سعید الخدری و ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہما أن رسول اللہ

ﷺ استعمال رجلاً علی خیر، فجاءہ بتمر جنیب فقال رسول اللہ ﷺ: اکل تمر خیر هكذا؟ قال: لا والله يا رسول الله! انا لناخذ الصاع من هذا بالصاعين، والصاعين بالثلاثة، فقال رسول اللہ ﷺ: لا تفعل، بع الجميع بالدراهم ثم ابتع بالدراهم جنيباً“ (بخاری: بیوع، باب اذا اراد بيع تمر بتمر خیر منه، رقم: ۲۲۰۲، ۲۲۰۱، مسلم: مساقاة، باب بيع الطعام مثلاً بمثل، رقم: ۱۵۹۳)۔

(حضرت ابو سعید خدریؓ اور حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ایک شخص کو خیر پر عامل بنایا، تو وہ عمدہ کھجوریں لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے، تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا: کیا خیر کی تمام کھجوریں اسی طرح ہوتی ہیں؟ انہوں نے عرض کیا: یا رسول اللہ ایسا نہیں ہے، ہم اس کا ایک صاع دو صاع کے بدلہ میں اور دو صاع تین صاع کے بدلہ میں لیتے ہیں، تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ایسا مت کرنا، سب کو دراہم کے بدلہ بیچو پھر دراہم کے بدلہ عمدہ کھجوریں خرید لو)۔

اس کے علاوہ یہی بات چند احادیث میں صراحت سے آئی ہے:

الف- ”عن أبي سعيد الخدري أن رسول الله ﷺ قال: لا تبيعوا الذهب بالذهب ولا الورق بالورق إلا وزنا بوزن مثلاً بمثل سواء بسواء“ (مسلم: مساقاة، باب الربا، رقم: ۴۰۵۵)۔

(حضرت ابو سعید خدریؓ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: سونے کو سونے سے اور چاندی کو چاندی سے نہ بیچو مگر ہم وزن کر کے مثلیت کے ساتھ برابر برابر)۔

ب- عن أبي هريرة قال: قال رسول الله ﷺ: الذهب بالذهب وزنا

بوزن مثلاً بمثل فمن زاد أو استزاد فهو ربا“ (مسلم: مساقاة، باب الصرف، رقم: ۴۰۶۸)۔

گزشتہ حدیث ہی کے مفہوم میں یہ حدیث بھی ہے:

ج۔ ”عن عبادة بن الصامت أن رسول الله ﷺ قال: الذهب بالذهب تبرها وعينها والفضة بالفضة تبرها وعينها والبر بالبر بمدى بمدى والشعير بالشعير مديا بمدى والتمر بالتمر مديا بمدى والملح بالملح مديا بمدى“ (ابوداؤد: بیوع، باب فی الصرف، رقم: ۳۳۴۹، ترمذی: بیوع، باب ما جاء أن الحنطة مثلا بمثل، رقم: ۱۲۴۰)۔

احادیث واضح ہیں کہ بقدر ممکن حقیقی تماثل مطلوب ہے، اسی لئے فقہاء نے کیلی چیزوں میں وزن اور وزنی چیزوں میں کیلی کا اعتبار نہیں کیا ہے، معنی میں ہیں:

” لا خلاف بين أهل العلم في وجوب المماثلة (إلى) وأن المساواة المرعية هي المساواة في الكيل كيلا وفي الموزون وزنا“ (المعنى ۳/۱۳۳، بیوع، باب الربا والصرف، نیز دیکھئے: بدائع الصنائع ۵/۱۹۳، ۱۹۴)۔

(اہل علم کے درمیان مماثلت کے وجوب کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے (الی) نیز اس بات میں بھی کہ جس برابری کی رعایت کی جائے گی وہ کیلی کر کے کیلی چیزوں میں اور وزن کر کے وزنی چیزوں میں ہوگی)۔

۳۔ جہاں تک قاعدہ ”لا ضرر و لا ضرار“ کا تعلق ہے تو اس کے جواب میں کہا جاسکتا ہے: ”الضرر لا يزال بضرر مثله“ (ضرر کو اسی جیسے ضرر سے زائل نہیں کیا جائے گا)۔  
۴۔ جہاں تک بیع بالتقسط کے جواز پر قیاس کا تعلق ہے تو اس میں ثمن معلوم ہوتی ہے، اور اس میں ثمن مجہول ہے۔

۵۔ جہاں تک امام ابو یوسف کے قول سے استدلال کا تعلق ہے تو اس کے بارے میں مولانا تفتی عثمانی صاحب فرماتے ہیں کہ امام ابو یوسف کے اس فتویٰ کا اشاریہ کے مسئلہ سے کوئی تعلق نہیں ہے، اس لئے کہ اس وقت افراط و تفریط زر نیز اشاریہ جیسے نئے مسائل معیشت کا تصور ہی موجود نہیں تھا، بات دراصل یہ تھی کہ اس وقت فلوس دراہم و دنانیر کے تابع ہوا کرتے تھے، لیکن

فلوس کی یہ قیمت محض علامتی تھی جس کو لوگوں نے ایک اصطلاح بنا لیا تھا، لہذا اگر کبھی دس سکوں کو ایک درہم کے مساوی مانا جاتا ہو تو یہ بھی ممکن تھا کہ کبھی ۲۰ فلوس کو ایک درہم کے مساوی قرار دیا جائے، اس طرح کی صورت حال ہو تو جمہور کے نزدیک سکوں کی اتنی ہی مقدار لوٹائے گا جتنی اس پر عقد کے دن لازم ہوئی تھی، لیکن امام ابو یوسف نے اس مسئلہ میں جمہور سے اختلاف کرتے ہوئے فرمایا: ”اس صورت میں قرض داران سکوں کی قیمت واپس کرے گا جو سکے درہم کی بنیاد پر قرض لئے گئے تھے، لہذا مندرجہ بالا مثال میں اگر کسی شخص نے سو سکے قرض لئے تھے تو اب وہ دو سو سکے واپس کرے گا، اس لئے کہ سکے، تو جس شخص نے سو سکے قرض لئے تھے گویا کہ اس نے دس درہم کی ریزگاری قرض لی تھی اور اب ادائیگی کے روز دس درہم کی ریزگاری دو سو سکے ہو گئی اس لئے قرض دار پر دو سو سکے ادا کرنا واجب ہے (فقہی مقالات ۶۸/۱)۔“

یہی وجہ ہے کہ خاص اسی موضوع پر منعقد ہونے والے سمینار میں جس کو اسلامی ترقیاتی بینک جدہ اور عالمی ادارہ برائے اسلامی اقتصادیات اسلام آباد نے مشترکہ طور سے شعبان ۱۴۰۷ھ میں منعقد کیا تھا، مندرجہ ذیل قرارداد پر تمام شرکاء نے اتفاق کیا:

۱- کرنسی نوٹ تمام معاملات (مثلاً اس میں سود جاری ہونے اور زکوٰۃ واجب ہونے، بیع سلم اور مضاربت اور شرکت وغیرہ کے راس المال بننے) میں نقدین یعنی درہم اور دنانیر کی طرح ہیں، اور امام ابو یوسف کا یہ قول کہ اگر سکوں کی قیمت زیادہ ہو جائے یا کم ہو جائے تو اس صورت میں قرض کی ادائیگی کے وقت نقدین کے تناسب سے سکوں کی قیمت واپس کرنا ضروری ہے، ان کا یہ قول کرنسی نوٹوں میں جاری نہ ہوگا، اس لئے کہ یہ کرنسی نوٹ نقدین کے قائم مقام ہیں اور ان نقدین کی قیمت بڑھنے اور کم ہونے کا معتبر نہ ہونا متفق علیہ ہے۔

۲- سمینار میں حاضر تمام علماء نے توثیق کی کہ سود اور قرض کے احادیث میں جو مثلثیت اور برابری ضروری قرار دی گئی ہے وہ شرعاً جنس اور قدر یعنی وزن ناپ اور عدد میں برابری مراد

ہے، قیمت میں برابری مراد نہیں، اور یہ بات ان احادیث کے ذریعہ پوری طرح واضح ہو جاتی ہے جو احادیث اموال ربویہ کے تبادلہ کے وقت عمدہ اور گھٹیا ہونے کے وصف کو غیر معتبر قرار دیتی ہیں، اور اس پر امت کا اجماع ہے، اور اس پر عمل جاری ہے۔

۳- ذمہ میں ثابت شدہ دیون چاہے وہ کسی بھی قسم کے ہوں، ان کو قیمتوں کے اشاریہ کے ساتھ منسلک کر دینا جائز نہیں ہے، بایں طور کہ عاقدین عقد بیع یا عقد قرض کے وقت اس کرنسی کو جس کے ذریعہ عقد بیع یا عقد قرض کر رہے ہیں کسی سامان کے ساتھ منسلک کر کے یہ شرط ٹھہرائیں کہ دیون ادائیگی کے وقت اس سامان کی قیمت موجودہ کرنسی میں ادا کرے گا (فقہی مقالات ۷۲، ۷۳)۔

### خلاصہ کلام:

یہ کہ دیون یعنی مؤخر مطالبات خواہ وہ قرض ہو یا مہر یا پنشن (جس کی ادائیگی وقت پر نہ ہو سکے اور ذمہ میں رہ جائے) یا ادھار خریداری کی رقم، یا وقت پر ادانہ ہو پانے والی تنخواہوں کی ادائیگی) میں سے کسی کو بھی اشاریہ سے وابستہ کرنا شرعاً درست نہیں ہے، اس لئے کہ اشاریہ سے وابستہ کرنا خاصا پیچیدہ نظام ہے، جس سے عقد میں جہالت ہوگی اور اس کے نتیجہ میں تنازعات ہوں گے، پھر اشاریہ سے وابستہ کرنے کے بعد جتنی مقدار لازم ہوئی یا لی گئی اس سے عدد میں اضافہ کر کے واپسی کرنی ہوگی، جب کہ کیلی، وزنی اور عددی چیزوں میں تفاوت سے واپسی کو منع کیا گیا ہے اور سود قرار دیا گیا ہے۔

البتہ تنخواہ اور پنشن جب قرض نہ بنیں، اور متعاقدین کے درمیان یہ معاہدہ ہو جائے کہ یہ تنخواہ یا پنشن ہر سال قیمتوں کے اشاریہ کے ساتھ بڑھتی رہے گی تو اس کا حکم الگ ہوگا؛ اس لئے کہ سال ختم ہونے کے بعد گویا عقد کی تجدید ہوگی، اور نئی تنخواہ یقینی طور سے فریقین کو معلوم ہو جائے گی، لہذا شرعاً اس میں کوئی حرج نہ ہوگا (فقہی مقالات ۷۲، ۷۳)۔

۲- سونے یا چاندی سے تعین:

مہر کی سونے یا چاندی سے تعین:

جہاں تک مہر کو سونے چاندی سے متعین کرنے یا پہلے روپیوں سے مقرر کر کے بعد میں سونے چاندی سے تبدیلی کرنے کا تعلق ہے تو اس کے جواز میں کوئی کلام نہ ہونا چاہئے، اور اس کے دلائل مندرجہ ذیل ہیں:

۱- مہر میں شرعی احکام کچھ اس طرح کے ہیں کہ اس کو نقدین خاص طور سے چاندی سے جوڑنا ہی پڑتا ہے، اس لئے کہ احناف کے نزدیک اس کی اقل مقدار دس درہم ہے، اب اگر کوئی درہم کے علاوہ سے مہر مقرر کرے جیسا کہ آج کل درہم نہ ہونے کے سبب متعین بات ہے تو دس درہم کا خیال رکھتے ہوئے مقرر کرنا ضروری ہوگا، اس سے کم مقرر کیا تو خود بخود دس درہم یا اس کی مالیت مقرر ہو جائے گی "اقله عشرة دراهم (الی) أو عرضا قيمته عشرة وقت العقد" (الدر المختار ۲/۳۵۷، ۳۵۸، نکاح، باب المہر) (مہر کی کم از کم مقدار دس درہم ہے) (آگے ہے) یا اتنا سامان جس کی قیمت عقد کے وقت دس درہم ہو۔

اسی طرح ایک عام رواج مہر فاطمی پر نکاح کا ہے، اس کی تعین بھی درہم ہی کے ذریعہ انجام پاتی ہے، لہذا معلوم ہوا کہ نقدین خاص طور سے درہم سے مہر کا گہرا ربط ہے، تو اگر کوئی مجلس عقد ہی میں چاندی یا سونے سے تعین کرتا ہے تو گویا وہ اس چیز سے تعین کر رہا ہے جو باب مہر میں اصل کی حیثیت رکھتی ہے، لہذا اس کے صحیح ہونے میں کوئی کلام نہیں۔

اگر مجلس عقد میں روپے سے تعین کی، بعد میں فریقین اسی کی مالیت میں سونا یا چاندی مقرر کر لیتے ہیں تو اس میں بھی کوئی حرج نہ ہوگا، اس لئے کہ جب باہمی رضامندی سے مہر میں حظ و زیادتی جائز ہے، فإن زادها فی المہر بعد العقد لزمته الزیادة (الی) وإن حطت عنه من مہر ما صح الحط (ہدایہ: نکاح، باب المہر ۲/۳۲۵، ط یا سرندیم اینڈ کمپنی دیوبند)۔ اسی طرح

پہلے مہر مقرر نہ کی ہو تو بعد میں باہمی رضامندی سے کسی مقدار کی تعیین جائز ہے: ”وإن تزوجها ولم یسم لها مہراً ثم تراضیا علی تسمیته فہی لها الخ“ (حوالہ سابق)، تو اگر روپے سے طے کرنے کے بعد باہمی سمجھوتے سے چاندی یا سونے کی تعیین کر لی تو بدرجہ اولیٰ جائز ہوگا، بلکہ مہر کے تسمیہ میں راقم کے نزدیک بہتر یہی ہوگا کہ سونے یا چاندی سے تعیین کی جائے تاکہ عورت کو ضرر لاحق نہ ہو، پھر جب یہ تعیین کر لی جائے گی تو سونے یا چاندی کی یہی متعینہ مقدار مہر ہوگی، خواہ اس کی قیمت بعد میں گھٹے یا بڑھے۔

### ثمن کی سونے یا چاندی سے تقدیر:

جہاں تک بیع کے وقت سونے یا چاندی سے ثمن کی تعیین کا تعلق ہے تو اس کو بھی جائز ہونا چاہئے، اس لئے کہ اگر شروع ہی میں یعنی مجلس عقد ہی میں سونے یا چاندی سے ثمن طے کی جاتی ہے، تو اس میں تو سرے سے کوئی قباحت ہی نہیں ہے، اس لئے کہ یہ تو سیدھے سیدھے اصل نقد یعنی سونے یا چاندی سے ثمن کی تعیین ہے تو اس میں بھلا کیا خرابی ہو سکتی ہے، اور اگر بعد میں دونوں باہمی رضامندی سے سونے یا چاندی سے تعیین کرتے ہیں تو اس میں بھی بظاہر کوئی حرج نہیں ہے، اور اس کے دلائل مندرجہ ذیل ہیں:

۱- جہاں تک ممکن ہو مسلمان کے تصرفات کی تصحیح کی کوشش کرنی چاہئے، یہاں بھی اقالہ کے بعد عقد جدید پر محول کر کے جواز ہو سکتا ہے، اس لئے کہ اقالہ کبھی اقتضاء کے طور پر ہوتا ہے، صاحب ہدایہ فرماتے ہیں:

”والفسخ قد یثبت بطریق الاقتضاء کما إذا تبایعا بالف ثم بالف

وخمس مائة“ (ہدایہ مع الفتح: الف، کتاب الصرف ۲۷۲، ۲۷۳، مکتبہ رشیدیہ)۔

(اور فسخ کبھی کبھی اقتضاء ثابت ہوتا ہے جسے فریقین ایک ہزار کے بدلہ پھر ایک ہزار

پانچ سو کے بدلہ بیع کو دیں)۔

۲- شامی کے ایک جزئیہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ثمن میں تبدیلی اور تصرفات کرنا جائز ہے، اور یہ بھی استبدال کی ایک شکل ہے:

”ویصح الاستبدال به فی غیر الصرف والسلام لا فیہما (قولہ ویصح الاستبدال الخ) الأولى أن یقول: ویصح التصرف به قبل قبضہ فی غیر الصرف والسلام، لأن الاستبدال یصح فی بدل الصرف لأنه لا یتعین بالتعین“ (شامی: بیوع، باب الصرف ۲/۲۷۱، ط مکتبہ فیض القرآن دیوبند)۔

(ثمن کا استبدال صرف اور سلم کے علاوہ یہی صحیح ہے نہ کہ ان دونوں میں) مصنف کا قول ویصح الاستبدال الخ بہتر یہ تھا کہ مصنف کہتے: ثمن میں قبضہ سے پہلے تصرف صحیح ہے سوائے صرف اور سلم کے، اس لئے کہ استبدال بدل صرف میں بھی صحیح ہے، اس لئے کہ وہ تعین سے متعین نہیں ہوتا)۔

۳- علامہ شامی نے اپنے رسائل میں ایک طویل بحث کی ہے جس سے ہماری اس شکل کا جواز بھی معلوم ہو رہا ہے، اہل مصر کے ایک عرف کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

”بل یطلقون القروش وقت العقد ویدفعون بمقدار ما سموہ فی العقد تارة من المصارى وتارة من غیرها ذہبا أو فضة فصار القرش عندهم بیانا لمقدار الثمن من النقود الرائجة المختلفة المالیة لا لیان نوعه ولا لیان جنسه (إلی) وقد رأیت بفضل اللہ تعالیٰ فی القینیة نظیر هذا حیث قال فی باب المتعارف بین التجار كالمشروط برمز علاء الدین الترجمانی: باع شیئاً بعشرة دنانیر واستقرت العادة فی ذلك البلد انهم یعطون كل خمسة أسداس مکان الدینار فاشتہرت بینهم فالعقد ینصرف إلی ما یتعارفه الناس فیما بینهم فی تلك التجارة (إلی) فاذا باع شخص سلعة بمائة قرش مثلاً ودفع له



المشتری بعد الرخص ما صارت قيمته تسعين فرشا من الريال أو الذهب مثلا  
لم يحصل للبائع ذلك المقدار الذي قدره ورضى به ثمنا لسلعته“ (رسائل ابن  
عابدین (تسمیہ الرقود) ۶۵/۲، ۶۷)۔

(بلکہ عقد کے وقت قروش کا نام لیتے ہیں اور عقد میں تسمیہ کردہ مقدار کی ادائیگی کبھی  
مصاری سے کرتے ہیں کبھی اس کے علاوہ سونے چاندی سے، تو ان کے یہاں قرض مختلف مالیت  
والے رائج سکوں سے ثمن کی مقدار کی وضاحت کے طور پر ہوتا ہے اس کی نوع اور جنس بیان  
کرنے کے لئے نہیں ہوتا (آگے ہے) اور اللہ کے فضل سے میں نے قدیہ میں اس کی نظیر دیکھی  
ہے؛ چنانچہ باب ”التعارف بین التجار کالمشروط“ میں علاء الدین ترجمانی کی علامت  
سے فرماتے ہیں: کوئی چیز دس دینار کی فروخت کی، اور اس شہر کا عرف یہ قرار پایا ہے کہ وہ ایک  
دینار کی جگہ (۶/۵) پانچ سدس دیتے ہیں اور یہ چیز ان میں شہرت پا چکی ہے تو لوگوں کے  
درمیان اس تجارت میں جو عرف ہو عقد اسی پر منصرف ہوگا (آگے ہے) تو مثلاً اگر کوئی سو قرض  
میں کوئی سامان بیچے اور ارزانی کے بعد مشتری ریال یا سونے سے اتنی مقدار دے جس کی قیمت  
۹۰ قرض ہوگئی ہے تو بائع کو وہ مقدار حاصل نہیں ہوئی جس کو اس نے متعین کیا تھا اور جس سے وہ  
اپنے سامان کی ثمن کے طور پر راضی ہوا تھا)۔

جب عرف کی بنیاد پر قرض بول کر اس سے مخصوص مالیت مراد لی جاسکتی ہے تو بدرجہ اولیٰ  
تصریح کے ساتھ روپیہ بول کر سونا چاندی سے اس کی مالیت بھی مراد لی جاسکتی ہے۔

قرض کو سونے یا چاندی سے مربوط کرنا:

صرف قرض لینے والے مسئلہ میں بظاہر اشکال ہوتا ہے کہ چاندی یا سونے سے مربوط  
کیسے کر سکتے ہیں؟ اس لئے کہ جب دس ہزار قرض لیے تو اب اصل یہ ہے کہ دس ہزار ہی واپس  
کریں، اگر سونے یا چاندی سے مربوط کر کے اس سے واپس کرتے ہیں تو گویا ذوات الامثال

میں مثل کی واپسی پر قدرت کے باوجود غیر مثل سے ادائیگی کرتے ہیں جو ممنوع ہے۔

پھر قرض لے کر اس کو سونے چاندی سے مربوط کرنا گویا روپیوں کی بیع سونا یا چاندی سے کرنا ہے، اوپر گزر چکا ہے کہ روپے نقدین کے حکم میں ہو چکے ہیں تو گویا یہ اموال ربویہ کی..... ایک جنس کی دوسری جنس سے بیع ہے، مسلمہ حکم ہے اس صورت میں تفاضل جائز ہوتا ہے لیکن نسبیہ جائز نہیں ہوتا، ظاہر ہے کہ قرض کی صورت میں یہ نسبیہ لزومی طور پر رہے گا، لہذا قرض کی صورت میں سونے یا چاندی سے مربوط کرنا جائز نہ ہونا چاہئے، اس لئے کہ اس کا تعلق باب ربوا سے ہے اور اس میں احتیاط ہی مناسب ہے۔

### خلاصہ بحث:

۱- دیون یعنی مؤخر مطالبات (خواہ وہ قرض ہو یا مہر یا پنشن) جس کی ادائیگی وقت پر نہ ہو سکی ہو اور ذمہ میں رہ گئی ہو (یا ادھار خریداری کی رقم یا وقت پر ادا نہ ہو پانے والی تنخواہوں کی ادائیگی) میں سے کسی کو بھی اشاریہ سے وابستہ کرنا شرعاً درست نہیں ہے، اس لئے کہ یہ ایک خاصا پیچیدہ نظام ہے جس سے عقد میں جہالت ہوگی اور اس جہالت کے نتیجہ میں تنازعات اٹھ کھڑے ہوں گے، پھر اس نظام سے وابستہ کرنے کے بعد جتنی مقدار لازم ہوگی یا لی گئی اس سے عدد میں اضافہ کر کے واپسی کی جائے گی جو کہ کھلا ہوا سود ہے؛ اس لئے کہ کیلی، وزنی اور عددی چیز میں بالترتیب کیل، وزن اور عدد ہی کا اعتبار ضروری ہے، ان چیزوں میں اشاریہ سے واپسی کی جائے تو یقینی طور پر تفاوت ہو جائے گا۔

۲- مہر کو چاندی یا سونے سے مربوط کرنا جائز نہیں اولیٰ و بہتر ہے، اس لئے کہ مہر کے احکام میں چاندی کی مقدار کی طرف ویسے بھی رجوع کرنا ہی پڑتا ہے، اس لئے کہ کم از کم مہر دس درہم مقرر کی گئی ہے، پھر مہر فاطمی کا عام رواج ہے۔

اور واضح رہے کہ اس کی دو شکلیں ہو سکتی ہیں:

الف۔ مجلس عقد ہی میں سونے یا چاندی کو بطور مہر مقرر کرنا۔

ب۔ پہلے روپے مقرر کر کے بعد میں اس کی تعیین سونے یا چاندی سے کرنا۔ پہلی شکل

کے جواز میں تو کوئی کلام ہی نہیں، دوسری شکل بھی بلاشبہ جائز ہے، اس لئے کہ باہمی رضامندی سے جب کسی پیشی کرنا جائز ہے تو استبدال بدرجہ اولیٰ جائز ہوگا۔

جہاں تک سونے چاندی کو بیع کی ثمن بنانے کا تعلق ہے تو اگر مجلس عقد ہی میں ان کو ثمن

بنالیا تو جواز میں کوئی کلام ہی نہیں ہے، اور اگر پہلے روپے مقرر کر کے بعد میں اس کی مالیت سونے یا چاندی سے مقرر کی تب بھی جائز ہوگا، اس لئے کہ:

الف۔ اس کو اقتضاء فسخ مان کر عقد جدید مانا جاسکتا ہے۔

ب۔ روپے ذکر کر کے مخصوص مقدار کی علامت کے طور پر قرار دیا جاسکتا ہے، جیسا

کہ علامہ شامی نے مصری لوگوں کا عرف ذکر کر کے اس کے جواز کا اشارہ کیا ہے۔ البتہ ثمن یا مہر کو سونے چاندی سے مربوط کرنے کے بعد ادائیگی کے وقت ادائیگی کے دن کی سونے چاندی کی مالیت کا اعتبار لازم ہوگا تا کہ حضرت ابن عمر کی حدیث پر عمل ہو جائے۔

البتہ قرض والے مسئلہ میں بظاہر سونے چاندی سے مربوط کرنا جائز نہ ہوگا، اس لئے کہ

ذوات الامثال میں اصل یہ ہے کہ جہاں تک ممکن ہو مثل حقیقی سے واپسی کی جائے۔

مزید یہ کہ روپیہ جیسا کہ گزر انقدین کے حکم میں ہو چکا ہے، پھر جب اس کو سونے سے

جوڑ رہے ہیں تو گویا روپے سے سونے کی بیع گر رہے ہیں، لہذا اموال ربویہ میں جنس مختلف

ہونے پر تفاضل جائز ہوگا لیکن نسیئہ جائز نہیں ہوگا۔ واللہ اعلم۔

مولانا محمد علی الدین

## موجودہ کرنسی کی شرعی حیثیت

مولانا محمد علی الدین بڑودوی ☆

شمن دو قسم کے ہیں۔ شمن خلتی (سونا چاندی) اور شمن اصطلاحی، یعنی سکے رائج، ہمارے دور میں سکے رائج کاغذی نوٹ ہیں، ایک زمانہ تھا کہ سکے رائج چاندی کے سکے تھے، پھر نوٹ ایجاد ہوئے، ایک عرصہ تک چاندی کے سکے اور نوٹوں کا چلن ایک ساتھ رہا، پھر سکے مفقود ہو گئے اور اب ان سکوں کی جگہ صرف نوٹ ہی کا چلن ہے، سکوں کا تصور بھی نہیں ہے، آج کل کی نسلوں نے وہ سکے دیکھے بھی نہیں ہیں۔

اس لئے پہلے نوٹ کو وثیقہ اور حوالہ کہا جاتا تھا لیکن آج نوٹ مستقل شمن کی حیثیت رکھتے ہیں، جب تک حکومت ان نوٹوں کا چلن بند نہ کر دے، اس وقت تک اس کی شمنیت ختم نہیں ہو سکتی، اگر ہم نوٹ کو شمن تسلیم نہ کریں تو لاکھوں کروڑوں کے نوٹ مال نامی ہونے سے، بلکہ نوٹ کی کوئی قیمت نہیں تو مال متقوم ہونے سے بھی خارج ہو جائیں گے، اور صرف زکوٰۃ ہی نہیں قربانی اور صدقۃ الفطر بھی نوٹوں پر واجب نہ ہوں گے، اور مسائل زکاۃ پر اس کا بہت بڑا اثر ظاہر ہوگا، بہر حال نوٹ اس دور میں مستقل شمن ہیں فقہاء کرام نے اس قسم کے رائج چلن کو اصطلاحی شمن قرار دیا ہے۔

علامہ شامی لکھتے ہیں: "و کذا تعلیہم قول الإمام لبطان البیع، بان الثمنیة

بطلت بالكساد لأن الدراهم التي غلب غشها إنما جعلت ثمننا بالاصطلاح“  
(شامی ۱/ ۵۴ زکریا دیوبند)۔

یعنی وہ سکے جو خالص چاندی یا غالب چاندی کے نہ ہوں جب ان کا چلن بند ہو جائے تو اس کی ثمنیت باطل ہو جائے گی؛ کیوں کہ یہ اصطلاحی ثمن قرار دئے گئے ہیں، جب اس کا چلن نہ رہا اور لوگوں نے اس سے لین دین کا معاملہ ترک کر دیا تو اصطلاح باطل ہو گئی اور ایسے سکے ثمن نہ رہے۔

اس لئے رائج چلن ثمن اصطلاحی ہے، البتہ عبادات مالیہ صدقات و زکاۃ میں یہ ثمن اصطلاحی ثمن خلقی کے ساتھ وابستہ رہے گا؛ کیوں کہ شریعت میں زکوٰۃ کے نصاب کو سونا چاندی (ثمن خلقی) سے مقدر فرمایا گیا ہے، اس لئے زکوٰۃ میں سونا چاندی یا اس کے برابر مالیت کا لحاظ رائج چلن (ثمن اصطلاحی) میں ہوگا۔

معاملات میں ثمن رائج کا مستقل اعتبار ہوگا، عاقدین نے جس ثمن پر عقد کیا ہے وہ متعین رہے گا۔

۱۔ اظاہر ہے کہ اثمان اصطلاحیہ کے اندر اس زمانہ میں جو اتار چڑھاؤ ہو رہا ہے، ایسا نہیں ہے کہ صرف گراوٹ ہی آرہی ہے، بلکہ پاؤنڈ میں گراوٹ آتی ہے تو عمومی طور پر ہتر (۷۳)، چوہتر (۷۴) ہندی روپے تک گرتا ہے، لیکن چند ماہ میں آج کل پچاسی (۸۵)، چھپاسی (۸۶) روپے ہندی کے برابر چڑھاؤ میں پہنچتا ہے، یعنی دس گیارہ کا فرق آجاتا ہے، ویسے تو روزانہ کم و بیش ہوتا رہتا ہے، اسی طرح ڈالر اور یورو کے معیار میں بھی اضافہ اور کمی روزانہ ہوتی رہتی ہے۔

مگر سرکاری ادارے بھی اس قسم کی کمی بیشی کو نظر میں نہیں لاتے، اگر تنخواہوں اور کرایوں کو اس قسم کے اشاریہ سے وابستہ کیا جائے تو تیس دن کی تنخواہ اور کرایہ کا ہر روز کا حساب

جدار کھنا ہوگا اور ہر تیس روز یا دس روز (جس جگہ جیسا رواج ہو) میں تنخواہوں اور کرایوں میں اس قدر کمی بیشی کرنا ہوگا، ظاہر ہے یہ حساب بہت مشکل بلکہ چھوٹے اداروں میں اور دیہاتوں کے لئے ناممکن ہے، بلکہ بڑی پرائیویٹ کمپنیوں کے لئے جہاں سیکڑوں مزدور کام کرتے ہوں ایسا حساب ناممکن ہی نہیں بلکہ تماشہ بن جائے گا۔

تنخواہوں، اجرتوں اور پنشن وغیرہ میں یہ معمول رہا ہے کہ مہنگائی اور افراط زر کے پیش نظر تنخواہوں وغیرہ میں اضافے اور مہنگائی بھتے بڑھتے رہتے ہیں، اس لئے اجارہ کے معاملات کو اشاریہ سے جوڑنے یا سونا چاندی سے وابستہ کرنے کا نظریہ بے سود ہے۔ سونا چاندی کے بھاؤ میں اتار چڑھاؤ ہوتا ہی رہتا ہے؛ اسی لئے دنیا داروں نے بھی اس کو نظر انداز کیا ہے۔

تجارت کے معاملات میں عاقدین نے جو شمن باہم تراضی سے طے کیا ہے، وہ شرعاً متعین ہے اور عاقدین اس کے پابند ہیں۔

طویل المیعاد مؤجل سودوں میں ہماری شریعت میں اس کی گنجائش ہے کہ پہلے سے یہ طے کر لیا جائے کہ نقد ادائیگی کی صورت میں اس شئی کی قیمت مثلاً ایک ہزار ہے، اگر اجل معین سے ہو تو ڈیڑھ ہزار میں یہ چیز طے گی، مشتری ایک شق کو اختیار کر لیتا ہے تو باہمی نزاع کا خدشہ نہیں رہتا اور شمن میں جہالت بھی نہیں رہتی۔

چنانچہ اسلامی بنکوں اور اداروں نے یہ طریقہ اپنایا ہوا ہے اور مفتیان کرام نے اس پر فتاویٰ جاری کئے ہیں، مگر اس کو دنیا داروں نے بنکوں کے سود سے بھی زیادہ نفع خوری کا ذریعہ بنا لیا ہے، یو کے وغیرہ میں سرکاری مارکیٹ (لون) سے بچنے کے لئے یہ طریقہ رائج ہوا تو ایک مکان جو سرکاری مارکیٹ سے دس سالوں میں لون بھرنے کے ساتھ پچیس ہزار میں پڑتا ہے، دینداروں نے اس کی قیمت چالیس ہزار متعین کر کے دس قسطوں پر تقسیم کر دیا، ٹھیک ہے کہ سودی لین دین نہیں ہوا، لیکن مسلمین کے ایک طبقہ سے دولت سمٹ کر دوسرے کے آغوش میں جانے کا ایک حیلہ

وجود میں آگیا، یقیناً یہ جائز طریقہ ہے مگر اس کو غلط طریقہ سے استعمال کیا تو غریبوں کو سودی قرضوں سے بچانے کے لئے جواز کی صورت نکالی گئی وہی غریبوں کے گلے کی ہڈی بن گئی۔

۲- مہر کا مسئلہ تو نبی کریم ﷺ نے اپنی صاحب زادی حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور ازواج مطہرات کا مہر چاندی کی صورت میں ہی مقرر فرمایا ہے، آج کل مہر فاطمی کی تقدیر اسی چاندی کے ذریعہ ہو رہی ہے، اور حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ نے نواۃ ذہب کے عوض نکاح کیا، تو بہت آسان صورت ہے کہ چاندی کی شکل میں ہی مہر کی تعیین ہو۔ مؤجل یا معجل جو تعیین ہو جائے وہ دینا ہے۔ اگر معجل دے دیا پھر بھاؤ میں کمی بیشی ہوئی تو اس کا کیا علاج ہے؟ اگر سونا چاندی خرید لیا پھر بھاؤ بڑھ گیا یا گھٹ گیا آدمی کی اپنی قسمت ہے، مہر مؤجل میں جو مدت ہے اس پر ادا کر دیا، جو بھاؤ ہو مقدر سونا چاندی ادا کرنا ہے، ورنہ آج نکاح ہوا اور ایک تولہ سونا مہر مؤجل مقرر ہوا، دو روز میں سونے کے بھاؤ بڑھ گئے اور بڑھتے چلے گئے جیسے کہ آج کل ہو رہا ہے، اور مہر کا مطالبہ آگیا جو شوہر سمجھتا تھا کہ پانچ ہزار کا ایک تولہ دے دیں گے، اس کے سر پر پندرہ ہزار کا مطالبہ آگیا تو کون سے انصاف کی بات ہوئی؟ اگر نوٹ شمن یا مال مقنوم نہیں ہے تو مہر میں ان کی تقدیر ہی درست نہیں رہے گی حالاں کہ ”ان تبتغوا بأموالکم“ کہا گیا ہے۔

صرف قرض کا معاملہ رہ جاتا ہے۔

## قرض کی شرعی تعریف:

”هو ما تعطيه لتفاضاه و شرعا ما تعطيه من مثلي لتفاضاه، وهو اخصر من قوله، عقد مخصوص، أي بلفظ القرض ونحوه، يرد على دفع مال، بمنزلة الجنس، مثلي، خرج القيمي، لآخر ليرد مثله، خرج نحوه وديعة وهبة، وصح، القرض، في مثلي، هو كل ما يضمن بالمثل عند الاستهلاك، لا في غيره، من

القیامات كحیوان و حطب و عقار و كل متفاوت لتعذر رد المثل“ (در مختار مع الشامی ۳۸۸۷ زکریا دیوبند)۔

لغت میں قرض اس چیز کو کہتے ہیں جو واپس لینے کے لئے دی جائے اور شرعاً اس مثلی شئی کو کہتے ہیں جو واپس لینے کے لئے دی جائے، اس سے زیادہ وضاحت کے ساتھ لفظ قرض وغیرہ سے ایسا مخصوص عقد جو دوسرے شخص کو مثلی مال دینے پر وارد ہوا ہو، تا کہ دوسرا شخص اس مال کا مثل واپس کرے، اور قرض مثلی میں صحیح ہوتا ہے اور غیر مثلی (قیمتی) میں درست نہیں ہوتا۔

مثلی سے وہ اشیاء مراد ہیں جس کے افراد میں زیادہ تفاوت نہ ہو، تعذر رد المثل، قرض کی اس تفصیل کے پیش نظر مثل کی واپسی ہوگی، ظاہر ہمارے زیر بحث مسئلہ میں کاغذی نوٹ مثلی ہیں، اگر نوٹ کی کوئی قیمت نہ ہو جس قدر جیسے کاغذ دئے ہیں اسی قدر اتنے کاغذ واپس کرنے ہیں، اگر نوٹ شمن ہیں (اور شمن ہی ہیں) تو شمن مثلی ہیں قیمتی نہیں رہے کہ قیمت واپس کی جائے اس لئے جس قدر نوٹ دئے اس قدر نوٹ واپس کرنے ہیں۔ اور قرض میں تا جیل مدت جائز نہیں ہیں۔ علامہ شامی فرماتے ہیں:

”لكن قال في الهداية فان تأجيله لا يصح لأنه إعادة وصلة في الابتداء حتى يصح بلفظ الإعادة، ولا يملكه من لا يملك التبرع، وعلى اعتبار الانتهاء لا يصح، لأنه يصير بيع الدراهم بالدراهم نسيئة وهو رباا ومقتضاه أن قوله لا يصح على حقيقته، لأنه إذا وجد فيه مقتضى عدم اللزوم ومقتضى عدم الصحة وكان الأول لا ينافي الثاني، لأن ما لا يصح لا يلزم وجب اعتبار عدم الصحة، ولهذا علل في الفتح لعدم الصحة أيضا بقوله: ولأنه لو لزم كان التبرع ملزما على المتبرع، ثم للمثل المردود حكم العين كأنه رد العين، وإلا كان تمليك دراهم بدراهم بلا قبض في المجلس، والتأجيل في الأعيان لا يصح،



ام ملخصاً، ویؤید ما فی النہر عن القنیۃ التاجیل فی القرض باطل“ (ردالمحتار ۳۸۳ ذکر یاد یوبند)۔

ہدایہ میں فرمایا: قرض کے لئے مدت مقرر کرنا صحیح نہیں ہے کیوں کہ قرض ابتداء اعارہ اور صلہ ہے، چنانچہ لفظ اعارہ سے قرض صحیح ہو جاتا ہے اور جس شخص کو تبرع کا اختیار نہیں ہے وہ قرض دینے کا مختار نہیں ہے جیسے وصی اور بچہ، اور قرض انتہاء معاوضہ ہے، تو ابتداء کا اعتبار کرتے ہوئے تاجیل لازم نہیں ہوتی، جیسے اعارہ میں تاجیل لازم نہیں ہے، کیوں کہ تبرع میں جبر (زبردستی) نہیں ہے، اور انتہاء کے اعتبار سے قرض میں تاجیل صحیح نہیں ہے، کیوں کہ تاجیل کی صورت میں دراہم کو دراہم کے بدلے ادھار بچنا لازم آئے گا، اور یہ ربا ہے اھ۔ اور اس تفصیل کا مقصد یہ ہے کہ ماتن کا لایصح کہنا حقیقت ہے؛ کیوں کہ تاجیل میں عدم لزوم کا اقتضاء بھی ہے اور عدم صحت کا اقتضاء بھی ہے اور پہلا دوسرے کے منافی نہیں ہے، کیوں کہ جو صحیح نہیں ہوتا، تو عدم صحت کا اعتبار ضروری ہو گیا۔

اسی بنا پر فتح میں عدم صحت کی وجہ اس طرح بیان کی ہے، کیوں کہ اگر قرض میں تاجیل لازم ہو جائے تو تبرع تبرع کرنے والے پر لازم ہو جائے گا۔

پھر قرض میں واپس کیا جانے والا مثل عین کے حکم میں ہے، گویا بعینہ لی ہوئی شئی کو واپس کیا، ورنہ دراہم کی دراہم کے عوض تملیک مجلس میں بغیر قبض لازم آئے گی، اور اعیان میں تاجیل صحیح نہیں ہوتی، اھ ملخصاً، اور اس کی تائید قنیہ سے نہر میں جو منقول ہے اسی سے ہوتی ہے، التاجیل فی القرض باطل، تاجیل قرض میں باطل ہے۔

جب قرض میں تاجیل صحیح نہیں ہے تو واجب الاداء نوٹ کی مالیت سونے چاندی میں کس طرح طے ہو سکتی ہے؟ واجب الاداء نوٹ مستقل ثمن ہے تو اس کی قیمت بھی طے نہیں ہو سکتی، کیوں کہ مثل کی واپسی ضروری ہے، اگر نوٹ ثمن نہیں ہے تو اس کی مالیت سونے یا چاندی جیسی

گراں ثمن سے کس معیار سے طے کی جائے گی، اگر نوٹ کو چاندی یا سونے کا بدل مانا جائے تو دو قسم کا صریح ربا لازم آتا ہے، کیوں کہ اس صورت میں یہ بیع صرف ہو جائے گی، اور کمی بیشی جائز نہیں ہو سکتی، اس لئے ربا الفضل لازم آئے گا، اگر ناجیل کرتے ہیں تو ربا النسینہ لازم آئے گا، نیز سونا اور چاندی کی قیمت روزانہ گھٹتی اور بڑھتی رہتی ہے تو قرض دیتے وقت جو مقدار سونا یا چاندی کی طے کی گئی تھی ادائے قرض کے وقت سونا یا چاندی کی قیمت میں کمی بیشی ہو گئی ہے تو یا تو مستقرض کو خسارہ ہو گا یا مقرض کو خسارہ ہو گا، جیسے آج کل سونے کی قیمت میں جو تیزی اور کمی ہو رہی ہے اس سے ظاہر ہے۔

اس لئے نوٹ کو ہم ثمن ہی قرار دیتے ہیں، اور جہاں تک نوٹ میں غلاء و رخص کا معاملہ یعنی مالیت کے اتار چڑھاؤ کا مسئلہ ہے تو صاحب درمختار رائج چلن کے بالکلیہ بند ہو جانے کی صورت میں لکھتے ہیں: "قلت: ومما یكثر وقوعه ما لو اشتری بقطع رائجة فکسدت بضرب جدیدة یجب قیمتها یوم البیع من الذهب لا غیر، إذ لا یمکن للحاکم بمثلها لمنع السلطان منها ولا یدفع قیمتها من الفضة الجديدة لأنها ما لم یغلب غشها فجیدها وردیئها سواء إجماعاً، أما ما غلب غشه ففيها الخلاف کما سیجیء فی فصل القرض، فتنبه وبه أجاب سعدی آفندی وهذا إذا بیع بثمان دین فلو بعین فسد" (درمختار)۔

فرماتے ہیں: کثیر الوقوع مسائل میں سے یہ مسئلہ بھی ہے، اگر رائج چلن سے کوئی شئی خریدی پھر نئے سکوں کی وجہ سے پہلا چلن بند ہو گیا تو بیع کے روز اس بند شدہ چلن کی قیمت کا صرف سونا واجب ہو گا، کیوں کہ حکام کے لئے مثل کا فیصلہ کرنا ممکن نہ رہا، کیوں کہ بادشاہ (حکومت) نے اس قدیم چلن کو ممنوع قرار دے دیا، اور جدید چاندی (سکوں) کے حساب سے قیمت نہیں لگ سکتی؛ کیوں کہ جب تک سکوں میں کھوٹ غالب نہ ہو تو بڑھیا اور گھٹیا بالا جماع

برابر ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ ایسے دراہم جس میں چاندی غالب ہو بیع کے بعد بند ہو جائے تو یوم بیع میں سونے کے حساب سے اس کی قیمت واجب ہوگی، نئے چاندی کے سکوں کے حساب سے قیمت نہیں دی جائے گی؛ کیوں کہ دونوں جانب چاندی ہے، ایک مغلوب الغش ہے دوسری جید ہے تو جید اور ردی بالا جماع برابر ہیں۔

اگر قدیم سکے جو بند ہو گئے وہ غالب الغش ہوں یا فلوس ہو تو اختلاف ہے، اگر سودا فلوس یا غالب الغش سے ہوا ہے اور بائع کو دینے سے پہلے بند ہو گئے، تو امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک بیع باطل ہو جائے گی، اور مشتری پر بیع کو واپس کرنا لازم ہوگا، اگر موجود ہو تو بعینہ بیع واپس کرے، اگر بیع ختم ہو چکی ہو تو اس کا مثل (مثلی ہونے کی صورت میں) یا اس کی قیمت (قیمتی ہونے کی صورت میں) لازم ہوگی، اگر بیع پر مشتری کا قبضہ ہونے سے قبل فلوس یا غالب الغش چلن بند ہو جائے تو اس بیع کا کوئی حکم نہیں ہے یعنی بیع کا عدم سمجھی جائے گی۔

اور صاحبین کے نزدیک بیع باطل نہ ہوگی، کیوں کہ بدل کے بند ہو جانے سے تسلیم بدل (فلوس یا غالب الغش) معتذر ہو چکا ہے، اور تسلیم بدل کا معتذر ہو جانے سے فساد بیع لازم نہیں آتا؛ کیوں کہ دوبارہ چلن کا رائج ہونا محتمل ہے۔

لیکن اس صورت میں حضرت امام ابو یوسف کے نزدیک یوم بیع میں بدل (فلوس یا غالب الغش) کی جو قیمت ہو وہ لازم ہوگی، اور حضرت امام محمد کے نزدیک یوم الکساد میں (یعنی جس دن لوگوں نے اس بدل سے معاملہ ترک کر دیا) جو قیمت تھی اس کا اعتبار ہوگا۔

اور غلاء و رخص کی صورت میں یعنی فلوس کی قیمت گھٹنے بڑھنے کی صورت میں بیع باطل نہ ہوگی بحال رہے گی، اور مشتری کو اختیار نہ ہوگا، مشتری سے اسی معیار سے نقد کا مطالبہ ہوگا جو معیار بیع کے روز تھا، اولاً اس بارے میں امام ابو یوسف اور امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے درمیان کوئی

اختلاف نہیں تھا لیکن بعد میں امام ابو یوسفؒ نے قول اول سے رجوع کر لیا کہ فلوس کی قیمت گر جانے کی صورت میں ان فلوس کی دراہم کے لحاظ سے یوم بیع میں جو قیمت تھی وہ ادا کرنا ہوگی، یا اگر قرض دیا تھا تو قرض پر قبضہ کے دن فلوس کی جو قیمت دراہم کے لحاظ سے تھی وہ ادا کرنی ہوگی۔

وفی الذخيرة من المنتقى إذا غلت الفلوس قبل القبض أو رخصت قال أبو يوسف قولي وقول أبي حنيفة في ذلك سواء وليس له غيرهما ثم رجع أبو يوسف وقال عليه قيمتها من الدراهم يوم وقع البيع ويوم وقع القبض قوله يوم وقع البيع أي في صورة القرض، كما نبه عليه في النهر في باب الصرف۔

وحاصل ما مر أنه على قول أبي يوسف المفتى به لا فرق بين الانقطاع والكساد والرخص والغلاء في أنه تجب قيمتها يوم وقع البيع أو القرض، لا مثلها (رد المحتار ۵۶/۷)۔

پہلے در مختار کی عبارت سے معلوم ہوا کہ اگر بندھ چلن میں چاندی غالب ہو تو اس کی قیمت کا سونا یوم بیع میں لازم ہوگا، اور نئے چاندی کے سکوں سے اس کی قیمت نہیں لگائی جائے گی؛ کیوں کہ جب تک غش غالب نہ ہو چاندی چاندی کے مقابلہ میں ہونے کی وجہ سے گھٹیا اور بڑھیا بالا جماع برابر سمجھے جائیں گے۔

خالص دراہم یا مغلوب الغش دراہم کا چلن اگر بند ہو جائے یا اس کے معیار میں اتار چڑھاؤ ہو جائے تو اس کے بارے میں علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

ولم أر أنه من صرح بحكم الدراهم الخالصة أو المغلوبة الغش سوى

ما أفاده الشارح هنا۔

وينبغي أنه لا خلاف في أنه لا يبطل البيع بكسادها ويجب على

المشتري مثلها في الكساد والانقطاع والرخص والغلاء، أما عدم بطلان البيع

فلانها ثمن خلقه فترك المعاملة بها لا يبطل ثمنيتها فلا يتاتی تعليل البطلان المذكور وهو بقاء البيع بلا ثمن، وأما وجوب مثلها هو ما وقع عليه العقد كماء ذهب مشخص أو مائة ريال فرنجی فلبقاء ثمنيتها أيضا وعدم بطلان تقومها، وتمام بيان ذلك في رسالتنا (تنبيه الرقوم في أحكام النقود) وأما ما ذكره الشارح من أنه تجب قيمتها من الذهب فغير ظاهر لأن مثليتها لم تبطل فكيف يعدل إلى القيمة؟ (شامی ۱/۵۷۷ زکریا)۔

علامہ فرماتے ہیں: دراہم خالصہ اور مغلوب الغش کے حکم کے بارے میں شارح (صاحب درمختار) نے جو کچھ لکھا ہے اس کے سوا کسی نے صراحت کے ساتھ لکھا ہو میرے علم میں نہیں ہے۔

اور لائق ضابطہ یہ ہے کہ اس بارے میں کوئی اختلاف نہ ہونا چاہئے کہ خالص چاندی کے دراہم یا مغلوب الغش کے بند ہو جانے سے بیع باطل نہیں ہوگی، اور مشتری پر ان دراہم کے بند ہو جانے یا ان کے معیار میں اتار چڑھاؤ کی صورت میں مثل واجب ہوگا، بیع کا باطل نہ ہونا اس وجہ سے ہے کہ چاندی خلقۃ ثمن ہے لہذا اس سے معاملہ کا متروک ہو جانا اس کی ثمنیت کو باطل نہیں کرتا ہے؛ اس لئے بیع کے باطل ہونے کی جو وجہ بیان کی گئی ہے کہ ”بیع بلا ثمن کے رہ جائے گی“ یہاں ثابت نہیں ہوتی، اور مشتری پر مثل کا وجوب یعنی جس دراہم پر عقد واجب ہوا ہے ان کے مثل کا وجوب اس لئے ہے کہ ان کی ثمنیت باطل نہیں ہوئی ہے اور ان کا تقوم (قابل قیمت ہونا) باطل نہیں ہوا ہے۔

اور شارح (صاحب درمختار) نے اس صورت میں ان دراہم کی قیمت کے سونے کے وجوب کا جو ذکر کیا ہے وہ غیر ظاہر ہے؛ کیوں کہ دراہم کی ثمنیت باطل نہیں ہوئی ہے تو قیمت کی طرف عدول کیسے ہو سکتا ہے؟ اس تفصیل سے یہ معلوم ہوا کہ رخص وغلاء اور کساد کی صورت میں

بیع کے ثمن میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگی اور وہی دراہم واجب ہوں گے، تو قرض (جس کی بنیادی مثل کے لوٹانے پر ہے اور مثل کو عین کا حکم دیا گیا ہے) میں ثمنیت باقی ہوتے ہوئے قیمت کی طرف رجوع کیسے ہو سکتا ہے جب کہ مروجہ نوٹ ثمن ہیں اور مال مستقوم ہے تو ان کے معاملہ میں سونایا چاندی کی کوئی مقدار کیسے طے ہو سکتی ہے، بالفرض طے بھی کر لیں تو ہمارا مقصد (کہ رخص وغلاء کی صورت میں توازن قائم ہو جائے اور مقرض کو بیجا نقصان سے بچایا جائے) حاصل نہیں ہوتا، کیوں کہ چاندی اور سونے کا معیار بھی ہر روز گھٹتا اور بڑھتا رہتا ہے، ہم نے پانچ ہزار روپے کے بدلہ ایک تولہ سونا مقدر کر دیا، چند ماہ میں سونے کی قیمت میں کئی گنا اضافہ ہو گیا جیسے آج کل ہو رہا ہے، اگر مقرض کو ایک تولہ سونا ادا کیا جاتا ہے تو مقرض کو دس ہزار روپے کا نفع چند دنوں میں حاصل ہو جاتا ہے۔ اور مقرض پر پانچ ہزار کی ادائیگی کے بجائے پندرہ ہزار کی ادائیگی لازم ہو جاتی ہے تو مقرض کا قلیل مدت میں کتنا بڑا نقصان ہو رہا ہے۔

دوسری قباحت یہ ہے کہ مستقرض پر سونا مقدر کر دیا اور قرض میں تا جیل صحیح نہیں ہے، مقرض نے تقاضہ کیا کہ ایک تولہ سونا مقدر لاؤ، ظاہر ہے کہ مقرض نے جب سونے کا بھاؤ چڑھتے دیکھا تو وہ تقاضہ کرے گا کیوں کہ اس کا نفع ہے، اب یہ بیچارہ مقرض جس نے مجبوری کی حالت میں پانچ ہزار روپے لئے اس پر پندرہ ہزار کا مطالبہ دو ماہ میں ہی آگیا، وہ کیسے ادا کر سکتا ہے۔ سودی قرض لیتا تو دو ماہ میں مثلاً اس قدر سود مقرض کو بھی حاصل نہیں ہو سکتا تھا، اور مستقرض پر دو ماہ میں پانچ ہزار کے بجائے پندرہ ہزار نہیں آسکتے تھے۔ تو مقرض کی آغوش میں اتنا عظیم نفع ڈال دینا اور مقرض پر اس قدر بھاری بوجھ ڈال دینا کون سے انصاف کی بات ہے؟ اس لئے دس ہزار روپے دس سال کے بعد بھی بصورت قرض دس ہزار ہی ملیں گے۔

جب شریعت نے قرض میں تا جیل کو صحیح قرار نہیں دیا ہے تو قرض کو مؤجل کرنے کی ضرورت کیا ہے؟ اور اگر فریقین نے مؤجل کر دیا شریعت کو نظر انداز کر دیا تو اب کسی کا نقصان

ہوتا ہے تو اس کا الزام شریعت پر کیوں آئے؟ اور شریعت اس کے حل کی مکلف کیوں ہو؟ رہی یہ بات کہ مقرض کو نقصان ہو رہا ہے تو مستقرض قصداً تاخیر کر رہا ہے تو وہ ظالم ہے عدالت اسکا فیصلہ کرے گی ورنہ آخرت میں ظالم کی نجات نہیں ہے، اور مقرض کو تاخیر پر جو اجر و ثواب کا وعدہ کیا گیا ہے احادیث میں اس اجر عظیم کا تذکرہ ہے، اور اللہ عزوجل نے فرمایا ہے: ”من ذا اللی یقرض اللہ قرضاً حسناً فیضاعفہ لہ اضعافاً کثیراً“۔ یہ آیت کریمہ انفاق فی سبیل اللہ کے بارے میں ہے اور اللہ عزوجل کی راہ میں مال خرچ کر دینے پر یہ بشارت ہے تو عیال اللہ اور مخلوق خدا کے ساتھ قرض حسنہ کی صورت میں برتاؤ بھی اللہ کو قرض دینے کے برابر ہے اور اس آیت کریمہ کا مصداق ہے، تو مقرض کے سامنے صرف دنیوی نفع ہی کیوں رہے اور ہم اس کے دنیوی نقصان کا رونا کیوں روئیں، اس کو سمجھائیں کہ اس کے صبر پر آخرت میں اس کو کس قدر نفع ملنے والا ہے۔ دین دار بھی دنیا داروں کی طرح صرف دنیا کے نفع کو پیش نظر رکھیں، اور دنیا داروں نے سود کی صورت میں جو ظلم عیال اللہ پر روا رکھا ہے ہم بھی فقراء کو شریعت کی دی ہوئی راحتوں کو چھین لینے کا باعث کیوں بنیں، یہ انصاف کی بات نہیں ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

خلاصہ:

موجودہ کرنسی مستقل ٹمن اصطلاحی ہے، نوٹ فلوس کے حکم میں نہیں، جب چاندی کے سکے رائج تھے اور نوٹ بھی تو نوٹ کو وثیقہ کہا جاتا تھا، عصر حاضر میں چاندی کے سکے بالکل مفقود ہیں، نوٹ ٹمن اور مال متقوم ہیں، اگر ان کی کوئی قیمت نہ ہو تو ان کی بنیاد پر نہ زکاۃ واجب ہوگی نہ صدقہ فطر و قربانی واجب ہوگی؛ بلکہ بہ ذریعہ نوٹ مہر کی تقدیر جائز نہ ہوگی، کیونکہ مہر کا مال ہونا ضروری ہے۔

عبادت مالیہ صدقات و زکوٰۃ میں یہ ٹمن اصطلاحی ٹمن خلقی کے ساتھ وابستہ رہے گا؛ کیوں کہ شریعت میں زکاۃ کے نصاب کو سونا چاندی سے مقدر فرمایا ہے۔

۱- معاملات میں ٹمن رانج کا مستقل اعتبار ہوگا، عاقدین نے جس ٹمن پر عقد کیا ہے وہ متعین رہے گا۔ اثمان اصطلاحیہ میں اتار چڑھاؤ روزانہ کی بات ہے، اشاریہ سے وابستہ کرنے میں روزانہ کی تنخواہ وغیرہ کا جدا حساب مشکل بھی ہے، اور نزاع کا باعث بھی ہے، اس لئے اشاریہ سے وابستہ نہیں کیا جاسکتا، ٹمن اصطلاحی مثلی ہے قیمی نہیں ہے، اس لئے اس کی سونا چاندی میں کوئی قیمت طے نہیں کی جاسکتی اور یہ حل بے سود ہے، کیوں کہ خود سونا چاندی کے بھاؤ میں اس قدر اتار چڑھاؤ ہو رہا ہے کہ جس خسارہ سے مقرض کو بچانا مقصود ہے وہ حاصل نہیں ہوتا۔

پانچ ہزار روپے کے بدلے مثلاً ایک تولہ سونا مقرر ہوا، چند ماہ میں سونے کی قیمت میں تین گنا اضافہ ہو گیا، پندرہ ہزار روپے تولہ ہو گیا (آج کل اس سے بھی زیادہ قیمت ہے) تو مقرض کو دو ماہ میں دس ہزار کا نفع ہو گیا، اور مستقرض کے ذمہ پانچ ہزار کی ادائیگی کے بجائے پندرہ ہزار کا سونا آ گیا، کیا یہ انصاف کی بات ہے؟

تنخواہوں میں روزانہ کی کمی بیشی کو اس طرح روزانہ کے سودوں میں بیچ یا ٹمن نے روزانہ کی کمی بیشی کو تاجر بھی نظر میں نہیں لاتے، صبح ایک ٹمن میں سودا ہوا، شام کے وقت بیچ کی قیمت بڑھ گئی یا ٹمن میں گراوٹ آگئی تو نہ وہ سودا کینسل ہوتا ہے اور نہ بیچ و ٹمن میں کمی بیشی ہوتی ہے، تنخواہوں، اجرتوں اور پنشن وغیرہ میں مہنگائی اور افراط زر کے پیش نظر اضافے اور مہنگائی بھتے بڑھتے رہتے ہیں، جس سے خسارہ کی تلانی ہو جاتی ہے۔ مہر خود شریعت میں سونا چاندی سے مقدر ہوا ہے، نبی کریم ﷺ نے اپنی صاحب زادی اور ازواج مطہرات کے مہر چاندی سے اور بعض صحابہ نے سونے سے متعین کئے، اس لئے مہر میں آسان صورت یہ ہے کہ سونا یا چاندی مقدر کیا جائے، پھر بھی سونا چاندی کے بھاؤ میں اتار چڑھاؤ ہوگا ہی، شوہر نے ایک تولہ سونا (پانچ ہزار کا سمجھ کو متعین کیا اور مطالبہ مہر کے وقت ایک تولہ سونا پندرہ ہزار کا ہو گیا تو کیا علاج؟)۔

قرض مثلی چیزوں میں ہی جائز ہے، جب کہ وہ مثلی افراد میں صغرو کبر میں زیادہ تفاوت



نہ ہو، قرض میں مثل کی واپسی ضروری ہے، یہ مثل کی واپسی عین کی واپسی کے حکم میں ہے، اس لئے جس قدر نوٹ دئے ہیں اسی قدر واپس لینے ہیں، نوٹ کی ثمنیت جب تک باطل نہ ہو اس کی قیمت نہیں لگا سکتے۔ اگر تبادلہ ہوگا تو یہ قرض بیع صرف میں تبدیل ہو جائے گا اور کمی بیشی جائز نہ ہوگی۔ صریح ربا لازم آئے گا، قرض میں تا جیل صحیح نہیں ہے، اگر تا جیل ہوئی تو تبادلہ کی صورت میں ربا النسبیہ لازم آئے گا اور بیع بلا قبض فی المجلس لازم آئیگی۔

اس لئے تنخواہ اور مہر کو اشاریہ سے وابستہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے اور مہر و تنخواہ میں مقرر کردہ کرنسی کو چاندی سونا سے مقدر کرنا بے سود بھی ہے اور جائز بھی نہیں ہے، اسی طرح قرض کی رقم کا چاندی سونا سے مقدر کرنا جائز نہیں ہے، اس میں ربا لازم آتا ہے، واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

## دیون کو قیمتوں کے اشاریہ سے وابستہ کرنے کی شرعی حیثیت

مولانا محمد شاہ جہاں ندوی ☆

یقیناً اسلامی اقتصاد پیداوار کی زیادتی اور ذرائع پیداوار کی تقسیم میں عدل و انصاف کا اہتمام کرتا ہے، نیز خرچ کرنے میں راہ اعتدال اختیار کرنے پر زور دیتا ہے، اسی کے ساتھ ساتھ ان اسباب و وسائل کی روک تھام کرتا ہے، جو دام کی گرانی کا ذریعہ بنتے ہیں، چنانچہ اسی بنا پر اس نے بیع کی بعض صورتوں کو ممنوع قرار دیا ہے، الغرض اسلام انسانیت پر ہونے والے ظلم و ستم کے طریقوں کو مسدود کرتا ہے، چنانچہ اسلامی نقطہ نظر سے حکومت کی ذمہ داری بنتی ہے کہ افراط زر پر کنٹرول رکھے۔

ابن القیم تحریر کرتے ہیں:

”فان الدراهم والدنانیر اثمان المبیعات، والٹمن هو المعیار الذی به يعرف تقویم الأموال، فیجب أن یکون محدوداً مضبوطاً، لا یرتفع ولا ینخفض، إذ لو کان الثمن یرتفع، وینخفض کالسلع، لم یکن لنا ثمن نعتبر به المبیعات، بل الجمیع سلع، وحاجة الناس إلی ثمن، یعتبرون به المبیعات، حاجة ضرورية عامة، وذلك لا یمکن إلا بسعر تعرف به القيمة، وذلك لا یمکن إلا بٹمن، تقوم به الأشياء، ویستمر علی حالة واحدة، ولا یقوم هو بغيره۔“

☆ جامعہ اسلامیہ شانٹا پورم، مالا پورم، کیرالہ۔

إذ يصير سلعة، يرتفع وينخفض، فتفسد معاملات الناس، ويقع الخلف، ويشتد الضرر،، الى أن قال رحمه الله: "فالأثمان لا تقصد لأعيانها، بل يقصد التوصل بها إلى السلع، فإذا صارت في أنفسها سلعة تقصد لأعيانها، فسد أمر الناس، وهذا معنى معقول يختص بالنقود، لا يتعدى إلى سائر الموزونات" (اعلام الموقعين: آراء العلماء في تعليل ربا الفضل، فصل في ربا الفضل، والحكمة في تحريمه ۱۵۶/۲، ط: دار الجليل، بيروت ۱۹۷۳ء)۔

( کیونکہ درہم و دینار بیع کے ثمن ہیں، اور ثمن ہی وہ کسوٹی ہے جس کے ذریعہ اموال کی قیمت جانی جاتی ہے، لہذا لازم ہے کہ ثمن متعین اور منضبط ہو، اس میں اتار چڑھاؤ نہ ہو، کیونکہ اگر سامان کی طرح ثمن میں بھی اتار چڑھاؤ ہونے لگے، تو ہمارے پاس کوئی ایسا ثمن نہ رہے گا، جس کے ذریعہ ہم بیع کا اعتبار کر سکیں، بلکہ سب سامان بن جائے گا، اور لوگوں کے لئے ایسے ثمن کی ضرورت جس سے بیع کا اندازہ کر سکیں، عمومی ہے، اور ایسا ایسے ہی ثمن سے ممکن ہے جس سے قیمت معلوم ہو سکے، اور ایسا ایسے ثمن سے ہی ہوگا، جس سے اشیاء کی قیمت لگائی جاسکے، اور ایک ہی حالت پر برقرار رہے اور اس کی قیمت دوسری شے سے نہ لگائی جائے، کیونکہ ایسی صورت میں ثمن بھی سامان بن جائے گا، جس میں اتار چڑھاؤ ہوگا، چنانچہ لوگوں کے معاملات بگڑ جائیں گے، اور محال لازم آئے گا، اور ضرر عظیم واقع ہوگا، آگے ابن قیم نے تحریر فرمایا ہے: چنانچہ ثمن بذات خود مقصود نہیں ہوتے ہیں، بلکہ اس کے ذریعہ سامان تک رسائی حاصل کرنے کا قصد کیا جاتا ہے، تو اگر ثمن بھی ایسا سامان بن جائے جو بذات خود مقصود ہو، تو لوگوں کے معاملات بگڑ جائیں گے، اور یہ ایک ایسا معقول سبب ہے جو سکے کے ساتھ خاص ہے، دیگر وزنی چیزوں کی طرف اس کا تعدیہ نہیں)۔

اسی طرح یہ حکومت کی ذمہ داری بنتی ہے کہ جعل سازوں کے خلاف سخت قدم اٹھائے،

تاکہ افراط زر پر قابو رہے، وشریعی تحریر کرتے ہیں:

”ولا يغفل النظر إن ظهر في سوقهم دراهم مبهرجة مخلوطة  
بالنحاس، بأن يشتد فيها، ويبحث عمن أحدثها، فإذا ظفر به، أناله من شدة  
العقوبة، وأمر أن يطاف به الأسواق لينكله، ويشرد به من خلفه“ (المعيار العرب لابن العباس  
الوشریسی تحت عنوان: ما سبب علی الوالی أن يفعلہ اذاء مرتکبی التزویر فی العقود ۶/۷۰، ط: دار الغرب الاسلامی بیروت)۔

(اور حاکم نظر انداز نہ کرے، اگر لوگوں کے بازار میں کھوٹے سکے ظاہر ہوں، جس میں  
تانے کی آمیزش ہو، اس طرح کہ اس معاملہ میں سختی کرے، اور اسے وجود میں لینے والے کے  
بارے میں تفتیش کرے، اور اگر اسے پالے، تو سخت سزا دے، اور اسے بازار میں گھمانے کا حکم  
دے، تاکہ اسے عبرت بنا دے، اور جو اس کے پیچھے ہیں ان کو بھی تتر بتر کر دے)۔

اس تمہید کے بعد سوالات کے جوابات تحریر کئے جاتے ہیں:

۱- کاغذی نوٹوں اور معدنی سکوں کی حیثیت ثمن عرفی، اصطلاحی اور رسمی کی ہے، اور  
ہصل یہ ہے کہ یہ کاغذی نوٹ مثلی ہیں، لہذا شرعاً یہ صحیح نہیں ہے کہ دیون یعنی مؤخر مطالبوں مثلاً  
قرض، مہر، پنشن، ادھار خریداری کی رقم اور وقت پر ادانہ ہونے والی تنخواہوں کی ادائیگی کو قیمتوں  
کے اشاریہ سے وابستہ کر دیا جائے، کیونکہ دیون کی ادائیگی میں مثل کا اعتبار ہے، اور قیمت کا  
اعتبار نہیں ہے۔

علامہ کاسانی تحریر کرتے ہیں:

”ولو لم تكسد، ولكنها رخصت قيمتها أو غلت، لا يفسخ البيع  
بالاجماع، وعلى المشتري أن ينقد مثلها، ولا يلتفت إلى القيمة ههنا، لأن  
الرخص أو الغلاء لا يوجب بطلان الثمنية“ (بدائع الصنائع: کتاب البیوع، فصل، وأما حکم البیع  
۲۲۲/۵، ط: دار الکتب العلمیہ، بیروت، الطبعة الثانیہ ۱۹۸۶ء)۔

(اور اگر ملک سے فلوس کے ساتھ تعامل بند نہ ہو، لیکن اس کی قیمت میں ارزانی یا گرانی

آجائے، تو بالاتفاق بیع فسخ نہ ہوگی، اور مشتری پر لازم ہوگا کہ اس کے مثل فلوس دے دے، اور اس جگہ قیمت کی طرف التفات نہ ہوگا، کیونکہ ارزانی یا گرانی ثمنیت کے بطلان کو ثابت نہیں کرتی ہے۔

ایک دوسری جگہ تحریر کرتے ہیں: ”ولو لم تکسد، ولکنها رخصت او غلت فعليه رد مثل ما قبض بلا خلاف“ (بدائع الصنائع ۵/۲۴۲) (اور اگر فلوس کے ساتھ تعامل ملک میں بند نہ ہو، لیکن اس میں ارزانی یا گرانی آجائے تو اس پر بغیر کسی اختلاف کے قبضہ کردہ فلوس کے مثل لوٹانا لازم ہے)۔

عناویہ میں ہے:

”إذا استقرض فلوساً، فكسدت، يجب عليه رد مثلها عند أبي حنيفة لأنه أي استقرض المثلي اعارة كما أن اعارته قرض، وموجب استقرض المثلي رد عينه معني، وبالنظر الي كونه عارية، يجب رد عينه حقيقة، لكن لما كان قرضاً، والانتفاع به انما يكون باتلاف عينه، فإت رد عينه حقيقة، فيجب رد عينه معني، وهو المثل، ويجعل بمعني العين حقيقة، لأنه لو لم يجعل كذلك، لزم مبادلة الشيء بجنسه نسيئة، وهو لا يجوز“ (العناویہ شرح الہدایہ، کتاب الصرف ۱۰/۳۳، من المکتبۃ الشامیۃ)۔

(اگر فلوس قرض لے، پھر ان کے ساتھ تعامل ملک سے بند ہو جائے تو اس پر امام ابوحنیفہ کے نزدیک اسی کے مثل لوٹانا واجب ہے، کیونکہ مثلی کو قرض لینا عاریت ہے، جیسا کہ مثلی کو عاریتاً دینا قرض ہے، اور مثلی کو قرض لینے کا تقاضا معنوی اعتبار سے بعینہ اسی کو لوٹانا ہے، لیکن چونکہ وہ قرض ہے، اور اس سے فائدہ اٹھانا اس کی ذات کو ختم کر کے ہوگا، لہذا حقیقت کے اعتبار سے بعینہ اس کو لوٹانا فوت ہو گیا، اس لئے معنوی اعتبار سے اس کی ذات کو لوٹانا واجب ہوگا، اور

وہ مثل ہے، اور اسے حقیقت کے اعتبار سے اس شے کے معنی میں قرار دیا جائے گا، کیونکہ اگر ایسا نہیں کیا گیا تو شے کا اپنی جنس کے ساتھ ادھار تبادلہ لازم آئے گا، اور یہ جائز نہیں ہے۔

اور ”بدائع“ میں ہے:

”ولو استقرض فلوساً، فكسدت، فعليه مثلها عند أبي حنيفة وعند أبي يوسف ومحمد رحمهما الله - عليه قيمتها، وجه قولهما أن الواجب في باب القرض، رد مثل المقبوض، وقد عجز عن ذلك؛ لأن المقبوض كان ثمناً، وقد بطلت الثمنية بالكساد، فعجز عن رد المثل، فيلزمه رد القيمة، كما لو استقرض رطباً، فانقطع عن أيدي الناس أنه يلزمه قيمته، لما قلنا، كذا هذا، ولأبي حنيفة أن رد المثل كان واجباً، والفائت بالكساد، ليس إلا وصف الثمنية، وهذا وصف لا تعلق لجواز القرض به، ألا ترى أنه يجوز استقراضه بعد الكساد ابتداءً وإن خرج من كونه ثمناً، فلأن يجوز بقاء القرض فيه أولى، لأن البقاء أسهل، وكذلك الجواب في الدراهم التي يغلب عليها الغش، لأنها في حكم الفلوس“ (بدائع الصنائع: كتاب القرض ۷/۳۹۵)۔

(اور اگر فلوس قرض لیے، پھر ملک سے ان کا رواج بند ہو گیا، تو اس پر اسی کے مثل فلوس امام ابوحنیفہ کے نزدیک لازم ہیں، اور صاحبین کے نزدیک اس پر ان فلوس کی قیمت لازم ہے، صاحبین کے قول کی دلیل یہ ہے کہ باب قرض میں قبضہ کردہ شے کے مثل لوٹانا واجب ہے، اور وہ مثل لوٹانے سے عاجز ہو چکا ہے، کیونکہ قبضہ کردہ فلوس شمن تھے اور رواج بند ہونے سے ان کی ثمنیت باطل ہو چکی ہے، چنانچہ وہ مثل لوٹانے سے عاجز ہو گیا، لہذا اس پر قیمت لوٹانا واجب ہے، جیسے پختہ کجور قرض لے، پھر وہ لوگوں کے ہاتھ سے ناپید ہو جائے، تو اس پر اس کی قیمت لازم ہے، اس دلیل سے جو ابھی ہم نے بیان کی، ایسے ہی یہاں بھی قیمت لازم ہوگی، اور امام ابوحنیفہ

کی دلیل یہ ہے کہ مثل کا لوٹانا واجب تھا، اور رواج بند ہونے سے صرف ثمنیت کی صفت فوت ہوئی، اور یہ ایسی صفت ہے کہ قرض کے جواز کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے، کیا تم دیکھتے نہیں کہ رواج بند ہونے کے بعد بھی ابتداءً فلوس کا قرض لینا جائز ہے، اگرچہ ثمن ہونے سے نکل جائے، تو ان میں قرض کے باقی رہنے کا جواز بدرجہ اولیٰ ہوگا، کیونکہ ابتداءً کے مقابلہ میں بقا آسان ہے، اور یہی جواب ہے ان دراہم کے سلسلہ میں جن پر کھوٹ غالب ہو، کیونکہ وہ فلوس کے حکم میں ہیں۔

اور ہدایہ میں ہے:

”ولو استقرض فلوساً نافقة، فكسدت عند أبي حنيفة يجب عليه مثلها، لأنه إعارة وموجه رد العين معنى، والثنوية فضل فيه، إذ القرض لا يختص به، وعندهما تجب قيمتها؛ لأنه لما بطل وصف الثمنية، تعذر ردها، كما قبض، فيجب رد قيمتها، كما إذا استقرض مثلياً، فانقطع، لكن عند أبي يوسف يوم القبض، وعند محمد يوم الكساد، على ما مر من قبل، وأصل الاختلاف فيمن غصب مثلياً فانقطع وقول محمد انظر للجانبين، وقول أبي يوسف أيسر“ (الهداية شرح بداية المبتدي لابی الحسن علی بن ابی بکر الرشدانی المرغینانی (۵۹۳ھ): کتاب الصرف ۸۵۳، ط: دار احیاء التراث العربی، بیروت)۔

(اور اگر رواج پذیر فلوس قرض لیے، پھر ملک سے ان کا رواج بند ہو گیا، تو امام ابوحنیفہ کے نزدیک ان کا مثل اس پر لازم ہے، اس لئے کہ یہ اعارہ ہے اور اس کا تقاضا معنوی اعتبار سے بعینہ اسی شی کو لوٹانا ہے، اور ثمنیت اس میں وصف زائد ہے، کیونکہ قرض ثمن کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، اور صاحبین کے نزدیک ان کی قیمت واجب ہے، کیونکہ جب ثمنیت کا وصف باطل ہو گیا، تو ان کو اس حالت میں لوٹانا دشوار ہو گیا، جس حالت میں اس نے قبضہ کیا تھا، لہذا ان کی قیمت کو

لوٹانا واجب ہے، جیسے مثلی سامان قرض لے، اور وہ بازار سے ناپید ہو جائے، لیکن امام ابو یوسف کے نزدیک قبضہ کے دن کی قیمت کا اعتبار ہے، اور امام محمد کے نزدیک رواج بند ہونے کے دن کی قیمت کا اعتبار ہے، جیسا کہ پہلے گزرا، اور اصل اختلاف اس شخص کے بارے میں ہے، جس نے مثلی سامان غصب کیا، پھر وہ بازار سے ناپید ہو گیا، اور امام محمد کے قول میں دونوں فریق کی رعایت ہے، اور امام ابو یوسف کا قول آسان ہے۔

اور عنایہ میں ہے:

”ولا شك أن قيمة يوم القبض أكثر من قيمة يوم الانقطاع، وهو ضرر بالمستقرض، فكان قول محمد انظر للجانبين، وقول أبي يوسف أيسر، لأن قيمته يوم القبض معلومة للمقرض والمستقرض، وسائر الناس، وقيمة يوم الانقطاع تشبه على الناس، ويختلفون فيها، فكان قوله أيسر“ (العنايہ ۲۷۶/۲۸۰)۔

(اس میں کوئی شک نہیں کہ قبضہ کے دن کی قیمت بازار سے ناپید ہونے کے دن کی قیمت سے زیادہ ہے اور اس میں مدیون کا نقصان ہے، لہذا امام محمد کے قول میں فریقین کی رعایت ہے) (قرض خواہ کی رعایت یہ ہے کہ اس کو مثل نہ مل کر قیمت مل رہی ہے اور مدیون کی رعایت اس طرح ہے کہ اسے بازار سے ناپید ہونے یا ملک سے رواج کے بند ہونے کے آخری دن کی قیمت دینی ہوگی، جو کہ کم ہے) اور امام ابو یوسف کا قول آسان ہے، کیونکہ قبضہ کے دن کی قیمت قرض دینے اور لینے والے اور تمام لوگوں کو معلوم ہے، اور بازار سے ناپید ہونے کے دن کی قیمت لوگوں پر مشتبہ ہو جاتی ہے، اور اس کے بارے میں لوگوں کا اختلاف ہو جاتا ہے، لہذا ان کا قول آسان ہوا۔

علامہ شامی تحریر کرتے ہیں:

”قال في الولوالجية في الفصل الخامس من كتاب البيوع: رجل



اشتری ثوباً بدراهم نقد البلدة، فلم ينقدها، حتى تغيرت، فهذا على وجهين: إن كانت تلك الدراهم لا تروج اليوم في السوق أصلاً، فسد البيع، لأنه لم يهلك، وليس له إلا ذلك، وإن انقطع بحيث لا يقدر عليها، فعليه قيمتها في آخر يوم، انقطع، من الذهب والفضة، هو المختار: ونظير هذا ما نص في كتاب الصرف: إذا اشترى شيئاً بالفلوس ثم كسدت قبل القبض، بطل الشراء، يعني فسد، ولو رجعت لا يفسد“ (تنبيه الرقود على مسائل النقود لابن عابد بن ۵۸)۔

(”الولواجية“ کی کتاب البیوع کی پانچویں فصل کی تحریر ہے کہ ایک شخص نے شہر میں رائج درہم کے بدلہ کپڑا خریدا، اور اسے ادا نہیں کیا، یہاں تک کہ اس میں تغیر واقع ہو گیا، تو اس کی دو صورتیں ہیں:

۱- اگر وہ درہم بازار میں بالکل رائج نہ ہوں، تو بیع فاسد ہو جائے گی، اس لئے کہ ثمن ہلاک ہو گیا۔

۲- اور اگر رائج ہوں لیکن اس کی قیمت میں گراوٹ آگئی ہو، تو بیع فاسد نہ ہوگی، اس لئے کہ ثمن ہلاک نہیں ہوا، اور اسے وہی درہم ملیں گے، اور اگر درہم بازار سے ناپید ہو جائے، اس طرح کہ اس پر اسے قدرت نہ ہو، تو اس پر ناپید ہونے کے آخری دن کی اس کی قیمت سونے اور چاندی سے لازم ہوگی، یہی مختار ہے، اور اس کی نظیر وہ ہے جس کی صراحت ”کتاب الصرف“ میں کی ہے کہ کسی نے کوئی چیز فلوس کے ذریعہ خریدا، پھر قبضہ سے پہلے ان کا رواج بند ہو گیا، تو بیع باطل یعنی فاسد ہوگئی، اور اگر قیمت میں گراوٹ آجائے، تو بیع فاسد نہ ہوگی)۔

دوسری جگہ تحریر کرتے ہیں:

”فی الخلاصة والبزازیة: غلت الفلوس او رخصت، فعند الامام الاول والثانی اولاً، لیس علیہ غیرها، وقال الثانی: ثانياً: علیہ قيمتها في يوم البيع

والقبض، وعلیہ الفتوی، انتہی، ای یوم البیع فی البیع، ویوم القبض فی القبض، کذا فی النہر“ (تنبیہ الرقود ۶۳) خلاصہ اور بزازیہ میں ہے کہ فلوس میں گرائی یا ارزانی آجائے، تو امام ابوحنیفہ اور پہلے قول کے مطابق امام ابو یوسف کے نزدیک اس پر ان فلوس کے علاوہ لازم نہیں، اور امام ابو یوسف کا دوسرا قول یہ ہے کہ اس پر ان فلوس کی بیع اور قبضہ کے دن کی قیمت لازم ہے، اور اسی پر فتویٰ ہے، خلاصہ اور بزازیہ کی عبارت ختم ہوئی، یعنی بیع کی بیع کے دن کی قیمت کا اعتبار ہے، اور قرض میں قبضہ کے دن کی قیمت کا اعتبار ہے، ایسے ہی ”النہر الفائق“ میں ہے۔

اور ایک جگہ تحریر کرتے ہیں:

”اور علامہ شیخ الاسلام محمد بن عبداللہ التمر تاشی نے ایک رسالہ میں جس کا نام ”بذل المحمودنی مسألتہ تغیر النقود“ رکھا ہے یہ ذکر کیا ہے کہ جان لو! کہ اگر کسی نے ایسے دراہم سے خریدا، جن پر کھوٹ غالب ہو، یا فلوس کے ذریعہ خریدا اور دونوں میں سے ہر ایک رائج ہوں، یہاں تک کہ بیع جائز ہو، ان کی شمیت کی اصطلاح قائم ہونے کی وجہ سے، اور ان کے ثمن کے ساتھ لاحق ہونے کی وجہ سے، اشارہ کی ضرورت نہ ہونے کی بنا پر، اور مشتری نے ان کو بائع کے حوالہ نہیں کیا، پھر ان کا رواج بند ہو گیا، تو بیع باطل ہو جائے گی، اور لوگوں کے ہاتھوں سے ناپید ہونا رواج بند ہونے کی طرح ہے، اور دراہم کا حکم بھی ایسے ہی ہے، چنانچہ اگر دراہم سے خریدے پھر ان کا رواج بند ہو جائے، یا ناپید ہو جائے، تو بیع باطل ہو جائے گی، اور مشتری پر واجب ہوگا کہ بیع کو لوٹادے اگر موجود ہو اور اس کا مثل لوٹادے اگر بیع ہلاک ہو جائے، اور وہ مثلی ہو، ورنہ قیمت لوٹادے، اور اگر بیع پر قبضہ نہ ہو، تو اس بیع کا بالکل کوئی حکم نہیں، اور یہ امام اعظم کے نزدیک ہے، اور صاحبین کا کہنا ہے کہ بیع باطل نہ ہوگی، کیونکہ دشوار رواج بند ہونے کے بعد ثمن کا حوالہ کرنا ہے، اور یہ فساد کو ثابت نہیں کرتا ہے، کیونکہ دوبارہ رواج پذیر ہونے کے ذریعہ دشواری کے زوال

کا امکان ہے، جیسے اگر کسی نے کوئی شی پختہ کھجور کے بدلہ خریدی، پھر وہ ناپید ہوگئی، اور جب بیع باطل نہیں ہوئی، اور ثمن کا حوالہ کرنا دشوار ہو گیا، تو اس کی قیمت واجب ہوگی، لیکن ابو یوسف کے نزدیک بیع کے دن کی قیمت واجب ہوگی، اور امام محمد کے نزدیک رواج بند ہونے کے دن کی قیمت واجب ہوگی، یعنی اس آخری دن کی قیمت جس میں لوگوں نے اس کے ساتھ تعامل کیا، اور ”ذخیرہ“ میں ہے کہ فتویٰ امام ابو یوسف کے قول پر ہے، اور ”الحیط“، اور ”التمتہ“ اور الحقائق میں ہے کہ لوگوں پر زمی کی خاطر امام محمد کے قول پر فتویٰ دیا جائے گا“ (تنبیہ الرقود ۵۸-۵۹)۔

ایک جگہ تحریر کرتے ہیں: ”وقال أبو یوسف: يجب عليه قيمة النقد الذي وقع عليه العقد من النقد الآخر يوم التعامل، وقال محمد: يجب آخر ما انقطع من أیدی الناس قال القاضي: الفتوى في المهر والقرض على قول أبي یوسف، وفيما سوى ذلك على قول أبي حنيفة“ (تنبیہ الرقود ۵۸، نیز دیکھئے: ص ۵۹-۶۰) اور امام ابو یوسف کا قول ہے کہ اس پر دوسرے سکہ سے معاملہ کے دن کی اس سکہ کی قیمت واجب ہے جس پر عقد ہوا ہے، اور امام محمد کہتے ہیں کہ لوگوں کے ہاتھ سے ناپید ہونے کے آخری دن کی قیمت واجب ہے، قاضی کا کہنا ہے کہ مہر اور قرض میں فتویٰ ابو یوسف کے قول پر ہے، اور اس کے علاوہ امور میں فتویٰ امام صاحب کے قول پر ہے۔

”کفایہ“ میں ہے: ”وفی فتاویٰ قاضیخان قال محمد: قیمتھا فی آخر یوم کانت رائجة، وعلیه الفتوی“ (الکفایہ ۶/۲۸۰) (فتاویٰ قاضی خان میں ہے کہ امام محمد کا قول ہے کہ رواج کے آخری دن کے فلوس کی قیمت واجب ہے، اور اسی پر فتویٰ ہے)۔

علامہ شامی تحریر کرتے ہیں:

”قال الامام الاسیجانی فی شرح الطحاوی: ”وأجمعوا أن الفلوس إذا لم تکسد، ولكن غلب قیمتھا أو رخصت فعليه مثل ما قبض من العدد“ (تنبیہ الرقود ۶۲)۔

(امام اسبیجانی نے طحاوی کی شرح میں لکھا ہے کہ فقہاء کا اتفاق ہے کہ فلوس کا رواج اگر بند نہ ہو، لیکن اس کی قیمت میں گرانی یا ارزانی آجائے، تو جس تعداد پر اس نے قبضہ کیا ہے اسی کے مثل اس پر لوٹانا واجب ہے۔

ایک دوسری جگہ تحریر کرتے ہیں:

”اور اس سے معلوم ہوا کہ انقطاع میں دو قول ہیں: (۱) بیع کا فاسد ہونا جیسا کہ کساد کی صورت میں ہے، (۲) اور دوسرا قول یہ ہے کہ ناپید ہونے والے سکہ کی قیمت بازار سے ناپید ہونے کے آخری دن کی قیمت کے لحاظ سے واجب ہوگی، اور یہی مختار ہے، جیسا کہ مضمرات سے گزرا، اور ایسے ہی ارزانی و گرانی کے بارے میں بھی دو قول ہیں: پہلا قول یہ ہے کہ اسے اس کے علاوہ نہیں ملے گا، اور دوسرا قول یہ ہے کہ اسے بیع کے دن کی اس کی قیمت ملے گی، اور اسی پر فتویٰ ہے، جیسا کہ عنقریب آرہا ہے، علامہ غزی نے سابق عبارت کے بعد تحریر کیا ہے کہ یہ حکم اس حالت میں ہے جب کہ کساد یا انقطاع ہو، رہا جبکہ اس کی قیمت میں گرانی یا کمی آجائے تو بیع اپنی حالت پر رہے گی، اور مشتری کو اختیار نہیں ہوگا، اور اس سے اسی ویلو کے سکہ کا مطالبہ کیا جائے گا، جو بیع کے وقت تھا، اسی طرح ”فتح القدر“ میں ہے“ (تنبیہ الرقود ۶۰، نیز دیکھئے: ص ۶۳)۔

ان عبارتوں سے درج ذیل نتائج حاصل ہوتے ہیں:

- ۱۔ فقہاء احناف کا اس بات پر اتفاق ہے کہ ذمہ میں ثابت ہونے والے سونا یا چاندی کے سکے اپنے مثل کے ساتھ ادا کئے جائیں گے، ان میں قیمت کی تبدیلی کا اعتبار نہ ہوگا۔
- ۲۔ فلوس اور ان دراہم کے بارے میں جن میں کھوٹ غالب ہو تین حالات میں

اختلاف ہے:

الف۔ کساد (پورے ملک میں اس کا رواج بند ہو جائے، اور اس کے ذریعہ معاملہ

متروک ہو جائے)۔

ب- انقطاع (بازار سے ناپید ہو جائے)۔

ج- قیمت میں تغیر ہو جائے۔

۳- امام صاحب کے نزدیک ان تمام حالات میں مثل واجب ہے۔

۴- امام ابو یوسف ان تمام حالات میں حق کے ثابت ہونے کے دن کی قیمت کے

وجوب کے قائل ہیں، جبکہ پہلے وہ قیمت کے متغیر ہونے کی حالت میں امام صاحب کی رائے کے موافق تھے۔

۵- امام محمد قیمت متغیر ہونے کی حالت میں امام صاحب کی رائے کے موافق ہیں،

لیکن کساد اور انقطاع کی حالت میں کساد یا انقطاع کے آخری دن کی قیمت کے وجوب کے قائل ہیں۔

۶- مفتی بہ قول کے سلسلہ میں اختلاف ہے:

الف- بعض نے امام صاحب کی رائے کے بارے میں لکھا ہے کہ اس پر مذہب

کا اجماع ہے۔

ب- بعض نے صاحبین میں سے ایک کی رائے پر فتویٰ دیا ہے۔

ج- بعض نے کساد اور انقطاع میں فرق کیا ہے۔

د- بعض نے مہر اور قرض کے سلسلہ میں امام ابو یوسف کی رائے کو اختیار کیا ہے، اور

دیگر حقوق میں امام صاحب کے قول کو مفتی بہ قرار دیا ہے۔

امام ابو یوسف کے مسلک کے اعتبار سے بھی دیون کو قیمتوں کے اشاریہ سے وابستہ کرنا

صحیح نہیں ہے؛ کیونکہ ماہرین معاشیات افراط زر اور نوٹ کی قیمت کی گراوٹ کا اندازہ سامان

کے اعتبار سے لگاتے ہیں، جبکہ امام ابو یوسف اور دیگر فقہاء احناف سونے یا چاندی کے سکے کے

لحاظ سے فلوس کی قیمت کی گراوٹ مانتے ہیں، مثلاً ایک درہم تیس فلس میں ہو، اور پچاس فلس میں

ہو جائے، تو اس وقت یہ کہا جائے گا کہ فلوس کی قیمت گر گئی، یہ حضرات خود درہم کی قوت خرید پر نظر نہیں رکھتے ہیں، جبکہ ماہرین معاشیات خود درہم کی قوت خرید پر بھی نظر رکھتے ہیں۔

لہذا امام ابو یوسف کے مسلک کے مطابق ہم کہہ سکتے ہیں کہ چار چونی کی قیمت ایک روپے کے برابر ہو، اور بعد میں اس میں گرواٹ آجائے، اور چھ چونی ایک روپے کے برابر ہو جائے، تو چھ چونی ادا کرنا لازم ہوگا، یعنی بنیادی سکہ کے مقابلہ میں معاون سکہ کی قیمت میں گرواٹ آجائے، تو امام ابو یوسف کے قول پر فتویٰ دیا جاسکتا ہے۔

ہاں اگر افراط زر کی وہ حالت پیش آئے کہ کاغذی نوٹ بے قیمت ہو جائیں تو امام ابو یوسف کے قول پر فتویٰ دیا جاسکتا ہے۔

اسی کے ساتھ ساتھ دیون کو قیمتوں کے اشاریہ سے وابستہ کرنا اس لئے بھی درست نہیں ہے کہ اشاریہ کی ترتیب کا طریقہ ٹھوس بنیاد پر نہیں ہے، بلکہ سامان، خدمات، اور خرچ کے تخمینہ طریقہ پر مبنی ہے۔

نیز عامۃ الناس کے درمیان ادائیگیوں کے لئے ایسا معیار مقرر کرنا جن کی بنیاد دقیق فنی اصولوں پر ہو، شریعت کے مزاج سے بھی ہم آہنگ نہیں، جو تمام لوگوں کے حق میں آسانی کو پسند کرتی ہے۔

اسی کے ساتھ دیون کو قیمتوں کے اشاریہ سے مربوط کرنا اس لئے بھی ناجائز ہے کہ اس سے سود کا دروازہ پوری طرح کھل جائے گا، چنانچہ اگر ایک آدمی نے ہزار روپے قرض لئے، پھر (۳۰٪) کے بقدر افراط زر ہوا، تو اسے تیرہ سو روپے ادا کرنے ہوں گے، اور ظاہر ہے کہ یہ ربا قرض ہو گیا۔

نیز دیون کو قیمتوں کے اشاریہ سے وابستہ کرنا، اس لئے بھی درست نہیں ہے کہ افراط زر خود سودی نظام کی پیداوار ہے، جبکہ اسلامی شریعت جس اقتصادی نظام کو پروان چڑھانا چاہتی

ہے اسے افراط زر سے پاک ہونا چاہئے۔

نیز دیون کو قیمتوں کے اشاریہ سے مربوط کرنا اس لئے بھی درست نہیں ہے کہ بے چارہ  
دیون کا افراط زر میں کوئی دخل نہیں ہے، پھر اس بے چارہ کو نا کردہ گناہ کی سزا کیوں دی جائے۔  
امام ابوحنیفہ کی طرح مالکیہ اور شافعیہ بھی نقدین اور فلوس میں فرق کئے بغیر مثل کے  
لوٹانے کے وجوب کے قائل ہیں، جبکہ ان کا تعامل بند ہو جائے، اور وہ موجود ہوں، اگر مثل  
معدوم ہو جائے، تو پھر قیمت کی طرف رجوع کیا جائے گا۔  
فقہ مالکی کی کتاب ”الشرح الصغیر“ میں ہے:

”وإن بطلت معاملة من دنائير أو دراهم أو فلوس، ترتبت لشخص  
على غيره من قرض أو بيع، أو تغير التعامل بها بزيادة أو نقص، فالمثل أي  
فالواجب قضاء المثل على من ترتبت في ذمته، إن كانت موجودة في بلد  
المعاملة، وإن عدمت في بلد المعاملة، وإن وجدت في غيرها، فالقيمة يوم  
الحكم، أي تعتبر يوم الحكم بأن يدفع له قيمتها عرضاً، أو يقوم العرض بعين  
من المتجددة“ (الشرح الصغیر حاشیة الصاوی، قضاء القرض بما هو أفضل صفة ۲۸۹/۶، من المکتبۃ الشاہدہ)۔  
(اگر دینار یا درہم یا فلوس کا معاملہ باطل ہو جائے جو کسی شخص کا دوسرے پر مرتب  
ہو رہے ہوں، قرض یا بیع کی شکل میں، یا کمی یا زیادتی کے ساتھ ان سے تعامل میں تبدیلی آجائے تو  
اس شخص پر مثل ادا کرنا واجب ہے، جس کے ذمہ میں وہ مرتب ہو رہے ہوں، اگر اس کا مثل  
معاملہ کے شہر میں موجود ہو، اور اگر معاملہ کے شہر سے معدوم ہو جائے، اگرچہ دوسری جگہ موجود ہو،  
تو فیصلہ کے دن کی قیمت کا اعتبار ہے، یعنی فیصلہ کے دن کی قیمت کا اعتبار ہوگا، اس طرح کہ اسے  
سامان کی شکل میں اس کی قیمت دے دے، یا سامان کی قیمت نئے سکہ سے لگائی جائے)۔

دسوقی مالکی تحریر کرتے ہیں:

”یوم الحکم ای الذی هو متأخر عن یوم العدم، وعن یوم الاستحقاق، وانظر علی هذا القول، إذا لم يقع تحاکم، والظاهر أن طلبها بمنزلة التحاکم، وحينئذ، فتعتبر القيمة یوم طلبها“ (حاشیة الدسوقی علی الشرح الکبیر لمحمد بن احمد بن عرفة الدسوقی المالکی (۱۲۳۰ھ)، باب ینعقد البیع بما یدل علی الرضا ۳/۷۲، ط: دار الکتب العلمیہ بیروت)۔

(فیصلہ کا دن جو معدوم ہونے اور حقدار ہونے کے دن سے مؤخر ہے، اور اس قول کی بنا پر غور کرو اس صورت کے بارے میں، جس میں معاملہ حاکم کے پاس نہ لے جایا جائے، اور ظاہر یہ ہے کہ قیمت کا طلب کرنا مقدمہ لے جانے کے درجہ میں ہے، چنانچہ اس وقت اس کے مطالبہ کے دن کی قیمت کا اعتبار ہوگا)۔

مالکی مذہب میں سونے چاندی کے علاوہ سے بھی قیمت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے، جبکہ سخنوں کا قول ہے کہ قیمت سونے اور چاندی ہی سے معلوم کی جائے گی (البیان والتحصیل لابن الولید ابن رشد (المجد) القرطبی (۵۲۰ھ) ۷/۲۱۳، ط: دار الغرب الاسلامی، بیروت، ۱۹۸۲ء)۔

اور امام نووی شافعی تحریر کرتے ہیں:

”ولو أقرضه نقداً، فأبطل السلطان المعاملة به، فليس له إلا النقد الذي أقرضه“ (روضة الطالبین وعمدة المفتین للنووی (۶۷۶ھ) ۳/۷۳، باب القرض، ط: المکتب الاسلامی، بیروت، الطبعة الثالثة ۱۹۹۱ء)۔

(اور اگر کسی کو چاندی یا سونے کے سکے قرض میں دے، پھر بادشاہ اس کے ذریعہ معاملہ کو باطل کر دے، تو اسے وہی سکے ملے گا جو اس نے قرض دیا تھا)۔

اور شیرازی شافعی تحریر کرتے ہیں:

”ويجب على المستقرض رد المثل فيما له مثل، لأن مقتضى القرض رد المثل، ولهذا يقال: الدنيا قروض ومكافأة فوجب أن يرد المثل، وفيما لا



مثل له وجہان: أحدهما: يجب عليه القيمة، لأن ما ضمن بالمثل، إذا كان له مثل، ضمن بالقيمة، إذا لم يكن له مثل كالمثلات، والثاني: يجب عليه مثله في الخلقة والصورة“ (المہذب مع شرحه لجموع: باب القرض ۱۳/۲۳۱، ط: دار الفکر بیروت، ۲۰۰۵ء)۔

(اور قرض لینے والے پر واجب ہے کہ مثل لوٹائے، جس چیز کا مثل موجود ہو، کیونکہ قرض کا تقاضا مثل کو لوٹانا ہے، اور اسی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ دنیا بدلہ ہے، لہذا لازم ہوا کہ مثل کو لوٹائے، اور جس چیز کا مثل نہ ہو تو دو صورتیں ہیں:

اول: ان میں سے ایک صورت یہ ہے کہ اس پر قبضہ کے دن کی قیمت واجب ہو، کیونکہ جس چیز کا ضمان مثل کے ذریعہ ہو، جبکہ اس کا مثل ہو، تو اگر اس کا مثل نہ ہو تو قیمت کے ذریعہ اس کا ضمان ہوگا ضائع کردہ اشیاء کی طرح۔

دوم: اور دوسری صورت یہ ہے کہ اس پر خلقت اور صورت کے لحاظ سے اس کا مثل واجب ہوگا)۔

اور حنا بلہ کی رائے ہے کہ اگر سلطان ان سکوں کے ساتھ تعامل کو ناجائز قرار دے اور لوگ ان کے ترک پر متفق ہو جائیں تو پھر ان سکوں کی قیمت لوٹانا ہوگا، نہ کہ مثل، خواہ وہ سکے موجود ہوں یا نہ ہوں، لیکن اگر ان سکوں میں ارزانی یا گرانی آجائے، تو پھر وہی سکے لوٹائے جائیں گے۔

ابن قدامہ تحریر کرتے ہیں:

”المستقرض يرد المثل في المثليات، سواء رخص سعره أو غلا، أو كان بحاله، ولو كان ما أقرضه موجوداً بعينه، فرده من غير عيب يحدث فيه، لزوم قبوله، سواء تثير سعره، أو لم يثير، وإن حدث به عيب، لم يلزمه قبوله، وإن كان القرض فلوساً، أو مكسرة، فحرمها السلطان وترك المعاملة بها،

كان للمقرض قيمتها ولو يلزمه قبولها، سواء كانت قائمة في يده، أو استهلكها، لأنها تعيبت في ملكه“ (المعنى لابن قدامة أبي محمد عبد الله بن أحمد (۵۶۲۰)، باب القرض، وجوب رد المثل أو العين في القرض ۳/۳۹۶، ط: المكتبة التجارية، مكة المكرمة)۔

(قرض لینے والا مثلیات میں مثل لوٹائے گا، خواہ اس کا دام ارزاں ہو جائے یا گراں ہو جائے، یا اپنی سابقہ حالت پر رہے، اور اگر وہ سامان جسے اس نے قرض میں دیا تھا، بعینہ موجود ہو اور اس نے اسے اس عیب کے بغیر لوٹایا جو اس میں پیدا ہو، تو اس پر اس کا قبول کرنا لازم ہے، خواہ اس کا دام بدل گیا ہو یا نہ بدلا ہو، اور اگر اس میں عیب پیدا ہو گیا ہو تو اس پر اس کا قبول کرنا لازم نہیں ہے، اور اگر قرض فلوس ہوں یا کھوٹے درہم ہوں اور سلطان ان کو حرام ٹھہرا دے اور اس کے ذریعہ معاملہ چھوڑ دیا جائے تو قرض خواہ کو قرض کے دن کی اس کی قیمت ملے گی، اور ان سکوں کا قبول کرنا اس پر لازم نہیں، خواہ اس کے قبضہ میں موجود ہوں، یا اس نے اس کو ضائع کر دیا ہو، اس لئے کہ وہ اس کی ملکیت میں عیب دار ہو گئے)۔

البتہ استثنائی حالات میں، جیسے ملک کو جنگ کا سامنا ہونے کی وجہ سے یا حکومت کی جانب سے کرنسی کی قیمت اچانک کم کر دینے کے سبب اگر کرنسی میں بھاری گراوٹ آجائے، ایسی زبردست گراوٹ جو سودا کرتے وقت عام طور سے فریقین کی نگاہ میں نہیں ہوتی ہے، یا مہر میں طول زمانہ کی وجہ سے گراوٹ فحش درجہ کو پہنچ جائے، یعنی کرنسی کی قیمت، نکاح کے وقت سے، یا بیع میں عقد کے وقت سے، اور قرض میں قبضہ کے وقت سے، ایک تہائی سے بھی کم رہ جائے، ان دلائل کے پیش نظر جو حد کثرت کی تحدید ثلث سے کرتے ہیں، اور قرض خواہ رواداری سے کام نہ لے اور معاملہ عدالت تک پہنچے، تو ایسی صورت میں قاضی کرنسی کی قیمت کا اعتبار کرتے ہوئے نقصان کو فریقین پر نصف نصف کر دے، اس لئے کہ عبادہ بن صامت کی روایت میں ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”لا ضرر ولا ضرار“ (ابن ماجہ، حدیث نمبر: ۲۳۴۰، ماہنامہ سنا دحسن)

(دوسرے کو نہ ابتداءً مضر پہنچانا جائز ہے، نہ بدلہ کے طور پر، یا نہ دوسرے کو اپنے نفع کی خاطر ضرر پہنچانا جائز ہے اور نہ ہی بغیر نفع حاصل کئے ہوئے یونہی بلا وجہ ضرر پہنچانا جائز ہے)۔

اور رہونی مالکی تحریر کرتے ہیں: ”وینبغی أن یقید ذلک بما اذا لم یکثر ذلک جدا، حتی یصیر القابض لها کالقابض لهما لا کبیر منفعۃ فیہ“ (حاشیہ الرہونی علی الشرح الکبیر ۵/۱۲۲)۔

(مناسب ہے کہ اس کو اس صورت کے ساتھ مقید کیا جائے کہ جس میں تغیر بہت زیادہ نہ ہو، تا کہ ان سکوں پر قبضہ کرنے والا ایسا نہ ہو جائے کہ وہ ایسی چیز پر قبضہ کرنے والا ہے جس میں کوئی بڑا فائدہ نہیں ہے)۔

ہنگامی حالات میں جبکہ کرنسی کی قیمت ایک تہائی سے بھی کم رہ جائے، نقصان کو نصف نصف فریقین پر تقسیم کرنے کی بات ایک ایسا حل ہے جو شریعت اسلامیہ کے اصول سے متفق ہے، کیونکہ شریعت کی بنیاد عدل پر ہے، ابن قیم تحریر کرتے ہیں: ”وحیثما ظہرت دلائل العدل، وسفر وجہہ، فشم شرع اللہ وأمرہ“ (مجلۃ البحوث الاسلامیہ ۳۲/۳۲۵، الرئاسة العامة للإدارات البحوث العلمیہ مکة المکرمہ) (اور جہاں عدل کے آثار ظاہر ہوں، اور اپنا چہرہ بے نقاب کر دے، وہیں اللہ کی شریعت اور اس کا حکم ہے)۔

۲۔ نوٹوں کی شکل میں قرض دیتے وقت یا مہر کے تقرر کے وقت یا ادھار فروختگی کے وقت طرفین واجب الاداء نوٹ کی مالیت سونے یا چاندی میں طے کر لیں، اور بوقت ادائیگی عمل میں آئے تو یہ درست نہیں ہے؛ کیونکہ عقود کی صحت کے لئے لازمی شرط معلومیت ہے اور سوال میں ذکر کردہ قرض لینے والے کو معلوم نہ ہوگا کہ اسے کتنا روپیہ لوٹانا ہے اور نہ ہی قرض خواہ کو معلوم ہوگا کہ اسے کتنا روپیہ ملے گا، اسی طرح نہ ادھار فروخت کرنے والے کو عقد کے وقت معلوم ہوگا کہ اسے کتنا نوٹ ملے گا، اور نہ ادھار خریدنے والے کو معلوم ہوگا کہ اسے کتنے نوٹ ادا کرنے

ہیں، ایسے ہی عقد کے وقت نہ بیوی کو معلوم ہوگا کہ اسے کتنے نوٹ ملیں گے، اور نہ ہی شوہر کو معلوم ہے کہ اسے کتنے نوٹ ادا کرنے ہیں، اور ایسی جہالت کے ساتھ عقد فاسد ہے۔

الدر المختار میں ہے:

”و شرط لصحته معرفة قدر مبيع و ثمن“ (الدر المختار شرح تنویر الابصار للھکامی محمد بن

علی (۱۰۸۸ھ) ط: دارالکتب العلمیہ، بیروت، الطبعة الاولى، ۱۹۹۴م، کتاب البیوع ۷/۲۸۷) (بیع کی صحت کے

لئے بیع اور ثمن کی مقدار کا معلوم ہونا شرط ہے)۔

اور رد المختار میں ہے:

”و خرج أيضا ما لو كان الثمن مجهولاً كالبيع بقيمته، أو برأس ماله،

أو بما اشتراه، أو بمثل ما اشتراه فلان، فان علم المشتري بالقدر في المجلس

جاز“ (رد المختار: کتاب البیوع ۷/۲۹۷) (اور اس صورت کا بھی حکم معلوم ہو گیا کہ ثمن مجہول ہو، جیسے

اس سامان کی قیمت کے بدلہ، یا اس کی اصل پونجی کے بدلہ بیع ہو، یا اس ثمن کے بدلہ یا اس ثمن کے

مثل کے بدلہ جس کے ساتھ فلاں نے خریدا ہے، اگر مجلس میں مشتری کو مقدار معلوم ہو جائے، تو

پھر بیع جائز ہے)۔

اور حدیث شریف میں ہے، جو ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ انہوں نے کہا:

”أُتيت النبي ﷺ فقتل: إني أبيع الإبل بالنقيع فأبيع بالدنانير وأخذ

الدراهم، وأبيع بالدراهم وأخذ الدنانير فقال: ”لا بأس أن تأخذ بسعر يومها،

مالم تفرقا، وبينكما شيء“ (ابوداؤد: البیوع، باب فی اقتضاء الذہب من الورق حدیث نمبر: ۳۳۵۴،

حاکم ۲/۴۴، صحیح ووافقه الذہبی، احمد، حدیث نمبر: ۶۲۳۹، وقال شعيب الأرنؤوط: اسنادہ ضعیف لفر دساک برفعه)۔

(میں نبی کریم ﷺ کے پاس آیا، تو میں نے کہا کہ میں مقام ”نقیع“ میں اونٹ بیچتا

ہوں، چنانچہ دینار کے بدلہ بیچتا ہوں اور درہم اس کے بدلہ لے لیتا ہوں، اور درہم کے بدلہ بیچتا

ہوں اور اس کے بدلہ دینار لے لیتا ہوں، تو آپ نے فرمایا: کوئی حرج نہیں کہ تم اسے اس دن کے دام کے بدلہ لو، جب تک تم دونوں اس حال میں جدا نہ ہو کہ تمہارے درمیان کچھ باقی رہے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ دین کو اس کے مثل کے ساتھ ادا کیا جائے گا، نہ کہ قیمت کے ساتھ، اور اگر مثل دشوار ہو، تو پھر ادائیگی کے دن عقد صرف کے دام کے لحاظ سے ادائیگی کا حکم دیا جائے گا، اور دین کے ذمہ میں ثبوت کے دن کے دام کا اعتبار نہ ہوگا، ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہوا کہ ثمن کو کسی چیز کی مالیت سے مربوط کرنا درست نہیں ہے، نیز اموال ربویہ کے تبادلہ میں مجلس میں قبضہ شرط ہے، جو اس صورت میں مفقود ہے۔

الدر المختار میں ہے:

”وإن وجد أحدهما أي القدر وحده أو الجنس، حل الفضل وحرم النساء، ولو مع التساوی“ (الدر المختار: کتاب البیوع، باب الربا، ۲/۴۰۴)۔

(اور اگر دونوں علتوں میں سے ایک پائی جائے یعنی صرف کیلی یا وزنی ہونا، یا صرف ہم جنس ہونا پایا جائے، تو زیادتی حلال ہے، اور ادھار حرام ہے، اگرچہ برابری کے ساتھ ہو)۔

البتہ متبادل یہ ہے کہ اگر افراط زر کا خطرہ ہو، تو (۱) سونے یا چاندی ہی میں دین کا عقد یا مہر کا تقرر کرے، (۲) مثلی سامان میں دین کا عقد کرے، (۳) کم تغیر والی کرنسی میں عقد کرے جیسے ڈالر وغیرہ۔

خلاصہ بحث:

- ۱- دیون کو قیمتوں کے اشاریہ سے وابستہ کرنا درست نہیں ہے۔
- ۲- اگر کاغذی نوٹ بے قیمت ہو جائیں تو امام ابو یوسف کے قول پر فتویٰ دیا جائے گا۔
- ۳- ہنگامی حالات میں اگر کرنسی کی قیمت ایک تہائی سے بھی کم رہ جائے، اور فریقین

نظر انداز نہ کریں اور معاملہ عدالت میں آئے، تو قاضی نقصان کو نصف نصف کر کے فریقین پر تقسیم کر دے۔

۳- واجب الادا نوٹ کی مالیت کو سونے یا چاندی یا ڈالر وغیرہ سے مربوط کرنا درست

نہیں ہے۔

۵- افراط زر کے اندیشہ کے وقت فریقین معاملہ سونے یا چاندی یا کم تغیر والی کرنسی

جیسے ڈالر وغیرہ میں کریں۔

## موجودہ کرنسی نوٹ کی شرعی حیثیت

مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی ☆

یہ بات تقریباً طے ہو چکی ہے کہ ”کاغذی نوٹ“ ثمن و نقد ہے، اس لئے کہ ثمن کی تعریف فقہاء ان الفاظ میں کرتے ہیں:

”الذمن ما یثبت فی الذمة بدلة من البیاعات من الدراهم والدنانیر“  
(احکام القرآن للجصاص: ۱۲/۲)۔

(خرید و فروخت میں جو کچھ بدل کے طور پر ذمہ میں ثابت ہو خواہ درہم ہو یا دینار وہ ثمن کہلاتا ہے)۔

علامہ شامی تحریر فرماتے ہیں:

”الذمن ما یثبت فی الذمة عند المقابلة وهو النقدان والمثلیات“ (شامی: ۱۸۵/۳، باب الرابحة والتولیة، مطلب فی بیان الذمن والبیع، مطبوعہ: رشیدیہ، پاکستان)۔

(تبادلہ کے وقت ذمہ میں جو ثابت ہو وہ ثمن ہے، اور وہ نقدین (سونا و چاندی) اور مثلی اشیاء ہیں)۔

فقہاء نے ثمن کی تین قسمیں بیان کی ہیں:

۱۔ ثمن خلقتی: جو ہر حال میں ذریعہ تبادلہ ہوتا ہے اور جس کو ثمن کے لئے ہی بنایا گیا ہے

جیسے سونا و چاندی۔

۲- ثمن اصطلاحی: جو عرف کی وجہ کر ثمن کی حیثیت اختیار کر لیا ہو جیسے فلوس و سکے۔

۳- مثلی و عددی اشیاء: جو کبھی تو ثمن ہو اور کبھی نہ ہو۔

”الأموال ثلاثة: الأول: ثمن بكل حال وهو النقدان، والمراد بالثمن هنا

ما يثبت ديناً في الدمة، والثاني: مبيع بكل حال كالثياب والدواب. والثالث: ثمن

من وجه مبيع من وجه كالمثلثات أي غير النقدين وهي المكيل والموزون و

العددي المتقارب، وأما الفلوس فإن رائجة فكثمن وإلا فكسلع، يستفاد من

البحر أنها قسم رابع حيث قال: و ثمن بالاصطلاح وهو سلعة في الأصل“ (الدر

مع الرد: ۲/۱۳۷، کتاب الصرف، مطلب فی بیان ما یكون مبيعاً وما یكون ثمناً، مطبوعہ: رشیدیہ پاکستان)۔

(اموال کی تین قسمیں ہیں:

۱- ہر حال میں ثمن ہو اور وہ نقدین ہیں۔ یہاں ثمن سے مراد یہ ہے کہ جو ذمہ میں ابلور

دین ثابت ہو۔

۲- ہر حال میں مبیع ہو جیسے ملبوسات و حیوانات۔

۳- من وجہ ثمن ہو اور من وجہ مبیع، جیسے مثلثات، یعنی نقدین کے ماسوا، اور یہ مکیل و

موزون اور عددی متقارب ہیں۔

البتہ ”فلوس“ اگر رائج ہیں تو ثمن ہیں ورنہ سامان، بحر سے معلوم ہو رہا ہے کہ یہ چوتھی

قسم ہے، کیوں کہ انہوں نے کہا ہے: اور عرف کی وجہ کر ثمن ہے ورنہ تو وہ سامان ہے)۔

موجودہ کرنسی نوٹ کے سلسلہ میں غور طلب امر یہ ہے کہ ثمن کی انواع تلاش میں سے یہ

کس قسم میں داخل ہے، یا کس قسم کے ساتھ لاحق کیا جاسکتا ہے۔

اکثر فقہاء کا رجحان یہ معلوم ہوتا ہے کہ ”موجودہ کرنسی نوٹ“ ثمن اصطلاحی کے



زمرے میں داخل ہے، لہذا وہ تمام احکام جو کسی زمانے میں ”فلوس رائج“ کے لئے ہوا کرتے تھے وہ احکام موجودہ ”کرنسی نوٹ“ پر بھی چسپاں کئے جا رہے ہیں۔

اس کے بالمقابل ایک خیال یہ ہے کہ بعض فروق کے ساتھ ”نقد“ یعنی ”ثمن خلقی“ کے حکم میں ہے، یہ بات زیادہ قرین قیاس اور ہم آہنگ روح شریعت معلوم ہوتی ہے؛ اس لیے کہ نقد (یعنی ثمن خلقی) جن اسباب و خواص کی وجہ کر نقد بنتا ہے وہ تمام اسباب و خاصیات کا حامل فی زمانہ موجودہ سکے ہی ہیں۔ بعض ماہرین اقتصادیات نے ان عناصر کی تنقیح کی ہے اور خلاصہ کے طور پر بیان کیا ہے، علامہ یوسف قرضاوی ”النظم النقدية والمصرفية“ کے حوالہ سے تحریر فرماتے ہیں:

”النقد ہی کل ما يستعمل مقياساً للقيم، وواسطة للتبادل، وأداة للادخار فأى شئ يؤدي هذه الوظيفة يعتبر نقوداً“ (فقہ الزکاة للقرضاوی: ۲۷۱، مطبوعہ: دارالاشاعت، بیروت)۔

(نقد ہر وہ شئی ہے جو قیمتوں کے لئے پیمانہ ہو، ذریعہ تبادلہ اور ذخیرہ اندوزی کا سامان ہو، پس جو شئی بھی اس ضرورت کو پورا کرے گی وہ نقد ہے)۔  
اسی طرح الحضارة الاسلامیہ کے مصنف رقم طراز ہیں:

”النقد ما يستخدم وسيطاً للتبادل ومقياساً للقيم، ومخزوناً للثروة، ومعياراً للمدفوعات الآجلة من الديون“ (الحضارة الاسلامیہ ۲/۳۳۰ مطبوعہ: دارالکتاب، بیروت)۔

(نقد ہر وہ چیز ہے جو ذریعہ تبادلہ ہو، قیمتوں کے لئے پیمانہ ہو، ثروت و دولت کے لئے ذخیرہ کیا جانا ممکن ہو، اور مؤخر مطالبات کے لئے معیار ہو)۔

حاصل یہ ہے کہ نقد میں چار بنیادی عناصر پائے جاتے ہیں:

۱۔ نقد ذریعہ تبادلہ ہوتا ہے۔

۲- قیمتوں کے لئے معیار ہوتا ہے۔

۳- قابل مخزون ہوتا ہے۔

۴- مؤخر حقوق و مطالبات کے لیے معیار ہوتا ہے۔

ان چاروں عناصر کو جامع تو حقیقت میں سونا و چاندی ہی ہیں؛ لیکن سوال یہ ہے کہ اگر کوئی دوسری شئی بھی ان چاروں اساس کو پورا کر رہی ہے تو کیا اس کا حکم بھی نقد کا ہوگا یا نہیں، بات بالکل واضح ہے کہ اس کا حکم بھی وہی ہونا چاہئے۔

موجودہ ”کرنسی نوٹ“ میں اگر غور کیا جائے تو موجودہ دور میں پورے طور پر اس سے تقاضائے اربعہ پورے ہو رہے ہیں تو اب اس کے نقد ہونے میں شبہ ہی کیا رہ جاتا ہے۔

مؤخر مطالبات کی ادائیگی:

موجودہ ”کرنسی نوٹ“ کو نقد مان لینے کے بعد یہ سوال بہت اہم رہ جاتا ہے کہ مؤخر مطالبات جیسے: مہر، پنشن اور قرض وغیرہ کی ادائیگی کی کیا شکل ہو، جب کہ روز بروز ظاہر میں ”روپیہ“ کی ”قوت خرید“ گھٹتی جا رہی ہے، سو روپے سے ایک سال قبل جو سامان پانچ کلو خرید سکتے تھے، آج ڈھائی کلو بھی خریدنا مشکل ہے، تو اگر قرض دینے والے کو صرف سو روپے ہی دلوائے جائیں تو اس کا بہت ہی نقصان ہوگا، جب کہ شریعت کا ایک ہم ضابطہ ہے: الضرد یزال (نقصان کا ازالہ کیا جائے گا)، ”لا تظلمون ولا تظلمون“ (نہ تم ظلم کرو، اور نہ تم پر ظلم کیا جائے)۔

لیکن قرض لینے والے کو اگر پابند کیا جائے کہ ایک سال قبل کے سو روپے قرض آج دو سو روپے سے ادا کرے تو اس سے ربا کا دروازہ چوہٹ کھلتا نظر آتا ہے۔

ایسے دور نے پہلو کو حل کرنے کے لئے اسلام کے مزاج و مذاق اور معاملات کی

حقیقت و روح کو سامنے رکھنا ضروری ہوگا۔

جہاں تک اسلام کے مزاج و مذاق کا تعلق ہے تو اسلام نہیں چاہتا کہ کسی کو ضرر پہنچے، ہاں اگر دوسرے کا خطرہ ہو تو اسلام کی تعلیم یہ ہوتی ہے کہ چھوٹا خطرہ برداشت کر لیا جائے تاکہ بڑا خطرہ ٹل جائے، اسی کو فقہاء کی زبان میں: "الضرر الأشد یزال بالضرر الأخف" (قواعد الفقہ ۸۸) (بڑا نقصان چھوٹے نقصان سے ختم کیا جائے گا) سے تعبیر کیا جاتا ہے، شریعت نے مختلف مواقع پر اس کی رعایت کی ہے۔

البتہ معاملات کے سلسلے میں ذہن نشین رہے کہ:

۱- معاملہ دیون کا ہے جو مثلیات میں صحیح ہے، قبیحی اشیاء میں صحیح نہیں۔  
 ۲- دیون کی ادائیگی میں مثلیت، کمیت (یعنی: وزن، کیل اور عدد) میں ضروری ہے قیمت میں نہیں۔

۳- "مثلیت" میں برابری محض سود سے بچنے کے لئے ہے اور یہ وزن، کیل اور عدد میں ہی ممکن ہے۔

۴- قوت خرید کی کمی بیشی میں اعتبار حکومت کے اعلان کا ہے نہ کہ عوام الناس کے عرف کا۔

۵- کیا روپے پیسے کی قیمت گھٹتی بڑھتی ہے یا سامان کی، محاورہ میں دونوں طرح کی بات رائج ہے، لیکن واقعی طور پر اور خود حکومت کے یہاں بھی سامان کی قیمت گھٹتی بڑھتی ہے، مثلاً آج سے کچھ سالوں پہلے ایک ہزار روپے میں چار ہزار لیٹر پٹرول خریدا جاسکتا تھا، جب کہ ایک موبائل خریدنا ممکن نہیں، لیکن آج ایک موبائل خرید سکتے ہیں جب کہ پٹرول صرف پانچ سو لیٹر ہی خریدا جاسکتا ہے، یہاں یہی تو کہا جائے گا کہ پٹرول کی قیمت زیادہ ہوگئی، اور موبائل کی قیمت گھٹ گئی۔ حکومت بھی اس کو قبول کرنے پر مجبور ہے؛ کیوں کہ اس کا رویہ ایسا ہی ہے، آپ جس بینک میں بھی پیسے جمع کریں خواہ دس سال کے بعد ہی نکالیں حکومت آپ کو اتنے ہی پیسے ادا

کرے گی جتنے آپ نے جمع کیے ہیں، جو زائد پیسے بظاہر ملتے نظر آتے ہیں وہ سود کی رقم ہے، آپ کی اپنی رقم نہیں، جب صورت حال یہ ہے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ موجودہ سکوں سے مؤخر مطالبات بلا کم و کاست ادا کرنے میں دائن کا نقصان ضرور ہے لیکن بڑے ضرر کو دور کرنے کے لئے یہ اختیار کرنا ضروری ہے؛ اس لیے کہ معاملہ دیون میں مثلثیت، کمیت میں معتبر ہے ورنہ سود لازم آئے گا، اور اگر مالیت و قیمت میں مساوات کو تھوڑی دیر کے لئے تسلیم کر بھی لیں تو حکومت کے نزدیک مسلم عرف معتبر ہوگا، اور حکومت کے یہاں عرف یہی ہے کہ قیمت میں مساوات کا لحاظ نہیں اس لیے بھی قیمت میں مساوات ضروری نہیں ہوگی۔

قیمتوں کے اشاریہ کے ساتھ قرضوں کی ادائیگی کو منسلک کرنے پر ایک فقہی عبارت سے تائید اور اس کی تحقیق:

شامی وغیرہ میں امام ابو یوسف کی طرف منسوب کر کے ایک مسئلہ بیان کیا گیا ہے کہ فلوس کی قیمت ادا کرنے سے پہلے اگر گھٹ جائے تو بیع کی صورت میں بیع کے دن کی قیمت، اور قرض کی صورت میں قرض پر قبضے کے دن کی قیمت کا اعتبار ہوگا، اس کی کمیت یا عدد کا اعتبار نہیں، نیز قضاء و افتاء کے لئے یہی مناسب ہے، اور اسی پر فتویٰ بھی ہے، عبارت حسب ذیل ہے:

”وفی البزازیة عن المنتقی: غلت الفلوس أو رخصت فعند الامام الأول والثانی أولاً لیس علیہ غیرها، وقال الثانی ثانیاً: علیہ قیمتھا من الدراهم یوم البیع والقبض وعلیہ الفتویٰ“۔

”وہكذا فی الذخیرة والخلاصة عن المنتقی ونقله فی البحر وأقره، فحیث صرح بأن الفتویٰ علیہ فی کثیر من المعترات فیجب علیہ أن یعول علیہ إفتاء وقضاء ولم أر من جعل الفتویٰ علی قول الإمام“ (شامی: ۲۷/۳ کتاب البیوع، مطلب محم فی أحكام التقویر إذا کسدت أو انقطعت أو غلت أو رخصت، مطبوعہ: رشیدیہ پاکستان)۔

(بزاز یہ میں منقہی سے منقول ہے کہ (کسی چیز کو بیچنے کے بعد) فلوس کی قیمت زیادہ ہو یا کم ہو جائے تو امام اول (حضرت امام ابوحنیفہ) اور ثانی (حضرت امام ابو یوسف) کا پہلا قول یہ ہے کہ مشتری پر ان مقررہ فلوس کے علاوہ کچھ واجب نہیں، اور امام ثانی کا دوسرا قول یہ ہے کہ مشتری کے ذمہ فلوس کی وہ قیمت واجب الادا ہے جو بیع اور قبضہ کے دن تھی، اور اسی پر فتویٰ ہے۔ ذخیرہ اور خلاصہ میں بھی اسی طرح منقہی سے نقل ہے اور اسی بات کو بحر میں بھی نقل کیا ہے اور توثیق کی ہے، اس طرح بات واضح ہو گئی کہ فتویٰ بہت سے اہم معاملات میں اسی پر ہے لہذا فتویٰ دینے اور فیصلہ کرنے میں اس قول پر اعتماد ضروری ہے، مجھے نہیں معلوم کہ کسی نے امام ابوحنیفہ کے قول پر فتویٰ دیا ہو۔)

اس عبارت سے بہت حد تک اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ اگر قرض دینے کے دن اور واپسی کے دن کی قیمتوں میں تفاوت ہو تو لینے کے دن کی قیمت کا اعتبار کیا جائے گا اور اسی پر اعتماد کرنا ضروری ہے۔

لیکن اس سے استدلال اس لیے صحیح نہیں کہ ان فقہاء کے زمانے میں یہ ”فلوس“ سونے و چاندی کے دنانیر و دراہم سے ایسے ہی مربوط تھے جیسے آج ”کانڈ کے ایک روپے“ سے دو پچاس پیسے، فقہاء کے کلام سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، مثال کے طور پر:

۱- ”عن فوائد الإمام أبي حفص الكبير: استقرض منه دائق فلوس حال كونها عشرة بدائق فصارت ستة بدائق أو رخص و صار عشرون بدائق يأخذ منه عدد ما أعطى ولا يزيد ولا ينقص، قلت: هذا مبني على قول الإمام الخ (شامی: ۲/۳۷۳، کتاب البیوع، مطلب مہم فی احکام التقوید و انقطع الخ، مطبوعہ رشدیہ پاکستان)۔“

(امام ابو حفص کبیر سے منقول ہے: ایک دائق فلوس جس کا دس، ایک دائق کے برابر ہے، پھر چھ فلوس ایک دائق کے مساوی ہو گئے یا اس کی قیمت گھٹ گئی، اور بیس فلوس ایک دائق

کے مساوی ہو گئے، تو امام ابوحنیفہ کے اصول کے مطابق عدد کی جتنی مقدار دیا ہے اسی قدر وصول کرے گا، کم یا زیادہ نہیں کرے گا۔

۲- ”ولو اشتری شیئاً بنصف درہم فلوس صح، وعلیہ فلوس تباع

بنصف درہم“ (فتاویٰ عالمگیری ۳/۲۲۳، کتاب الصرف، بیع الفلوس، مطبوعہ: بیروت)۔

(اور اگر کوئی چیز خریدے نصف درہم فلوس میں تو بیع صحیح ہے، اور اس پر وہ فلوس واجب

ہے جو نصف درہم میں بیچے جاتے ہیں)۔

۳- ”إذا اشتری بدانق فلس أو بقیراط فلس فهذا جائز

استحساناً..... قال شمس الأئمة الحلوانی: هذا إذا كان الدانق والقیراط

معلومین فیما بین الناس لا یختلفان فی معاملاتهم وإن كانا مختلفین یاخذ

بعضهم عشرة وبعضهم تسعة لا یجوز العقد لمكان المنازعة“ (فتاویٰ عالمگیری: ۳

۲۲۳، کتاب الصرف، بیع الفلوس، مطبوعہ: بیروت)۔

(جب (کوئی چیز) خریدے ایک دانق فلس یا ایک قیراط فلس میں تو یہ استحساناً جائز

ہے، علامہ حلوانی فرماتے ہیں: یہ اس وقت ہے جب کہ دانق اور قیراط لوگوں کے مابین معلوم

ہوں لیکن دین میں مختلف نہ ہوں، اگر دونوں مختلف ہوں بعض تو ایک دانق یا قیراط دس فلس میں

اور بعض نو فلس میں لیتا ہو تو منازعت کی وجہ کر جائز نہیں ہے)۔

اس کے علاوہ بھی بہت سے شواہد ملتے ہیں جن میں فلوس کو درہم و دینار سے مربوط کیا

گیا ہے، گویا کہ فلوس راجح فقہاء کے زمانہ تک بطور ”ریزگاری“ استعمال ہوتے تھے، یہ ایسے ہی

ہے جیسے آج ہر روپیہ، دو پچاس پیسے کا مجموعہ ہوتا ہے، جب کہ آج سے کچھ عرصہ قبل تک چار پچیس

پیسے یا دس، دس پیسوں کا مجموعہ تھا، اب ظاہر ہے کہ ایک آدمی نے ایک روپیہ قرض اس وقت لیا

ہے جب کہ ایک روپیہ چار پچیس پیسے کا مجموعہ تھا، لیکن اب پچیس پیسے چلنا بند ہو گیا تو دو پچاس

پیسے دینے سے قرض ادا ہوگا نہ کہ چار پچیس پیسے دینے سے، امام ابو یوسفؒ غالباً یہی کہنا چاہتے ہیں؛ جب کہ امام ابو حنیفہؒ کلوں راجحہ کو غالباً درہم و دینار سے مربوط نہیں مانتے ہیں اس لئے کیت میں برابری کے قائل ہیں۔

موجودہ ”کرنسی نوٹ“ کی حیثیت بالکل جداگانہ ہے، اس کی اپنی مستقل حیثیت ہے کسی اور اصل سے مربوط نہیں لہذا جو حکم اصل درہم و دینار کا ہے وہی اس کا بھی ہونا چاہئے، علامہ قرضاوی بھی واقعی حیثیت کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”فالحق أن هذا أمر مستحدث ليس له نظير في عصر الأئمة المجتهدين رضی اللہ عنہم حتی یقاس علیہ ویلحق بہ“ (فقہ الزکاۃ ۱/ ۲۳۷ بیروت)۔  
(صحیح یہ ہے کہ (موجودہ کرنسی نوٹ) نئی ایجاد ہے، اس کی نظیر ائمہ مجتہدین کے دور میں نہیں تھی کہ اس پر قیاس کر کے اس کے ساتھ لاحق کیا جائے)۔

اس لیے احقر کی رائے میں مؤخر مطالبات کی ادائیگی میں کیت میں برابری ہی معتبر ہے، اس میں کمی بیشی کرنا باب ربا کو مفتوح کرنا ہے۔ اس میں قرض دینے والے کا ظاہر میں نقصان ضرور ہے لیکن اس کے مقابلہ میں قرض دینے کا ثواب اور اس سے محرومی نیز سود میں ابتلاء کا عقاب زیادہ اشد ہے؛ اس لیے اتنا گوارا کرنے میں جب کہ عرف عام و خاص بھی یہی ہو، کچھ حرج نہیں ہے۔

مؤخر مطالبات میں بوقت وجوب سونا و چاندی سے مقدار واجب کو متعین کرنا: قرض دیتے وقت یا مہر متعین کرتے وقت ہی اگر سونے و چاندی کی وہ مقدار متعین کر لی جائے جو ان نوٹوں کی مالیت کے مساوی ہو یعنی قرض و مہر تو کاغذی نوٹ ہو اور کاغذی نوٹ کی قیمت سونے یا چاندی سے متعین کر لیا جائے تو یہ گونا گوں خرابیوں کا مجموعہ ہوگا۔

مہر و اجرت وغیرہ جن میں مبادلتہ الدیون نہیں ہوتا ان میں احسن طریقہ تو یہی ہے کہ سونے و چاندی سے مہر یا اجرت متعین کیا جائے، لیکن جن معاملات میں مبادلہ ہوتا ہے جیسے قرض وغیرہ، ان میں سونا و چاندی اس دین کی قیمت ہوں گے، یا مہر و اجرت کا غذی نوٹوں سے متعین کرنے کے بعد سونے و چاندی سے مالیت کو متعین کرنے کی صورت میں بھی سونا یا چاندی کا غذی نوٹوں کی قیمت ہوگی، تو ان صورتوں میں مندرجہ ذیل خرابیاں لازم آئیں گی:

۱- نوٹوں کی مالیت کا تعین سونے و چاندی سے کرنا، دقیق فنی اصول پر مبنی ہے جو سیدھی سادی امت کے مزاج و احوال کے مناسب نہیں، حضور ﷺ نے ایک حدیث میں ارشاد فرمایا:

”نحن أمة أمية لا نكتب ولا نحسب“ (بخاری شریف ۱/۲۵۶ کتاب الصوم، باب: قول النبی ﷺ لا نكتب ولا نحسب)۔

ہم امی لوگ ہیں، حساب و کتاب سے واقف نہیں، یعنی ایسے حساب و کتاب جو دقیق ہوں، غلطیوں کا احتمال ہو اس سے واقف نہیں، لہذا نوٹوں کی سونے و چاندی سے مالیت متعین کرنے میں امت کو بڑی الجھن میں پھنسانا ہے۔

۲- پھر ہر دیا ر بلکہ ہر روز کی قیمتوں میں اتار و چڑھاؤ تیزی سے ہو رہا ہے، اگر اس کو بنایا جائے تو منازعت کا سبب بھی ہوگا۔

۳- مذکورہ بالا صورت میں بیع الکالی بالکالی لازم آئے گی؛ اس لیے کہ سونا و چاندی بھی دین ہے، اور کاغذی نوٹ بھی دین ہے۔ اس کی ممانعت تو صحیح حدیثوں میں وارد ہے۔

۴- نیز یہ ربا بالنسیئہ ہے کہ نقدین پر مجلس میں تقابض نہیں ہوا، قبل ازیں تصرف ہو گیا، جس کی حرمت میں کوئی اشتباہ نہیں، اس لئے اس طرح قیمتوں کے تعین میں فساد کی وجہ کر گنجائش معلوم نہیں ہوتی ہے۔

اس موضوع پر اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کے علاوہ مختلف اکیڈمیوں اور تنظیموں نے



سمینار منعقد کئے ہیں، ۱۴۰۷ھ میں ایک سمینار اسلامی ترقیاتی بینک جدہ اور عالمی ادارہ برائے اسلامی اقتصادیات اسلام آباد نے مشترکہ طور پر منعقد کیا تھا، اس سمینار میں علماء و مفتیان کے علاوہ ماہرین اقتصادیات بھی جمع ہوئے اور سب نے متفقہ طور پر جو قراردادیں پاس کیا وہ بھی مذکورہ نظریہ کی تائید کے لئے کافی ہے:

”سمینار میں حاضر تمام علماء نے اس بات کی توثیق کی ہے کہ سود اور قرض کی احادیث میں جو مثلیت اور برابری ضروری قرار دی گئی ہے وہ شرعی جنس اور قدر یعنی وزن، ناپ اور عدد میں برابری مراد ہے، قیمت میں برابری مراد نہیں، اور یہ بات احادیث کے ذریعہ پوری طرح واضح ہو جاتی ہے جو احادیث اموال ربویہ کے تبادلہ کے وقت عمدہ اور گھٹیا ہونے کے وصف کو غیر معتبر قرار دیتی ہیں، اور اس پر امت کا اجماع ہے اور اسی پر عمل جاری ہے۔

ذمنہ میں ثابت شدہ دیون چاہے وہ کسی بھی قسم کے ہوں ان کو قیمتوں کے اشاریہ کے ساتھ منسلک کر دینا جائز نہیں بائیں طور کہ عاقدین عقد بیع یا عقد قرض کے وقت اس کرنسی کو جس کے ذریعہ عقد بیع یا عقد قرض کر رہے ہیں کسی سامان کے ساتھ منسلک کر کے یہ شرط ٹھہرائیں کہ دیون ادائیگی کے وقت اس سامان کی قیمت موجودہ کرنسی میں ادا کرے گا“ (یہ جائز نہیں ہے)۔

(بحوالہ: فقہی مقالات: مولانا محمد تقی عثمانی ار ۳۷، مطبوعہ: زمزم دیوبند)۔

## تلخیص مقالہ:

- ۱- موجودہ کرنسی نوٹ شمن خلقی یعنی سونا و چاندی کے حکم میں ہے۔
- ۲- موجودہ کرنسی نوٹ نئی ایجاد ہے، فقہاء کے زمانے میں جو فلوس رائج تھے وہ درہم و دینار سے مربوط تھے، موجودہ کرنسی مستقل حیثیت کی حامل ہے، کسی اصل سے مربوط نہیں۔
- ۳- قرض و دین کی ادائیگی میں مثلیت، کمیت میں معتبر ہے، قیمت میں نہیں۔

۴- مؤخر مطالبات کی ادائیگی میں وہ مقدار ضروری ہے جو عندالوجوب لازم ہوتی ہے، اس میں کمی بیشی کرنا جائز نہیں۔

۵- ذمہ میں ثابت شدہ دیون کو قیمتوں کے اشاریہ کے ساتھ منسلک کرنا گونا گوں خرابیوں کی وجہ کر جائز نہیں۔ واللہ اعلم۔

## کرنسی کے مسائل

مواہنا محمد حذیفہ محمود ☆

۱- مؤخر مطالبوں کو قیمتوں کے اشاریہ سے وابستہ کرنا:

دیون یعنی مؤخر مطالبوں کو اشیاء کی قیمتوں کے اشاریہ سے وابستہ کرنا درست نہیں ہے، کیوں کہ نہ تو قیمتوں کے اشاریہ کی یقینی و اطمینان بخش ترتیب اور اس کے ذریعہ ادائیگیوں میں انضباط ممکن اور آسان ہے اور نہ ہی فنی دقیق اصولوں پر مبنی ہونے کی وجہ سے عوامی تنازعہ سے بچا جاسکتا ہے، اس کے علاوہ اس سے سود کا دروازہ بھی کھل جائے گا۔

تفصیل یہ ہے کہ شریعت اسلامیہ میں قرضوں کو واجب الاداء مقدار کے مثل (برابر) ادا کرنا ضروری ہے، اس میں کسی کا اختلاف نہیں ہے، اور دلائل شریعت میں غور کرنے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ قرضوں کی ادائیگی میں جو برابری شریعت میں مطلوب ہے اس میں دو باتوں کا لحاظ ضروری ہے:

ایک یہ کہ برابری اور مثلیت مقدار اور کیت میں ہو۔ قیمت اور مالیت کے اعتبار سے برابری مطلوب نہیں۔ حضور اکرم ﷺ نے اس کو ربانہ فضل کی احادیث میں پوری تشریح کے ساتھ واضح فرما دیا ہے۔

حضرت ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے کہ حضور اکرم ﷺ کے زمانے میں ہمارے

☆ دارالعلوم اوناواڑہ، گجرات۔

پاس ہر قسم کی ملی جلی کھجوریں آیا کرتی تھیں، ہم (گھٹیا کھجور کے) دو صاع کو (بڑھیا کھجور کے) ایک صاع کے بدلے میں بیچ دیتے تھے، جب حضور اکرم ﷺ کو اس کی اطلاع ہوئی تو آپ نے فرمایا کہ دو صاع کھجور کو ایک صاع کھجور کے بدلے میں مت بیچو اور نہ دو صاع گندم کو ایک صاع گندم کے بدلے میں بیچو اور ایک درہم کو دو درہم کے عوض مت بیچو (رواہ مسلم، باب الربا ۲۷/۲۷ رقم الحدیث ۴۰۶۱)۔

یہ بات حضور ﷺ کو معلوم تھی کہ جو کھجور دو صاع کے بدلے میں بیچی جائیگی وہ اس کھجور کے مقابلہ میں زیادہ قیمتی ہوگی جو ایک صاع کے عوض بیچی جائے گی، لیکن اس کے باوجود حضور اکرم ﷺ اس پر راضی نہ ہوئے بلکہ مقدار اور ناپ میں مماثلت اور برابری کا حکم دیا اور قیمت کے فرق کا اعتبار نہیں کیا۔

حضرت ابو سعید خدریؓ اور حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے ایک شخص کو خیبر کا عامل (جو زکوٰۃ وغیرہ وصول کرے) بنا کر بھیجا، وہ عامل حضور ﷺ کے پاس جنب کھجور (عمدہ قسم کی کھجور) لے کر آیا۔ حضور ﷺ نے سوال کیا کہ کیا خیبر کی تمام کھجور ایسی ہوتی ہیں؟ انہوں نے جواب دیا کہ نہیں اے اللہ کے رسول! ہم (اس عمدہ کھجور کے) ایک صاع کو (گھٹیا کھجور کے) دو صاع کے بدلے میں لو اور دو صاع کھجور کو تین صاع کھجور کے بدلے میں لے لیتے ہیں، حضور ﷺ نے فرمایا: ایسا مت کرو بلکہ مختلف قسم کی ملی جلی کھجوروں کو پہلے درہم کے عوض فروخت کر دو پھر ان درہم سے جنب کھجور خرید لیا کرو (صحیح بخاری: باب اذا اراد بیع تمر بتمر خیر منہ، کتاب البیوع ۱/۲۹۳، رقم: ۲۲۰۱-۲۲۰۲)۔

یہ روایت اس بات کی واضح دلیل ہے کہ اسوالم ربویہ میں جو مماثل اور برابری مطلوب ہے وہ مقدار میں مماثل ہے، قیمت میں مماثل اور برابری مطلوب نہیں، کیوں کہ جنب کھجور جمع کھجور (مخلوط کھجور) کے مقابلہ میں بہت اعلیٰ درجہ کی قیمتی اور عمدہ کھجور تھی اس کے باوجود

حضور ﷺ نے وزن میں برابری کو ضروری قرار دیا اور عمدہ اور گھٹیا ہونے کا بالکل اعتبار نہیں کیا۔

حضرت عبادہ بن صامتؓ سے روایت ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے فرمایا: سونے کو سونے کے بدلے میں، چاندی کو چاندی کے بدلے میں، گیہوں کو گیہوں کے بدلے میں، جو کو جو کے بدلے میں، کھجور کو کھجور کے بدلے میں اور نمک کو نمک کے بدلے میں ہاتھ در ہاتھ بیچو۔ ہاں! اگر ان اشیاء کی بیچ میں جنس مختلف ہو جائے تو پھر جس طرح چاہو (کی زیادتی کے ساتھ) بیچو، بشرطیکہ ہاتھ در ہاتھ ہو (نقد ہو، ادھار نہ ہو) (رواہ مسلم ۲۵۱۲، باب الربا، رقم الحدیث: ۴۰۳۹)۔

مندرجہ بالا حدیث اور اس جیسی دیگر احادیث اس بات کو واضح طور پر بیان کر رہی ہیں کہ شریعت میں جو تماثل اور برابری معتبر ہے، اموال ربویہ میں قیمت کے تفاوت کا بالکل اعتبار نہیں، یہ احکام اس صورت میں ہیں جب بیع نقد ہو رہی ہو، اور اگر معاملہ قرض کا ہو جس میں اصل سود جاری ہوتا ہے اور جس میں ہر قسم کی زیادتی بلکہ زیادتی کے شبہ سے بھی بچنا ضروری ہے تو پھر اس میں قیمت کے تفاوت کا لحاظ کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

دوسری بات: جس کا لحاظ قرضوں کی ادائیگی میں مطلوب برابری کے لئے ضروری ہے وہ یہ ہے کہ مثلیت اور برابری یقینی ہو، تخمینہ نہ ہو۔ قرآن و سنت کی روشنی میں یہ تمام فقہاء کے نزدیک مسلم ہے کہ قرض کی واپسی کے وقت مقدار میں یقینی مثلیت اور قطعی برابری شرط ہے، اٹکل اور اندازے سے واپس کرنا جائز نہیں؛ حتیٰ کہ اگر ایک شخص نے ایک صاع گندم بطور قرض لئے اور یہ شرط ٹھہرائی کہ قرض دار بغیر ناپ کے صرف اندازہ اور تخمین سے ایک صاع واپس کرے گا۔ تو قرض کا یہ معاملہ جائز نہیں؛ اس لئے کہ گیہوں اموال ربویہ میں سے ہے اور اموال ربویہ میں اندازہ اور تخمین سے واپس کرنا جائز نہیں۔ اسی وجہ سے حضور اکرم ﷺ نے بیع مزابنہ کو حرام قرار دیا ہے، بیع مزابنہ یہ ہے کہ درخت پر لگی ہوئی کھجور کو ٹوٹی ہوئی کھجور کے بدلے بیچا جائے اور

اس کی حرمت کی وجہ یہی ہے کہ جو کھجور ٹوٹی ہوئی ہے اس کی مقدار وزن کے ذریعہ معلوم کی جاسکتی ہے اور جو کھجور درخت پر لگی ہوئی ہے اس کی مقدار معلوم کرنے کا طریقہ انداز اور تخمین کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے، اس وجہ سے حضور اقدس ﷺ نے اس بیع کو علی الاطلاق حرام قرار دے دیا، حالانکہ بعض اوقات اندازہ بالکل صحیح یا صحیح کے قریب ہوتا ہے، لہذا اموال ربویہ میں سے بعض کو بعض سے تبادلہ کرنے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ دونوں میں تبادلہ عملی طور پر مقدار میں برابری کے ذریعہ ہو، اندازہ اور تخمین کے ذریعہ برابری کافی نہیں ہے۔

غرض یہ کہ قرضوں کی ادائیگی میں دو باتوں کا لحاظ ضروری ہے، ایک یہ کہ وہ مقدار میں برابر ہو، دوسری یہ کہ وہ برابری یقینی ہو، اندازہ اور تخمین کافی نہیں، اور قرضوں کو قیمتوں کے اشاریہ سے منسلک کرنے میں دونوں باتوں کا لحاظ نہیں ہوتا، دونوں کے خلاف ہوتا ہے؛ چنانچہ قرضوں کو قیمتوں کے اشاریہ سے منسلک کرنے کا مطلب و مقصد یہ ہے کہ قرض دار قرض خواہ کو مقدار میں قرض کے برابر روپیہ ادا نہ کرے، بلکہ قیمتوں کے اشاریہ میں اشیاء کی قیمتوں میں جس تناسب سے اضافہ ہوا ہے اسی تناسب سے قرض میں اضافہ کر کے واپس کرے، گویا کہ قیمت اور مالیت کا اعتبار کر کے قرض ادا کرے جب کہ اوپر احادیث کی روشنی میں یہ جائز نہیں۔ نیز مستحقین نے لکھا ہے کہ اشاریہ کے لئے جو حسابی طریقہ اپنایا جاتا ہے جس کے ذریعہ کرنسی کی حقیقی قیمت کی تعیین ہوتی ہے وہ طریقہ دراصل اٹکل، اندازہ اور تخمین پر مبنی ہوتا ہے، اور اگر کسی جگہ پر یہ حساب باریک بینی اور پوری احتیاط سے بھی کیا جائے تو بھی اس کے نتیجہ کو زیادہ سے زیادہ تقریبی تو کہہ سکتے ہیں، یقینی اور واقعی تو پھر بھی نہیں کہہ سکتے؛ جب کہ اوپر واضح ہو چکا ہے کہ قرضوں کی واپسی میں اٹکل اور اندازہ کافی نہیں ہے۔

پس جب اشاریہ سے مراد یہ کرنے میں نہ مقدار کے اعتبار سے مثلیت کا لحاظ ہوتا ہے اور نہ ہی مثلیت یقینی ہوتی ہے بلکہ ایک تخمینہ ہوتا ہے جس کا انضباط بھی مشکل ہے اور اداء قرض

کے لئے دونوں باتوں کا ہونا ضروری ہے تو پھر ظاہر ہے کہ قرضوں کو اشاریہ سے وابستہ کرنا جائز نہ ہوگا۔ دیون کو اتنی ہی مقدار میں دینا ضروری ہوگا جتنی مقدار میں وہ ذمہ میں واجب ہوا تھا۔ اور جب کرنسی اور نوٹ کو اصطلاحی ثمن مان لیا گیا ہے جیسا کہ اکیڈمی کا بھی فیصلہ ہے تو دیون مؤخرہ میں ادائیگی کے وقت مالیت کے تناسب سے اضافہ غلط ہونا واضح ہے، اس سے فساد کا ہونا، ربا کا دروازہ کھلنا غالب اور یقینی ہے جو سد رائج کے اصول کے پیش نظر ممنوع ہے۔ اور یہ بھی واضح ہے کہ اشاریہ کی ترتیب کے لئے کوئی معیار مرتب کرنا آسان نہیں ہے، ملکوں، شہروں اور طبقوں کا اشاریہ ایک دوسرے سے مختلف ہو سکتا ہے، بلکہ ہر فرد کا اشاریہ دوسرے سے مختلف ہو سکتا ہے، اس لئے جہاں ادائیگیوں میں انضباط مشکل یا غیر ممکن ہے وہیں یہ چیز باہمی تنازعہ کا موجب بھی بن سکتی ہے۔

### خلاصہ کلام:

یہ ہے کہ مذکورہ بالا توضیحات کے پیش نظر دیون کو اشیاء کی قیمتوں کے اشاریہ سے مربوط کرنا درست نہیں ہے۔ حضرت مولانا مفتی تقی عثمانی صاحب نے اس سلسلہ میں مفصل گفتگو کرتے ہوئے بعض سمیناروں کا اتفاق بھی اس بارے میں نقل کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

”جب یہ مسئلہ پاکستان کی ”اسلامی نظریاتی کونسل“ کے سامنے بھی پیش ہوا تو کونسل کے تمام ارکان بشمول علماء و معاشین سب نے اس بات پر اتفاق کیا کہ ”قرضوں کا قیمتوں کے اشاریہ کے ساتھ ربط“ کے نظریہ کی شریعت اسلامیہ میں کوئی گنجائش اور وجہ جواز نہیں ہے“ (فقہی

مقالات ۱/۷۲)۔

آگے لکھتے ہیں:

”اسی طرح خاص اسی موضوع پر ہونے والے سمینار میں بھی بحث کی گئی جس کو اسلامی ترقیاتی بینک، جدہ، اور عالمی ادارہ برائے اسلامی اقتصادیات، اسلام آباد نے مشترکہ طور پر

شعبان ۱۴۰۷ھ میں منعقد کیا تھا، اس سمینار میں مختلف ممالک کے بہت سے علماء اور ماہرین معاشیات نے شرکت کی تھی، وہ قرارداد جس پر تمام شرکاء نے اتفاق رائے ظاہر کیا وہ مندرجہ ذیل ہے:

۱- کرنسی نوٹ تمام معاملات (مثلاً اس میں سود جاری ہونے اور زکوٰۃ واجب ہونے، بیع سلم، مضاربت اور شرکت وغیرہ کے رأس المال بننے) میں نقدین یعنی دراہم اور دنانیر کی طرح ہیں اور امام ابو یوسف کا یہ قول کہ اگر سکوں کی قیمت زیادہ ہو جائے یا کم ہو جائے تو اس صورت میں قرض کی واپسی میں ادائیگی کے وقت نقدین کے تناسب سے سکوں کی قیمت واپس کرنا ضروری ہے، ان کا یہ قول کرنسی نوٹوں میں جاری نہیں ہوگا، اس لئے کہ یہ کرنسی نوٹ نقدین کے قائم مقام ہے، اور ان نقدین کی قیمت بڑھنے اور کم ہونے کا معتبر نہ ہونا متفق علیہ ہے۔

۲- سمینار میں حاضر تمام علماء نے اس بات کی توثیق کی کہ سود اور قرض کی احادیث میں جو مثلثیت اور برابری ضروری قرار دی گئی ہے وہ شرعی جنس اور قدر یعنی وزن، تاپ اور عدد میں برابری مراد ہے، قیمت میں برابری مراد نہیں، اور یہ بات ان احادیث کے ذریعہ پوری طرح واضح ہو جاتی ہے جو احادیث اموال ربویہ کے تبادلہ کے وقت عمدہ اور گھٹیا ہونے کے وصف کو غیر معتبر قرار دیتی ہے اور اسی پر امت کا اجماع ہے اور اسی پر عمل جاری ہے۔

۳- ذمہ میں ثابت شدہ دیون چاہے وہ کسی بھی قسم کے ہوں، ان کو قیمتوں کے اشاریہ کے ساتھ منسلک کر دینا جائز نہیں؛ بایں طور کہ عاقدین عقد بیع یا عقد قرض کے وقت اس کرنسی کو جس کے ذریعہ عقد بیع یا عقد قرض کر رہے ہیں، کسی سامان کے ساتھ منسلک کر کے یہ شرط ٹھہرائیں کہ دیون ادائیگی کے وقت اس سامان کی قیمت موجودہ کرنسی میں ادا کرے گا، (فقہی مقالات ۱)



انٹرنیشنل اسلامک فقہ اکیڈمی جدہ کا فیصلہ بھی یہی ہے، لکھا ہے:

”کسی بھی کرنسی کے ذریعہ واجب دیون کی ادائیگی میں مثل کا اعتبار ہوگا، قیمت کا نہیں؛ کیوں کہ دیون کی ادائیگی اپنے مثل میں ہوتی ہے۔ لہذا ذمہ میں واجب دیون کو خواہ کسی طرح بھی واجب ہوئے ہوں قیمتوں کے اشاریہ (price index) سے مربوط کرنا جائز نہیں ہے“ (جدہ کے فیصلے، ۱۵۷)۔

دوبارہ اس مسئلہ پر غور کرنے کے بعد بھی یہی فیصلہ کیا گیا، چنانچہ آگے لکھا ہے:

”کسی بھی کرنسی سے لازم ہونے والے قرض کی ادائیگی میں مثل کا اعتبار ہوگا، قیمت کا نہیں؛ کیوں کہ قرض کی ادائیگی اپنے مثل سے ہی ہوتی ہے، لہذا جائز نہیں ہوگا کہ ذمہ میں ثابت شدہ قرضوں کو چاہے جیسے ہوں نرخ کے معیار سے مربوط کیا جائے“ (جدہ اکیڈمی کے فیصلے، ۳۳۳)۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب نے لکھا ہے:

”اشیاء صرف کی قیمتوں کے اشاریہ سے نوٹ کو وابستہ کرنے میں ایک تو بڑی وقت ہے، دوسرے یہ اشاریہ محض تخمین پر مبنی ہوگا اور مختلف اشیاء کی قیمتوں کے اوسط سے اشاریہ مرتب کرنا پڑے گا، حالاں کہ افراد و اشخاص کی نسبت سے ان اشیاء صرف کے تناسب اور ان کی ضرورت میں فرق واقع ہوتا رہتا ہے“ (جدید فقہی مسائل، ۴۲/۳)۔

مولانا عتیق احمد بستوی قاسمی صاحب لکھتے ہیں:

”اولاً تو اس لئے کہ اشاریہ دقیق فنی اصولوں پر مبنی ہوتا ہے، لہذا اس پر احکام شرعیہ کا دائر کرنا شریعت اسلامیہ کے مزاج کے خلاف معلوم ہوتا ہے، ثانیاً اس لئے کہ اشاریہ کی ترتیب کے لئے کوئی معیار مرتب کرنا انتہائی دشوار کام ہے، ملکوں، شہروں اور طبقوں کا اشاریہ ایک دوسرے سے مختلف ہو سکتا ہے، بلکہ ہر فرد کا اشاریہ دوسرے سے مختلف ہو سکتا ہے، اس لئے اشاریہ کو بنیاد بنانے میں احکام منضبط نہیں ہو سکیں گے“ (از جدید فقہی تحقیقات: کرنسی نوٹ، ۶۹/۲)۔

۲- واجب الادا قرضوں کی سونے یا چاندی کی قیمت کے مساوی نوٹوں کے ذریعہ ادائیگی:

اس کی دو صورتیں ہیں:

الف- ایک: یہ کہ مہر کے تقرر کے وقت یا ادھار فروختگی کے وقت نوٹوں کی مالیت سونے چاندی میں معلوم کر کے عقد اصلاً سونے یا چاندی کے عوض ہو اور پھر بوقت ادائیگی اسی قدر سونا یا چاندی یا اس کی قیمت کے مساوی نوٹ کی ادائیگی ہو، یہ صورت جائز معلوم ہوتی ہے (واللہ اعلم) لیکن قرض لینے کی صورت میں قرض کی واپسی اسی شئی سے ہو جس میں قرض لیا گیا ہے، اس لئے کہ مقروض کہ ذمہ وہی لازم ہوتا ہے جس پر عملاً اس نے قبضہ کیا تھا۔

مگر اس میں خاص کر چھوٹی رقم کے معاملات میں نوٹوں کی مالیت سونے چاندی یا کسی دوسری چیز میں طے کرنا اور معلوم کرنا آسان نہیں، دشوار کام ہے، البتہ ایسے علاقوں میں یہ دشواری نہیں ہے جہاں ملکی کرنسی کے علاوہ کوئی اور زیادہ مضبوط کرنسی کا رواج ہے، مثلاً براعظم افریقہ کے بعض علاقے: زمبابوے، زامبیا وغیرہ، وہاں کی اصل کرنسی کوچا (kowcha) ہے، اس کے علاوہ ڈالر کا بھی وہاں رواج ہے، وہاں اگر یہ کیا جائے کہ کوچا کی مالیت کے برابر ڈالر میں عقد ہو اور پھر بوقت ادائیگی اسی قدر ڈالر کے مساوی کوچا کی ادائیگی ہو؛ چاہے وہ عقد کے دن کے کوچا کی مقدار کی بہ نسبت کم ہو یا زیادہ، تو یہ درست ہونا چاہئے، اور اس میں کوئی دشواری بھی نہیں ہے۔ جب کہ ہمارے یہاں اس طرح دوسری کرنسی سے یا سونا چاندی سے کرنے میں دشواری پوشیدہ نہیں ہے۔

ب- دوسری صورت یہ ہے کہ عقد اصلاً نوٹ کے عوض ہو، اسی کو ٹخن بنایا جائے، اور پھر نوٹ کی مالیت سونے چاندی میں طے کر کے بوقت ادائیگی اسی قدر سونے چاندی کی قیمت کے مساوی نوٹوں کی ادائیگی ہو، یہ صورت درست معلوم نہیں ہوتی، سود کا چور دروازہ معلوم ہوتی ہے، اور پھر معمولی رقم کی مالیت سونے چاندی میں طے کی جائے اس کا دشوار ہونا بھی ظاہر ہے،

نیز جب نوٹ ٹن عرفی ہے، اس کو اصطلاحی ٹن مان لیا گیا ہے، عملاً شمنیت میں اس کو وہی پوزیشن حاصل ہو چکی ہے جو کسی زمانہ میں سونے چاندی کی کرنسیوں کی تھی، اس لئے کمی بیشی کیسے درست ہو سکتی ہے؟

انٹرنیشنل اسلامک فقہ اکیڈمی جدہ کے فیصلوں میں ہے:

”شرعیہ معاملہ جائز نہیں ہوگا کہ عقد کرتے وقت ادھار قرضوں کو مندرجہ ذیل اشیاء

میں سے کسی شئی سے مربوط کیا جائے:

الف- حسابی کرنسی سے مربوط کرنا۔

ب- اخراجات معیشت کے اشاریہ یا دوسرے اشاریوں سے مربوط کرنا۔

ج- سونے چاندی سے مربوط کرنا۔

د- کسی متعین سامان کی قیمت سے مربوط کرنا۔

ه- قومی پیداوار کے اوسط سے مربوط کرنا۔

و- کسی دوسری کرنسی سے مربوط کرنا۔

ز- شرح سود سے مربوط کرنا۔

ح- مختلف اشیاء کے مجموعہ کی اوسط قیمت سے مربوط کرنا۔

اس لئے کہ ایسے ربط میں بہت زیادہ غرر اور جہالت فاحشہ ہے؛ کیوں کہ کسی فریق کو یہ

نہیں معلوم کہ اسے کیا ملے گا یا اس پر کیا ذمہ آئے گا، جس کے نتیجہ میں عقد کی صحت کے لئے مطلوب

شرط یعنی معلوم ہونا فوت ہو جائے گا، اور اگر یہ اشیاء جن سے قرض کو مربوط کیا جائے گا اوپر کو

چڑھیں تو اس سے جو اصل ذمہ میں واجب ہے اور جسے ادا کرنا ہے دونوں میں عدم تماثل لازم

آجائے گا اور یہ معاہدہ میں مشروط ہونے کی وجہ سے ربا ہو جائے گا“ (جدہ کے شرعی فیصلے، ۳۳۵-

مذکورہ بالا مسائل میں امام ابو یوسفؒ کے قول سے استدلال محل نظر ہے، علامہ شامی نے لکھا ہے: ”وفی المنتقی: إذا غلت الفلوس قبل القبض أو رخصت قال أبو یوسف: قولی وقول أبی حنیفة فی ذلک سواء ولیس له غیرها ثم رجع أبو یوسف وقال: علیہ قیمتہا من الدراہم یوم وقع البیع ویوم وقع القبض“ (تنبیہ الرقود علی مسائل الرقود، رسائل ابن عابدین ۲/۵۵)۔

وجہ نظریہ ہے کہ امام ابو یوسفؒ کا مذکورہ بالا قول ایسے فلوس کے بارے میں ہے جس کا کسی دوسرے ثمن کے ساتھ دائمی ربط اور تعلق ہو کہ وہ فلوس اس ثمن کے لئے بطور اجزاء اور ریزگاری کے استعمال ہوتے ہوں، جیسا کہ علامہ شامی کی ایک عبارت سے واضح ہوتا ہے، لکھا ہے: ”ویدل علیہ ایضا تعبیرہم بالغلاء والرخص فإنہ إنما یظہر إذا کانت غالبۃ الغش تقوم بغیرہا“ (تنبیہ الرقود، رسائل ابن عابدین ۲/۶۰)، اس عبارت میں ”تقوم بغیرہا“ کے الفاظ سے واضح ہوتا ہے کہ وہ فلوس کے سکے اور غالب الغش دراہم دوسرے یعنی سونے چاندی کی کرنسی سے وابستہ تھے اور سونے چاندی کی بنیاد پر ہی ان کی قیمت مقرر ہوتی تھی اور یہ سکے سونے چاندی کی کرنسی کے لئے بطور ریزگاری اور چینج کے استعمال ہوتے تھے۔ لیکن جہاں تک موجودہ کرنسی نوٹوں کا تعلق ہے ان کا کسی دوسرے ثمن کے ساتھ ربط اور تعلق نہیں ہے اور نہ وہ کرنسی کسی ثمن کے لئے بطور ریزگاری اور اجزاء کے استعمال ہوتی ہے، بلکہ وہ خود مستقل اصطلاحی ثمن ہے۔ اس کے علاوہ فلوس کی صحیح قیمت معلوم کرنا امام ابو یوسفؒ کے قول کے مطابق ممکن ہے؛ اس لئے کہ فلوس ثمن کے ایک معین معیار یعنی درہم کے ساتھ مربوط ہیں، بخلاف موجودہ کرنسی نوٹوں کے کہ موجودہ معاشی اصطلاح کے لحاظ سے ان کی حقیقی قیمت ٹھیک ٹھیک معلوم کرنا ممکن نہیں، بلکہ حقیقی قیمت اندازہ اور تخمینہ کی بنیاد پر فرض کی جائے گی، اس لئے موجودہ کرنسی نوٹوں کو فلوس پر قیاس کرنا درست نہیں ہے۔ اور امام ابو یوسفؒ کے قول سے استدلال بھی صحیح نہیں ہے۔

اسلامی ترقیاتی بینک، جدہ اور عالمی ادارہ برائے اسلامی اقتصادیات، اسلام آباد کے تحت منعقد ہونے والے سمینار کی قراردادوں میں ہے:

” کرنسی نوٹ تمام معاملات (مثلاً اس میں سود جاری ہونے اور زکوٰۃ واجب ہونے، بیع مسلم اور مضاربت اور شرکت وغیرہ کے راس المال بننے) میں نقدین یعنی دراہم و دنانیر کی طرح ہیں اور امام ابو یوسف کا یہ قول کہ اگر سکوں کی قیمت زیادہ ہو جائے یا کم ہو جائے تو اس صورت میں قرض کی واپسی میں ادائیگی کے وقت نقدین کے تناسب سے سکوں کی قیمت اور ان نقدین کی قیمت بڑھنے اور کم ہونے کا معتبر نہ ہونا متفق علیہ ہے“ (فقہی مقالات ۱/ ۷۲)۔

## موجودہ کرنسی نوٹ کی شرعی حیثیت

مفتی محمد خالد حسین نیوی قاسمی ☆

پہلے زمانے میں زر مبادلہ کے طور پر سونے اور چاندی کے سکوں کا رواج تھا اور ”شمن حقیقی“ یا ”شمن خلقتی“ کے طور پر سونے کے سکے ”دینار“ اور چاندی کے سکے ”درہم“ اپنا کردار بخوبی ادا کر رہے تھے۔ اس کے لئے نہ تو کسی قانونی سند کی ضرورت تھی نہ کسی کے اعتبار کی۔ عہد رسالت میں انہی سکوں کا رواج تھا۔ بعد کی صدیوں میں سونے اور چاندی کے سکوں کی جگہ پیتل، تانبا، رانگے، لوہے اور دوسرے دھاتوں کے سکے لے لے لی۔ علماء و فقہاء نے اس صورت حال میں یہ غور کیا، احکام بدلے اور دھات کے ان سکوں کو ”خلقتی شمن“ کا درجہ تو نہیں مل سکا البتہ انہیں ”شمن رواجی“ کی حیثیت حاصل ہوئی، یہاں تک کہ آہستہ آہستہ ان سکوں کا چلن بھی ختم ہو گیا اور ان کی جگہ کاغذی نوٹوں نے لے لی۔ یہ کرنسی نوٹ کاغذ کا محض ایک ٹکڑا ہوتے ہیں۔ ان کی بذات خود کوئی خاص قیمت نہیں ہوتی لیکن ملک کے ریزرو بینک کی طرف سے روپے کی ادائیگی کی یقین دہانی اور سونے کے ساتھ اس کا مربوط ہونا کرنسی نوٹ کو قانونی اعتبار بخشتا ہے اور اسے لوگوں کا اعتماد حاصل ہوتا ہے۔ بلاشبہ ابتدائی مراحل میں کاغذی نوٹوں کی حیثیت محض سند اور وثیقہ کی تھی، لیکن زمانہ دراز سے کاغذی نوٹ ”مستقل شمن“ کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔ پوری دنیا میں باہمی لین دین کاغذی نوٹوں کے ذریعہ ہی انجام پاتے ہیں۔ ۱۹۷۰ء تک اس بات کی پابندی کی

☆ معتمد جامعہ رشیدیہ، جامع مسجد، بیگوسرائے (بہار)۔

جاتی تھی کہ کرنسی نوٹ اتنے ہی جاری کئے جائیں جتنی مالیت کا سونا ملک کے خزانہ میں موجود ہو۔ لیکن ۱۹۷۱ء کے بعد عالمی طور پر یہ التزام بھی ختم ہو گیا۔ اب نوٹ کی جو بھی قیمت ہے وہ محض اس کے قانونی استناد اور عوامی اعتماد کی وجہ سے ہے۔ اس کے ذریعہ تعامل و تبادلہ کرتے وقت یہ خیال بھی نہیں آتا کہ اس کا تعلق سونے یا چاندی سے بھی ہے۔ اسی طرح یہ تصور بھی نہیں ہوتا کہ یہ نوٹ محض ایک وثیقہ اور سند ہے، جس کی ادائیگی بینک کے ذمہ ہے۔ جب کہ اس کی جگہ پر دوسرے وثیقہ جاتی کاغذات مثلاً چیک، ڈرافٹ، پے آرڈر میں آج بھی لوگوں کی نظر میں ان کے وثیقہ اور سند ہونے کی حیثیت برقرار ہے۔ لہذا موجودہ عالمی صورت حال اور بین الاقوامی قوانین کے پیش نظر اس امر میں کسی تردد اور شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہ جاتی ہے کہ موجودہ کرنسی نوٹ شرعی نقطہ نظر سے ”نمن قانونی“ اور ”زرا اصطلاحی“ کا درجہ رکھتے ہیں۔ البتہ یہ مکمل طور پر ”نمن خلقی“ یعنی سونا اور چاندی کی طرح نہیں ہیں۔ ان میں دو طرح کی مشابہتیں پائی جاتی ہیں۔ (۱) سونے اور چاندی کے ساتھ۔ (۲) فلوس اور دھات سے بنے سکوں کے ساتھ۔ پہلی مشابہت کی وجہ سے نوٹوں پر ربا کے احکام جاری ہوں گے، ہر ملک کی کرنسی علاحدہ جنس ہوگی۔ لہذا ایک ملک کی کرنسی کی بیچ اسی ملک کی کرنسی سے کمی و بیشی کے ساتھ نہ تو نقد جائز ہوگی نہ ادھار۔ دوسری مشابہت کی وجہ سے بیچ صرف کے تمام احکام مثلاً تقابض وغیرہ جاری نہیں ہوں گے۔

مؤخر مطالبوں میں ادائیگی کا معیار کیا ہو؟

جب سونا اور چاندی سے تعامل کا رواج تھا، تو اس وقت وصف خاص ”نمن خلقی“ ہونے کی وجہ سے یہ دونوں چیزیں محض ذریعہ تبادلہ نہیں بلکہ ایک حد تک اشیاء کی قدر و قیمت کی حفاظت اور دیون (مؤخر مطالبات) مثلاً قرض، مہر، پینشن، بقایہ جات وغیرہ کی ادائیگی کا معیار بھی تھیں۔ بالفرض اگر سونے چاندی کے سکے کی قانونی حیثیت ختم ہو جائے پھر بھی وہ سکے اپنی قدر و قیمت برقرار رکھتے ہیں، لیکن کاغذی نوٹوں کی اپنی ذاتی کوئی قیمت نہیں ہوتی اور عالمی منڈی

میں افراط زر (INFLATION) کی صورت میں تیزی سے ان کی قیمت گر جاتی ہے، جس سے مؤخر مطالبوں کے مستحقین کا زبردست مالی نقصان ہوتا ہے۔ ایسے حالات میں صاحب حق کو خسارہ سے کیسے بچایا جائے اور اسے حق تلفی سے کیسے محفوظ رکھا جائے۔ اسلام کے عدل کا تقاضہ ہے کہ مقاصد شریعت کی روشنی میں اس کا حل پیش کیا جائے۔ افراط کی صورت میں چاہے روپے کی قیمت گرے یا اشیاء کی گرانی بڑھے نقصان بہر حال صاحب حق کا ہے۔

عدداً اشاریہ معیار نہیں بن سکتا:

اس نقصان کے مدارک کے لئے بعض دانشوروں نے یہ رائے دی ہے کہ کرنسی نوٹ میں قدر و قیمت کے تعین کے لئے ماہرین اقتصادیات کے مقرر کردہ عدداً اشاریہ کو پیمانہ بنایا جائے۔ اور قرض دیتے وقت اور واپسی کے وقت روپے کی قدر میں جو فرق ہو اس کی تکمیل قرض لینے والے کے ذمہ کیا جائے۔ لیکن سچائی یہ ہے کہ عدداً اشاریہ کو ادائیگی کا پیمانہ بنانا عملی طور پر ممکن نہیں ہے۔ اس لئے کہ اشاریہ دقیق فنی اصولوں پر مبنی ہوتا ہے، خود ماہرین اقتصادیات کی نظر میں بھی اس کی مکمل عملی تطبیق ممکن نہیں ہے۔ ماہر اقتصادیات بین ہورم اور ایچ لیوی کی رائے ہے کہ: ”عدداً اشاریہ کا استعمال جملہ مالیاتی امور میں مکمل طریقے پر ناقابل عمل ہے“ (بحوالہ بحث فی قضایا فقہیہ معاصرہ ۱۹۰۰ از مفتی تقی عثمانی)۔

اسی وجہ سے اب تک عالمی طور پر کسی بھی ملک میں مالیاتی امور کو مکمل طور پر عدداً اشاریہ سے مربوط نہیں کیا جاسکا ہے۔ خاص طور پر بینک میں جو رقم رکھی جاتی ہے مدتوں بعد آج بھی اتنی ہی رقم کی واپسی ہوتی ہے، سودی نظام کی وجہ سے صرف اس رقم کی سود میں اضافہ ہوتا ہے، شریعت اسلامیہ میں عامۃ الناس کے لئے ایسے امور کو ناپسندیدہ قرار دیا ہے جس کی بنیاد دقیق اصول اور ظن و تخمین ہو، چنانچہ چاند کے ثبوت کے مسئلے کو فلکیات کے دقیق اصول پر مبنی نہیں قرار دیا گیا بلکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”إنا أمة أمية لا نكتب ولا نحسب ونعد الشهر



ہکذا و ہکذا و ہکذا“، اسی طرح رسول کریم ﷺ نے بیع مزابنہ سے منع فرمایا ظن و تخمین پر مبنی ہونے کی وجہ سے۔ خلاصہ یہ کہ اشاریہ کے ذریعہ واجبات کی ادائیگی کا تصور بالکل بنانا قابل عمل اور بے شمار نزاعات کا سبب ہے، ضروری نہیں کہ ہر وقت افراط زر کا منظر نامہ موجود رہے۔ بالفرض اگر تفریط زر (DEFLATION) کی صورت حال پیدا ہوگئی اور کرنسی نوٹ کی قیمت بڑھنے لگی اور اشیاء کی قیمتیں گھٹنے لگیں، تو کیا مؤخر مطالبات کی ادائیگی واجب الاداء روپیوں سے کم روپیوں کے ذریعہ کی جائے گی؟ کون شخص اس صورت حال کے لئے تیار ہوگا؟ دوسری پریشانی واجبات کی ادائیگی اشاریہ سے وابستہ کرنے میں یہ ہے کہ اشاریہ محض ظن اور تخمین پر مبنی ہوتا ہے اور مختلف افراد و اشخاص کے اعتبار سے ان اشیاء صرف کے تناسب اور ان کی ضرورت میں فرق واقع ہوتا رہتا ہے۔ الحاصل واجبات کو اشاریہ سے مربوط کرنے کا تخیل سراپا درد سر ہے، اور اس سے بے شمار جھگڑے پیدا ہو سکتے ہیں اور جھگڑے کا باعث بننے والے امور شریعت کی نگاہ میں پسندیدہ نہیں ہیں، سیکڑوں ایسے معاملات ہیں جو ”مفرضی الی النزاع“ ہونے کی وجہ سے ناجائز قرار دیئے گئے ہیں۔

بالتعمیر

اس سے سود کا دروازہ کھلے گا:

اگر بالفرض واجبات اور مؤخر مطالبات کو اشاریہ سے مربوط کیا جاتا ہے تو سود خوروں اور سودی لین دین کرنے والوں کی چاندی ہو جائے گی۔ وہ بھی یہ کہہ کر سود لینا شروع کر دیں گے کہ ہم یہ زائد رقم مدت اور وقت کے بدلے میں نہیں لیتے بلکہ اشیاء کی بڑھتی ہوئی گرانی اور روپے کی قدر میں کمی کی وجہ سے لے رہے ہیں۔ اس طرح کی توجیہ بینکوں کو دیئے جانے والے سود بلکہ ہر سود میں کمی کی جاسکتی ہے یا آزادانہ طور پر لوگ کرنے لگیں گے۔ اسی خطرے کو بھانپتے ہوئے گذشتہ زمانے کے فقہائے کرام نے کھوٹے سکوں کے تقاضل کو بھی جائز قرار نہیں دیا، علامہ مرغینانی فرماتے ہیں:

”ومشائخنا لم يفتوا بجواز ذلك في العدالي والخطارفة لأنها أعز  
الأموال في ديارنا فلو أبيع التفاضل فيه يفتح باب الربوا“ (ہدایہ ۳/۹۳)۔

(ہمارے مشائخ نے عدالی اور غطارفہ اصطلاحی سکوں میں بھی تفاضل کے جو جواز کا  
فتویٰ نہیں دیا ہے، اس کے لئے ہمارے دیار میں یہ بیش قیمت مال شمار ہوتے ہیں، اگر تفاضل کو  
ان سکوں میں مباح کر دیا گیا تو سود کا دروازہ کھل جائے گا)۔

اس کی تشریح کرتے ہوئے علامہ ابن ہمام فرماتے ہیں:

”فإن الناس يعتادون التفاضل في الأموال النفيسة فيندرجون إلى  
ذلك في النقود الخالصة، فمنع ذلك حسماً لمادة الفساد“ (فتح القدیر ۷/۲۷۵)۔

(لوگ اس وقت نفیس اموال میں تفاضل کے عادی ہو جائیں گے اور بتدریج خالص  
نقود میں بھی تفاضل تک پہنچ جائیں گے، اس لئے مادہ فساد کو ختم کرنے کے لئے اس سے روکا گیا)۔  
حاصل یہ ہے کہ یہ اکابر بھی اس بات کو بھی ملحوظ رکھ رہے ہیں کہ خود یہ اگرچہ سودی

معاملہ نہیں ہے لیکن یہ اس سود کی ترویج کا سبب بن سکتا ہے جس کو شریعت نے حرام قرار دیا ہے:  
”أحل الله البيع وحرم الربوا“ (سورہ بقرہ) اور جس کے حلال سمجھنے والوں کے لئے منجانب

اللہ اعلان جنگ کیا گیا ہے: ”فأذنوا بحرب من الله ورسوله“ (البقرہ)۔ ربوا اور اس تفاضل  
میں اس طرح فرق کیا جاسکتا ہے کہ ”ربا“ مدت کی اجرت ہوتی ہے اور زیادتی پہلے سے متعین  
شدہ ہوتی ہے جو یہاں مفقود ہے۔ اس کے باوجود تفاضل کو ناجائز قرار دینا اس معاملہ کی سنگینی کو

بتاتا ہے۔ یہ امر بھی قابل غور ہے کہ دین میں جو مثلیت مطلوب ہے وہ مقدار اور کمیت میں مثلیت  
ہے قیمت اور مالیت میں نہیں، مثلاً اگر کسی شخص نے ایک کیلو ڈال اس وقت قرض لیا جب کہ اس کی  
قیمت بیس روپے فی کیلو تھی۔ واپسی کے وقت اگر ڈال کی قیمت پچاس روپے فی کیلو ہو جائے تو

بھی واپسی ایک ہی کیلو کی ہوگی، قیمت کی کمی زیادتی ”ہرز“ اور بے کار ہوگی۔

## ادھار معاملے میں سونے یا چاندی کا تعین:

سب سے بہتر شکل یہ ہے کہ ادھار معاملوں میں خود سونے یا چاندی کی ایک مقدار معین کی جائے۔ مثلاً مہر دین میں بہت سے علاقوں میں سونے یا چاندی کی ایک مقدار متعین کرنے کا ایک رواج ہے۔ حقوق نسواں کے تحفظ کے لئے یہ ایک بہترین قدم ہے۔ ضرورت ہے کہ اس رواج کو عام کیا جائے۔ اسی طرح دوسرے مطالبات میں بھی سونے یا چاندی کی مقدار متعین کی جائے تاکہ فریقین کے حقوق کا تحفظ ہو سکے۔ مہر دین میں تو یہ بات آسانی کے ساتھ چلے گی، لیکن قرض دیتے وقت یا ادھار فروختگی کے وقت کیا شکل اختیار کی جائے یہ محل بحث ہے۔ اس لئے کہ قرض کا مقصد اور فروختگی کا مقصد عام طور پر رقم کا حصول ہوتا ہے اور ہر شخص کے پاس سونا اور چاندی کی مطلوبہ مقدار موجود ہو کوئی ضروری نہیں۔ اور بازار سے پہلے سونا اور چاندی خریدا ہو جائے پھر قرض لینے والا اپنی ضرورت کے لئے فروخت کرے اس میں طول عمل ہے جو قرض جیسے کار خیر کے بند ہونے کا سبب ہو سکتا ہے۔ اس کا حل یہ ہے کہ مؤخر مطالبات میں معاملہ طے کرتے وقت فریقین یہ بات باہم طے کریں کہ موجودہ وقت میں طے کردہ نوٹوں کی سونے یا چاندی کے اعتبار سے جو مالیت ہے اسی قدر سونے یا چاندی کی قیمت کے مساوی نوٹوں کی ادائیگی وقت مقرر پر کی جائے گی۔ اس حل کی تائید فی الجملہ امام ابو یوسفؒ کے اس قول سے ہوتی ہے جسے علامہ ابن عابدینؒ نے اپنے رسالہ ”تنبیہ الرقود علی مسائل النقود“ میں نقل کیا ہے:

”وفی البرازية معزياً إلى المنتقى غلت الفلوس أو رخصت فعند الإمام والثاني أولاً ليس عليه غيرها وقال الثاني ثانياً عليه قيمتها من الدراهم يوم البيع والقبض وعليه الفتوى فحيث صرح بأن الفتوى عليه في كثير من المعترات فيجب أن يتول عليه افتاءً وقضاءً“ (۶۰/۲ مطبوعہ دیوبند)۔

(منتقى کے حوالہ سے بزاز یہ میں ہے کہ فلوس مہنگے ہو گئے ہوں یا سستے دونوں صورتوں

میں امام اعظمؒ اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک ان کے پہلے قول میں فلوس ہی ذمہ میں واجب ہوں گے؛ لیکن امام ابو یوسفؒ کے قول ثانی میں فلوس کی قیمت دراہم میں واجب ہوگی۔ قیمت کا اعتبار بیع کے دن یا قرض لینے کی صورت میں فلوس پر قبضہ کے دن ہوگا۔ اسی قول پر فتویٰ ہے۔ صاحب بحر نے صراحت کی ہے کہ بہت سی کتب معتبرہ میں اسی پر فتویٰ ہے۔ اسی لئے فتویٰ یا قضا میں اسی پر اعتماد کیا جائے۔

حالانکہ اس قول کی دوسری توجیہات بھی کی گئی ہیں (دیکھئے بحوث فی قضا یا فقہیہ) لیکن بہر حال مذکورہ صورت کی گنجائش بھی نکلتی ہے، اس کے علاوہ اس کی تائید دارالعلوم دیوبند کے سابق مفتی اعظم حضرت الاستاد مفتی نظام الدین صاحبؒ کے مندرجہ ذیل فتویٰ سے بھی ہوتی ہیں جو انہوں نے قرض کی رقم کے ڈی ویلوشن کے سوال پر لکھا ہے کہ: ”اس قرض میں لئے ہوئے نوٹوں کی قرض لینے کے زمانے میں جتنی چاندی ملتی یا جتنا سونا ملتا اتنی چاندی میں یا اتنے سونے میں جتنے نوٹ آج بوقت ادائلیں اتنے ہی نوٹ دینے ہوں گے۔ پس نقدین میں سے جو زیادہ رائج ہوگا اس کا اعتبار ہوگا اور نوٹ اس کے تابع ہوں گے“ (نظام الفتاویٰ ۱/۲۳۲)۔ یہ تفصیلات اس وقت ہوں گی جب قرض دیتے وقت یا معاملہ کرتے وقت رقم کی مالیت آئندہ اندیشہ کے پیش نظر سونے یا چاندی میں طے کر لے ورنہ نہیں۔ اس لئے کہ صاحب دین کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے حق کو کلی یا جزوی طور پر معاف کر دے یا کم کر دے۔

### خلاصہ بحث:

- ۱- موجودہ کرنسی نوٹ ”شمن عرفی“ یا ”شمن قانونی“ کا درجہ رکھتا ہے۔
- ۲- اس کی حیثیت ابتدائی مراحل میں سند اور وثیقہ کی تھی۔ لیکن اب یہ محض وثیقہ نہیں ہے۔
- ۳- ہر ملک کی کرنسی الگ الگ جنس ہے اور ایک ملک کی کرنسی ایک ہی جنس ہے۔ اس میں تقاضل کی صورت میں ”ربا“ کے احکام جاری ہوں گے۔ البتہ بیع صرف کے دیگر احکام مثلاً

تقابض وغیرہ جاری نہ ہوں گے۔

۴- مؤخر مطالبات کو اشاریہ سے وابستہ کرنا شرعی طور پر درست نہیں ہے۔ اس لئے کہ وہ بے شمار نزاعات کا باعث ہے اور اس کی بنیاد ظن و تخمین پر ہے۔

۵- مؤخر مطالبات کو اشاریہ سے وابستہ کرنا بلاشبہ سود کے دروازے کو کھولنا ہوگا۔

۶- مہر دین میں خود سونے اور چاندی کی ایک مقدار مقرر کی جائے اور ادائیگی کے وقت بازار میں جو نرخ ہو اس کے بقدر رقم وصول کی جائے۔

۷- قرض اور ادھار لین دین کے وقت واجب الاداء نوٹ کی مالیت سونے یا چاندی میں طے کر کے ادائیگی کے وقت اسی کے مساوی رقم ادا کرنے کی گنجائش مقاصد شریعت اور عدل اسلامی کے پیش نظر نکل سکتی ہے۔ واللہ اعلم۔

## مؤخر مطالبات کی ادائیگی بذریعہ کرنسی

مولانا خورشید احمد اعظمی ☆

موجودہ کرنسی (کاغذی نوٹ) کا استعمال، عصر حاضر میں کثرت و عموم کے ساتھ، کسی تردد اور پس و پیش کے بغیر رائج ہے، خرید و فروخت اور دیگر لین دین کے معاملات میں اسی کا تعامل ہے، اسی کے ذریعہ اشیاء کے نرخ اور قیمتیں مقرر کی جاتی ہیں، اور بطور پونجی و سرمایہ اسی کا ادخار بھی کیا جاتا ہے؛ اس لئے یہ کاغذی نوٹ، اگرچہ فی نفسہ اپنی کوئی خاص قیمت نہیں رکھتے، مگر ان کو قانونی حیثیت اور حکومت کا اعتماد حاصل ہے، نیز عوام ان کے قبول کرنے پر مجبور ہیں۔ نہ قبول کرنے کی صورت میں قانونی مجرم سمجھے جاتے ہیں، اور عوام نے بلا خوف و خطر انہیں قبول کر بھی لیا ہے؛ اس لئے ان کاغذی نوٹوں کو قانوناً اور عرفاً شمن کی حیثیت حاصل ہے۔ اگرچہ ماشی میں بھی نیز عصر حاضر میں بھی بعض علماء اور اہل فتاویٰ ان کاغذی نوٹوں کے سند و حوالہ ہونے کا ہی رجحان رکھتے ہیں۔ مگر ناچیز کا رجحان شمنیت کی طرف ہے، تبصر عالم و فقیہ مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہ نے بھی ان کاغذی نوٹوں کو شمن قرار دیا ہے۔

”وبالجملة صارت هذه الأوراق اليوم كالنقود، ويطلق عليه اسم النقد والعملة في العربية والانكليزية والاردية..... ولا يوجد اليوم أحد يطمع فيما وراءها من ذهب أو فضة، لا لأنه لا يحتاج إليها بعد شيوع التعامل

به فحسب، بل لأن معظم الممالك اليوم تصدرها كالأثمان العرفية ولا يكون وراءها شيء من الذهب أو الفضة فالذي أرى أن القول بثمانية أصبح قويا“  
(تكملة فتح المسلم ۱/۵۱۹)۔

(خلاصہ کلام یہ کہ یہ کاغذات (نوٹ) آج کل سکوں کی طرح ہو گئے ہیں، اور عربی، انگریزی نیز اردو میں ان پر کرنسی اور سکہ کا اطلاق کیا جاتا ہے..... اور آج کل کوئی بھی ان کی پشت پر سونے یا چاندی کی خواہش نہیں رکھتا، اس لئے نہیں کہ وہ صرف ان (کاغذی نوٹوں) کے تعامل کے بعد ان دونوں (سونے، چاندی) کا محتاج نہیں ہے؛ بلکہ اس لئے کہ آج تمام ممالک ان (کاغذی نوٹوں) کو ثمن عرفی کے طور پر جاری کرتے ہیں، اور ان کے پیچھے کوئی سونا چاندی نہیں ہوتا، اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ ان کے ثمن ہونے کا قول قوی ہو چکا ہے)۔

کاغذی نوٹوں کو بالمقابل سونے چاندی کے ان کے ثمن خلقی ہونے کے اعتبار سے دیکھا جائے، تو کہا جاسکتا ہے کہ ان (کاغذی نوٹوں) کی قیمت کم و بیش ہوتی ہے مگر دیگر عروض، اور سامان و اجناس کے لحاظ سے یہ کہنا مشکل ہو جاتا ہے؛ کیوں کہ بہت سی اشیاء جن کے لئے کل زیادہ کرنسی ادا کرنی پڑتی تھی، آج وہ اس سے کم کرنسی میں دستیاب ہیں، جس طرح اکثر اشیاء کے لئے بہ نسبت ماضی کے آج زیادہ کرنسی ادا کرنی پڑتی ہے، نیز اشیاء کی شرح گرانہ بھی مساوی نہیں ہے، اس لئے یہ کہنا زیادہ مناسب اور سہل ہے کہ اشیاء کی قیمت کم و بیش ہوتی ہے نہ کہ کرنسی کی، اور اس سلسلہ میں ایک روایت سے بھی مدد ملتی ہے، جس میں حضرت عمرؓ نے اونٹوں کے گراں ہونے کا اعتبار کیا ہے:

” كانت قيمة الدية على عهد رسول الله ﷺ ثمان مائة دينار أو ثمانية آلاف درهم، ودية أهل الكتاب يومئذ النصف من دية المسلمين، قال فكان ذلك كذلك حتى استخلف عمر رضي الله عنه، فقام خطيباً فقال: ألا إن

الإبل قد غلت، قال ففرضها عمر على أهل الذهب ألف دينار، وعلى أهل الورق اثني عشر ألفاً..... الخ" (سنن أبي داود ۳/۱۸۳، حدیث نمبر: ۴۵۸۲)۔

(رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں دیت کی قیمت آٹھ سو دینار یا آٹھ ہزار درہم تھی، اور اہل کتاب کی دیت ان دنوں مسلمان کی دیت کے نصف تھی، اور یہ معاملہ ایسا ہی رہا یہاں تک حضرت عمرؓ خلیفہ ہوئے، پھر وہ تقریر کے لئے کھڑے ہوئے اور انہوں نے فرمایا: سنو! اونٹ گراں ہو گئے ہیں، چنانچہ حضرت عمرؓ نے اس کو سونے والوں پر ایک ہزار دینار اور چاندی والوں پر بارہ ہزار (درہم) مقرر کر دیا)۔

نیز ایسا بھی نہیں ہے کہ سونے یا چاندی کی ایک متعینہ مقدار میں کل کسی سامان کو ہم جتنا خرید سکتے تھے، آج وہ سامان اسی مقدار میں اتنے ہی سونے یا چاندی میں فراہم ہوں، اور سونے چاندی کے لحاظ سے بھی اشیاء کی قیمتوں میں تفاوت بہ نسبت ماضی کے یکساں نہیں ہے، بعینہ یہی حال کاغذی نوٹوں کا بھی ہے، لہذا:

۱- کاغذی نوٹوں کی اپنی کوئی ذاتی قیمت نہ ہونے کے باوجود چون کہ ان کی قانونی قیمت اور حیثیت مضبوط ہے، اور عوام کو اس کی قانونی حیثیت پر اعتماد ہے، اور انہوں نے اسے قبول بھی کیا ہے، اس لئے ان کاغذی نوٹوں پر ان کی مذکورہ قیمت کو مستقل مانا جائے، اور موخر مطالبات (قرض، مہر پنشن، ادھار خریداری کی رقم اور وقت پر ادا نہ ہونے والی تنخواہوں کی ادائیگی) کو قیمتوں کے اشاریہ سے وابستہ نہ کیا جائے۔

- کیوں کہ عامۃ الناس کے درمیان ادائیگیوں کے لئے ایسا معیار مقرر کرنا جن کی بنیاد دقیق فنی اصولوں پر ہو، ان کے لئے زحمت و حرج، اور مستقل باہمی تنازع کا موجب ہوگا۔

- اور اگر مان بھی لیا جائے کہ کرنسی کی قیمت بھی کم و بیش ہوتی ہے، اور اس کی قیمت کا معیار، سونا، چاندی یا کوئی اور شے ہے، جن کی قیمتیں روز ہی بلکہ صبح و شام بدلتی رہتی ہیں، اور



ادھار خرید و فروخت یا قرض و استقراض وغیرہ امور کثیر الوقوع ہیں، لہذا کسی بھی ایسے معاملہ میں جس کی ادائیگی مؤخر ہو، عقد معاملہ اور ادائیگی دونوں مواقع پر اس کی قیمت معلوم کرنے میں عوام تو کیا خواص کو بھی وقت اور تنگی پیش آئے گی، اور شریعت کا مزاج تیسیر کا ہے نہ کہ تعسیر کا۔

- نیز اس کاغذی نوٹ (کرنسی) کو سند و حوالہ قرار دیا جائے جو سونے یا چاندی کے ایک مخصوص وزن کی نمائندگی کرتے ہیں تو ظاہر ہے کہ ہر دور ہی میں وہ اس کے اسی مخصوص وزن کی نمائندگی کریں گے۔ مثلاً ایک ہزار کا نوٹ جس وقت صادر ہو گیا، اس وقت وہ جتنے سونے کی قیمت رکھتا ہے دس سال کے بعد بھی وہ اتنے ہی وزن سونے کی قیمت رکھے گا۔

- اور اگر اسے سند و حوالہ نہیں، بلکہ مستقل ثمن مانتے ہیں، تو جتنا ذمہ میں واجب ہوا ہے مؤخر ادائیگی کی صورت میں بھی اتنا ہی ادا کرنا ہوگا، اس لئے کہ دیون کی ادائیگی اس کے مثل سے ہی ہوتی ہے۔

”استقرض من الفلوس الرائجة والعدالی فکسدت، فعلیہ مثلھا کاسدہ ولا یغرم قیمتھا و کذا کل ما یکال ویوزن، لما مر أنه مضمون بمثلہ، فلا عبرة بغلائہ ورخصہ“ (در مختار مع شامی ۷/۳۹۰)۔

(رانج فلوس یا ایسے در اہم جن میں غش غالب ہے کو قرض میں لیا، پھر وہ بند ہو گئے، تو اس پر اسی کے مثل لازم ہوگا ان کے بند ہونے کے باوجود، اور وہ ان کی قیمت کا ضامن نہیں ہوگا، اور ایسے ہی ہر وہ شے جو ناپی یا تولی جاتی ہے بہ سبب اس کے جو گزر چکا کہ وہ مضمون ہے اپنے مثل کا، لہذا اس کے سستے یا مہنگے ہونے کا اعتبار نہیں ہوگا)۔

اس میں صاحبین اور امام صاحب کا اختلاف ہے، مگر یہ اس صورت میں جب کہ وہ سکے بند ہو چکے ہوں، اور اگر وہ سکے رانج ہیں تو پھر اس کے دیون کی ادائیگی اس کے مثل سے ہی ہوگی، ان کے گراں یا ارزاں ہونے کا اعتبار نہیں ہوگا، علامہ شامی اس کے تحت لکھتے ہیں:

”وإن استقرض دائق فلوس أو نصف درهم فلوس ثم رخصت أو غلت لم يكن عليه إلا مثل عدد الذي أخذه“ (شامی ۷/۳۹۰)۔  
 (اور اگر درہم کا معمولی حصہ یا نصف درہم فلوس قرض لیا پھر وہ رخصت یا غالی ہو گئے، تو اس پر نہیں لازم ہوگا مگر اسی عدد کے مثل جو اس نے لیا ہے)۔  
 نیز آگے لکھتے ہیں:

”وفی الفتاویٰ الہندیۃ: استقرض حنطۃ فأعطی مثلها بعد ما تغیر سعرها یجبر المقرض علی القبول“ (شامی ۷/۳۹۰)۔  
 (اور فتاویٰ ہندیہ میں ہے کہ اگر گیہوں قرض میں لیا، اور اس کا ریٹ بدل جانے کے بعد اتنا ہی واپس کیا تو قرض دینے والا اس کے قبول کرنے پر مجبور کیا جائے گا)۔  
 حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے، فرماتے ہیں:

”كنت أبيع الإبل بالبيع، فأبيع بالدنانير، فأخذ مكانها الورق، وأبيع بالورق، فأخذ مكانها الدنانير فأتيت رسول الله ﷺ، فوجدته خارجاً من بيت حفصة، فسألته عن ذلك فقال: ”لا بأس به بالقيمة“ (سنن الترمذی ۳/۳۳۵، حدیث نمبر: ۱۲۲۲)۔

(میں بیچ کے مقام پر اونٹ بیچا کرتا تھا، تو میں دیناروں سے فروخت کرتا، اور ان کی جگہ چاندی یعنی درہم لے لیتا، اور چاندی کے بدلہ فروخت کرتا اور ان کی جگہ دینار لے لیتا، پھر میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس وقت آپ حضرت حفصہؓ کے مکان سے نکل رہے تھے، تو میں نے آپ سے اس طریقہ کار کے متعلق دریافت کیا تو آپ نے فرمایا: قیمت کے اعتبار سے اس میں کوئی حرج نہیں)۔

اس روایت سے واضح ہوتا ہے کہ جس شے میں معاملہ ہوا ہے، اگر اس کے عوض سونا یا

چاندی لینا ہے تو ثمن کی قیمت کا اعتبار ہوگا یعنی اتنے ثمن میں جتنا سونا یا چاندی آئے گا وہی لیا جائے گا، سونے یا چاندی کے لحاظ سے اس کا تعین نہیں ہوگا لہذا اگر کوئی معاملہ نوٹوں (روپے) میں طے ہوا ہے، یا نوٹ کی شکل میں قرض دیا ہے اور ادائیگی نوٹوں کی شکل میں چاہتا ہے تو اتنے ہی نوٹ واجب الادا ہوں گے، اور اگر ان کی ادائیگی سونے یا چاندی میں چاہتا ہے تو اتنے نوٹوں میں جتنے سونے یا چاندی آئیں گے اتنے ہی کا مستحق ہوگا۔ اس کے برعکس نہیں ہوگا کہ قرض دیتے وقت ان نوٹوں کی جتنی چاندی یا سونا آتا، ادائیگی کے وقت اتنی چاندی یا اتنے سونے کی مالیت برابر نوٹ لے، یہ درست نہیں ہوگا۔

اسی زیر بحث مسئلہ میں کہ کسی نے قرض دیا، چند سالوں بعد نوٹوں کی قیمت کم ہوگئی، اب اگر قرض لینے والا اتنے نوٹ واپس کرتا ہے تو یہ دائن پر ظلم معلوم ہوتا ہے، لہذا مہنگائی کے لحاظ سے روپے کی گنتی میں بھی اضافہ ہونا چاہئے۔ مفتی محمد تقی عثمانی صاحب، مذکورہ حدیث کے تحت تقریر ترمذی ص ۱۵۰ میں فرماتے ہیں جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ”مندرجہ بالا تجویز شرعی اعتبار سے درست نہیں۔“ اس کی نقل دلیل یہ پیش کی ہے کہ شریعت کا اصول ہے کہ ”الديون تقضى بأمثالها“ کہ دیون کی ادائیگی انہی کے مثل سے ہوگی، اور شریعت کے تمام مسائل میں مماثلت فی المقدار ہوتی ہے نہ کہ مماثلت فی القیمہ۔

اور نقلی دلیل یہ پیش کی ہے کہ قرض دینے والا اگر مقروض کی امداد کرنا چاہتا ہے تو پھر یہ سوچ لے کہ یہ قرض دینا ایسا ہے جیسے کوئی شخص اپنے پیسے اٹھا کر صندوق یا الماری میں تالا لگا کر رکھ دے۔ اور پھر اس الماری یا صندوق میں رکھے ہوئے پیسوں پر پانچ سال گزر جائیں۔ تو اس دوران ان پیسوں کی قیمت کم ہو جائے گی، جس کی وجہ سے پیسے رکھنے والے کا نقصان ہو جائے گا تو اس نقصان کی تلافی کون کرے گا؟ ظاہر ہے کہ کوئی بھی نہیں کرے گا، اسی طرح اگر آپ نے کسی کو قرض دیا وہ ایسا ہی ہے جیسے آپ نے صندوق یا الماری میں پیسے اٹھا کر رکھ دیئے“ (درس ترمذی ص ۱۵۰)۔

رہی یہ بات کہ پانچ سال پہلے اتنے نوٹ میں جتنا سامان یا غلہ ملتا تھا۔ پانچ سال بعد اتنے نوٹ میں اس سے کم ملتا ہے، جس سے دائن پر ظلم ہونا معلوم ہوتا ہے۔ تو شریعت مطہرہ میں صرف مادی فائدہ ہی پیش نظر نہیں ہوتا شریعت نے دائن اور مدیون دونوں کو تعلیم دی ہے، مدیون کو دین کی ادائیگی کی استطاعت ہونے پر جلد سے جلد ادا کر دینا چاہئے، ورنہ وہ ظالم ہوگا ”مطل الغنی ظلم“ (ترمذی ۵۹۱۳، حدیث: ۱۳۰۸)۔

اور اس ظلم کی سزا وہ عند اللہ بھگتے گا، اور اگر مدیون تنگ دست اور مجبور ہے تو اسے مہلت دینا بڑا کارِ ثواب ہے۔

”من انظر معسرا أو وضع له أظله الله يوم القيامة تحت ظل عرشه يوم

لا ظل إلا ظله“ (ترمذی ۵۹۰۳، ج ۱۳، ۱۳۰۷)۔

(جو شخص کسی تنگ دست کو مہلت دے یا اس سے ساقط کر دے، معاف کر دے، تو اللہ

تعالیٰ قیامت کے دن جس دن عرش کے سائے کے علاوہ کوئی سایہ نہ ہوگا، اس کو عرش کا سایہ دیں گے)۔

اور اگر ان مؤخر مطالبات کو قیمتوں کے اشاریہ سے وابستہ کر دیا جائے تو یہ مدیون پر بھی

تو ظلم لگتا ہے، خاص طور سے وہ لوگ جو تنگ دست ہوں، اور اپنے قرض ادا کرنے کی فکر رکھتے ہوں۔

نیز اس کی وجہ سے سود کا دروازہ کھل جائے گا، اور اس کی قباحت جو لوگوں کے دل و

دماغ میں ہے وہ ختم ہو جائے گی، کیوں کہ جو لوگ بینکوں میں اپنے پیسے محفوظ رکھتے ہیں، وہ روپے کی قیمت کے لحاظ سے سود میں ملنے والی رقم کو جائز سمجھنے لگیں گے۔

اس لئے اگر چہ روپے کی قدر کو قیمتوں کے اشاریہ سے وابستہ کرنا اور اس کے ذریعہ

مؤخر مطالبات کی ادائیگی کا انضباط ممکن بھی ہو تو چونکہ اس میں حرج اور زحمت ہے، سود کے

دروازہ کو کھولنے کا سبب ہے اور عوام کے باہمی تنازع کا باعث ہے، اس لئے مؤخر مطالبات کی ادائیگی کسی بھی قیمت کے اشاریہ سے وابستہ نہ کی جائے، اور مؤخر مطالبات جتنے ذمہ میں ہوں اسی کے مثل ادائیگی کا قول کیا جائے۔

البتہ سرکار اور حکومتیں یا کمپنیاں جو مؤخر مطالبات اپنی طرف سے اضافہ کے ساتھ ادا کریں وہ درست اور جائز ہوگا۔ اسی طرح مدیون شخص اپنی خوشی سے جو اضافہ کر کے ادا کرے وہ بھی درست ہوگا بلکہ شریعت نے اس کی ترغیب بھی دی ہے۔ آپ ﷺ نے ایک اونٹ قرض لیا، اور واپسی اس سے بہتر اونٹ سے کی اور آپ ﷺ نے فرمایا:

”خياركم أحاسنكم قضاء“ (سنن الترمذی ۵۹۸/۳، حدیث نمبر: ۱۳۱۶-۱۳۱۷)۔

(تم میں بہتر وہ ہیں جو (قرض کی) ادائیگی میں بہتر ہوں)۔

۲- اس صورت میں جب کہ قرض نوٹوں کی شکل میں دیا گیا ہو، یا مہر کی تعیین نوٹوں میں کی گئی ہو، یا ادھار فروختگی کے وقت قیمت نوٹوں میں طے ہو، اور نوٹوں کی قیمت سونے یا چاندی میں طے کر لی جائے، پھر ادائیگی کے وقت اسی کے بقدر سونے یا چاندی کے مساوی نوٹوں کی شکل میں ادائیگی عمل میں لائی جائے تو یہ صورت درست نہیں ہوگی۔ مثلاً کسی نے پندرہ ہزار روپے قرض دئے یا مہر طے کی یا کسی سامان کی فروختگی میں پندرہ ہزار روپے قیمت مقرر کی، جس کی مالیت اس وقت دس گرام سونے کی ہے۔ دو سال کے بعد اس کی ادائیگی عمل میں آرہی ہے۔ اس وقت دس گرام سونے کی قیمت بیس ہزار روپے ہے تو بیس ہزار کی ادائیگی عمل میں لانا شبہ ربا کی وجہ سے درست نہیں ہوگا۔

اس کی جائز صورت یہ ہے کہ قرض دیتے وقت سونا یا چاندی ہی دیا جائے، یا مہر یا قیمت سونے یا چاندی میں مقرر کی جائے، اور ادائیگی کے وقت اتنے سونے یا چاندی کے مساوی نوٹوں کی شکل میں ادائیگی عمل میں لائی جائے تو یہ درست ہوگا۔

یا نوٹوں کی شکل میں قرض دیا جائے یا مہر و قیمت مقرر کی جائے، اور ادائیگی کے دن اسی کے مساوی چاندی یا سونے کی شکل میں ادائیگی عمل میں لائی جائے تو یہ بھی درست ہوگا، جیسا کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی حدیث میں مذکور ہے۔

”كنت أبيع الإبل بالبيع، فأبيع بالدنانير، فأخذ مكانها الورق، وأبيع بالورق فأخذ مكانها الدنانير فأتيت رسول الله ﷺ فوجدته خارجاً من بيت حفصة فسألته عن ذلك فقال لا بأس به بالقيمة“ (سنن الترمذی ۳۳۵۳ حدیث نمبر:

(۱۲۲۲)

## موجوہ کرنسی سے متعلق دو سوالوں کے جواب

مولانا عبدالقیوم پالنپوری ☆

کاغذی نوٹوں کی اگرچہ ذاتی کوئی قیمت نہیں، اور افراط زر کی صورت میں اس کی قوت خرید تیزی سے گر جاتی ہے، مگر یہ ٹمن عرفی اور مال ہیں، لہذا ان میں بھی جنس کا تبادلہ جنس سے ہوگا تو برابری و تماثل مقدار میں شرعاً معتبر ہوگا، اموال ربویہ میں قیمت کے تفاوت کا بالکل اعتبار نہیں ہوگا۔

(۱) اس سوال میں مذکور (الف) دیون مثلاً قرض، مہر، ادھار خریداری کی قیمتیں (ب) پینشن اور (ج) اجرتوں کو قیمتوں کے اشاریہ سے وابستہ کرنے کا حکم الگ الگ ہے۔

الف۔ قرض، مہر اور ادھار خریداری کے ٹمن کے روپیوں کو عقد کے وقت ہی قیمتوں کے اشاریہ کے ساتھ معلق کرنا جائز نہیں ہے، اسی طرح عقد کے بعد بھی قیمتوں کے اشاریہ کے ساتھ ان کو وابستہ کرنا جائز نہیں ہے، سود اور حرام ہے، اس لئے کہ اس میں درحقیقت ایک واجب رقم کا اسی جنس کے روپے سے کمی بیشی کے ساتھ تبادلہ کرنا ہے اور شرعاً جنس کی جنس کے ساتھ تبادلہ میں مقدار میں برابری اور تماثل ضروری ہے، قیمت کے تفاوت کا اعتبار نہیں۔

ب۔ پینشن یہ شرعاً دین نہیں ہے بلکہ مستاجر کی طرف سے ملازم پر احسان و تبرع ہے، لہذا اس کو قیمتوں کے اشاریہ کے ساتھ وابستہ کرنا جائز ہے، کیوں کہ اس میں کوئی تبادلہ و بیع کی

صورت نہیں ہو رہی ہے بلکہ پینشن کے نام سے جو بھی رقم ملے گی قیمتوں کے اشاریہ سے یا اس کے بغیر وہ احسان و تبرع ہوگی، حضرت مفتی محمود صاحب گنگوہیؒ ایک سوال (کہ ملازم کا اپنی بقیہ زندگی کی پینشن کا پینشن کے متاثر ادارہ ہی سے یکمشت رقم سے تبادلہ کرنا اور بیچنا جائز ہے یا نہیں؟) کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں: ملازمت سے سبکدوشی پر تازہ است ملازم کو رقم ماہانہ متعین کر کے بنام حق الخدمت دینا واجب نہیں بلکہ تبرع ہے، جس پر جبر نہیں کیا جاسکتا ہے، بلکہ اس کا دل چاہے دے، نہ چاہے نہ دے، جس طرح ماہانہ رقم دینا تبرع ہے جبر نہیں، اسی طرح یہ بھی اختیار ہے کہ اندازہ کر کے مجموعی رقم یکمشت دے دے، یہ درحقیقت احسان ہی کی ایک صورت ہے۔ اس میں نہ اصالتہ بیع مالایملاک ہے، نہ بیع مالیس عندہ ہے، نہ قمار ہے، نہ ربوا ہے؛ لہذا یہ لین دین شرعاً درست ہے، و نظیرہ بیع العرایا۔ (فتاویٰ محمودیہ طبع ڈابھیل ۱۶/۱۱۵)۔

ج۔ اجرتوں کو قیمتوں کے اشاریہ سے وابستہ کرنے میں تفصیل ہے۔ اس کو حضرت مولانا تقی عثمانی صاحب مدظلہ کی بعینہ عبارت والفاظ میں آئندہ تحریر کر رہا ہوں۔

### اجرتوں کا قیمتوں کے اشاریہ سے ربط و تعلق:

جہاں تک اجرتوں کے قیمتوں کے اشاریہ سے ربط کا مسئلہ ہے، تو جب تک اجرت قرض نہ بن جائے، اس وقت تک اس کا حکم ”قرضوں کے ربط“ سے مختلف ہوگا۔ البتہ اجرت اگر قرض بن جائے تو اس صورت میں اس کا حکم بھی وہی ہوگا جو ”قرضوں کے ربط“ کا حکم ہے۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ ”اجرتوں کا قیمتوں کے اشاریہ سے ربط“ کی تین صورتیں ممکن ہیں:

۱۔ پہلی صورت یہ ہے کہ اجرتیں اور تنخواہیں نوٹوں کے ذریعہ طے ہو جائیں کہ اتنی اجرت یا تنخواہ دی جائے گی۔ اور متعاقدین یعنی مالک اور مزدور کے درمیان یہ معاہدہ ہو جائے کہ



یہ تنخواہ ہر سال قیمتوں کے اشاریہ کی زیادتی کے تناسب سے بڑھتی رہے گی، مثلاً حکومت ایک شخص کو تین ہزار روپے ماہوار تنخواہ ملازم رکھے اور یہ معاہدہ کرے کہ یہ تنخواہ ہر سال کے شروع میں قیمتوں کے اشاریہ میں زیادتی کے تناسب سے بڑھتی رہے گی۔ اس صورت میں اس ملازم کو ہر سال کے آخر تک ہر ماہ تین ہزار روپے ہی قبول کرنے پڑیں گے، اور درمیان سال میں قیمتوں کے اشاریہ میں زیادتی کے تناسب کو نہیں دیکھا جائے گا۔ البتہ جب نیا سال شروع ہوگا تو اس وقت قیمتوں کے اشاریہ کو دیکھا جائے گا کہ ایک سال کے اندر اس میں کس تناسب سے زیادتی ہوئی، مثلاً قیمتوں کے اشاریہ میں پانچ فیصد کے تناسب سے زیادتی ہوئی تھی تو اس ملازم کی تنخواہ میں بھی اسی تناسب سے زیادتی کرنی ہوگی۔ لہذا اب نئے سال سے اس کی تنخواہ تین ہزار ایک سو پچاس روپے ہو جائے گی۔

یہ طریقہ بہت سے ممالک مثلاً پاکستان وغیرہ میں رائج ہے۔ اور اس قسم کے ربط کی شریعت میں کوئی ممانعت نہیں، اس لئے کہ اس صورت کا حاصل یہ ہے کہ دونوں فریق اجرتوں اور تنخواہوں میں ہر سال یا ہر چھ ماہ بعد ایک معین تناسب سے زیادتی پر متفق ہو گئے ہیں۔ اور یہ زیادتی کا تناسب اگرچہ عقد کے وقت تو فریقین کے علم میں نہیں ہوتا، مگر وہ پیمانہ معلوم ہے جس کی بنیاد پر تناسب کا تعین ہوگا۔ اس لئے زیادتی کی مقدار میں جو جہالت کا شبہ تھا وہ مرفوع ہو گیا۔ یا یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہر نئے سال کے شروع میں جس تناسب سے قیمتوں میں زیادتی ہوئی ہوگی، اسی تناسب سے اضافہ شدہ اجرت پر اس عقد اجارہ کی تجدید کی جائے گی۔ اور اس میں کوئی شرعی ممانعت نہیں ہے۔

۲- اجرتوں کے قیمتوں کے اشاریہ سے ربط کی دوسری صورت یہ ہے کہ اجرت کا تعین نوٹوں کی ایک معلوم مقدار پر ہو جائے لیکن عقد میں شرط کر لیں کہ مالک کے ذمہ یہ مقدار معلوم واجب نہیں بلکہ اس کے ذمہ وہ مقدار واجب ہوگی جو قیمتوں کے اشاریہ کی رو سے مہینہ کے آخر

میں اس مقدار معلوم کے مساوی اور برابر ہوگی۔

مثلاً زید نے عمر کو ایک ماہ کے لئے ملازم رکھا اور یہ طے پایا کہ زید عمر کو مہینہ کے آخر میں قیمتوں کے اشاریہ کا لحاظ کرتے ہوئے اتنی رقم اجرت میں دے گا جو موجودہ ایک ہزار روپے کے مساوی ہوگی۔ چنانچہ قیمتوں کے اشاریہ میں ایک ماہ کے اندر دو فیصد (۲٪) کے تناسب سے قیمتیں بڑھ گئیں۔ تو اب زید مہینہ کے آخر میں عمر کو ایک ہزار بیس روپے (= ۱۰۲۰ روپے) ادا کرے گا۔ اس لئے کہ یہ ایک ہزار بیس روپے شروع مہینے کے ایک ہزار روپے کے مساوی ہیں۔ لیکن جب مہینے کے آخر میں یہ طے ہو گیا کہ تنخواہ ایک ہزار بیس روپے ہے۔ تو اب یہ تنخواہ ہمیشہ کے لئے ایک ہزار اور بیس روپے ہی رہے گی زیادہ نہ ہوگی۔ لہذا اگر مالک مہینے کے آخر میں یہ تنخواہ ادا نہیں کر سکا حتیٰ کہ ایک مہینہ اور گزر گیا، یا ایک سال گزر گیا اور اس نے تنخواہ ادا نہیں کی، تب بھی مالک کے ذمہ ایک ہزار اور بیس روپے واجب ہوں گے، قیمتوں کے اشاریہ میں زیادتی سے اس میں زیادتی نہیں آئے گی۔ مثلاً اگر اس عرصہ میں قیمتوں کے اشاریہ میں دس فیصد کے تناسب سے اضافہ ہو گیا تو وہ ملازم یہ مطالبہ نہیں کر سکے گا کہ چونکہ قیمتوں کے اشاریہ میں دس فیصد کے تناسب سے اضافہ ہو چکا ہے اس لئے اب مجھے ایک ہزار بیس روپے پر دس فیصد کے حساب سے اضافہ کر کے اجرت دی جائے؛ اس لئے کہ عقد کے وقت ہی آپس کے اتفاق سے اجرت کے بارے میں یہ بات طے ہو چکی تھی کہ مہینے کے آخر میں جتنے روپے موجودہ ایک ہزار کے مساوی ہوں گے وہ دیئے جائیں گے۔ اور صرف اس کی تعیین کے لئے قیمتوں کے اشاریہ کو مد نظر رکھا جائے گا، لیکن جب مہینے کے آخر میں قیمتوں کے اشاریہ کی بنیاد پر ایک مرتبہ اجرت طے ہو گئی تو اب قیمتوں کے اشاریہ کا کام مکمل ہو چکا، اب اس کی ضرورت نہیں رہی اور اب وہ معین اجرت مالک کے ذمہ قرض ہو گئی، جس میں آئندہ نہ تو زیادتی ہو سکتی ہے اور نہ کمی واقع ہو سکتی ہے، قیمتوں کے اشاریہ میں چاہے کتنے بھی تغیرات واقع ہو جائیں۔

جہاں تک اس صورت کی شرعی حیثیت کا تعلق ہے میری رائے میں یہ بھی جائز ہے، بشرطیکہ قیمتوں کا اشاریہ اور اس کے حساب کا طریقہ فریقین کو اچھی طرح معلوم ہو، تاکہ بعد میں لاعلمی کی بنا پر آپس میں جھگڑا نہ ہو جائے؛ اس لئے کہ یہاں دونوں فریق اس بات پر متفق ہیں کہ طے شدہ اجرت ایک ہزار روپے نہیں بلکہ قیمتوں کے اشاریہ کے اعتبار سے مہینے کے آخر میں جتنے روپے موجودہ ایک ہزار روپے کے مساوی ہوں گے وہ مالک پر دینے واجب ہوں گے، جس کو حساب کے ذریعہ نکالنے کا طریقہ دونوں فریق کو معلوم بھی ہے۔ لہذا اجرت کی مقدار میں اتنی جہالت جھگڑے کا سبب نہیں بنے گی، اور یہ صورت بالکل اسی طرح ہے جیسے کہ ایک شخص نے کسی کو ملازم رکھا اور اجرت یہ طے کی کہ مہینے کے آخر میں دس گرام سونے کی جو قیمت ہوگی وہ مالک کے ذمہ ادا کرنی واجب ہوگی۔ جب مہینے کے آخر میں دیکھا تو دس گرام سونے کی قیمت دو ہزار روپے تھی تو خود بخود یہ طے ہو گیا کہ اجرت دو ہزار روپے ہے۔ اب اس کے بعد اس اجرت میں نہ تو زیادتی ہوگی اور نہ کمی ہوگی، چاہے سونے کی قیمت اس کے بعد زیادہ ہو جائے یا کم ہو جائے، اس سے اجرت پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔

۳- اجرتوں کے قیمتوں کے اشاریہ کے ساتھ ربط کا تیسرا طریقہ یہ ہے کہ اجرت تو روپے کی معین مقدار کے ذریعہ طے ہو جائے اور فریقین کے درمیان یہ شرط ہو جائے کہ وہ اجرت مالک کے ذمہ واجب ہوگی جو عقد اجارہ میں طے ہوئی ہے۔ لیکن مالک جس دن یہ اجرت ادا کرے گا اس دن قیمتوں کے اشاریہ میں جس تناسب سے اضافہ ہوا ہوگا، اسی تناسب سے وہ اجرت میں بھی اضافہ کر کے ادا کرے گا۔

مثلاً ایک شخص نے کسی کو ایک ہزار روپے پر ملازم رکھا اور دونوں کے درمیان یہ طے ہو گیا کہ اجرت ایک ہزار روپے ہے۔ لیکن مالک پر یہ ضروری ہوگا جس دن وہ یہ اجرت ادا کرے گا، اس دن قیمتوں کے اشاریہ میں جس تناسب سے اشیاء کی قیمتوں میں اضافہ ہوا ہوگا،

اسی تناسب سے وہ بھی ایک ہزار روپے میں اضافہ کر دے گا۔ لہذا مالک نے اگر یہ اجرت مہینے کے آخری دن میں ادا کی اور اس روز قیمتوں کے اشاریہ میں دو فیصد کے تناسب سے اضافہ ہو چکا تھا، تو اب مالک بھی دو فیصد کے تناسب سے اضافہ کر کے ایک ہزار اور بیس روپے ادا کرے گا۔ اور اگر مالک نے یہ اجرت ایک سال کے بعد ادا کی اور اس وقت تک قیمتوں کے اشاریہ میں دس فیصد کے تناسب سے اشیاء کی قیمتوں میں اضافہ ہو چکا تھا تو اب مالک بھی دس فیصد کے تناسب سے اضافہ کر کے گیارہ سو روپے ادا کرے گا۔

میری رائے میں اس کا شرعی حکم ”قرضوں کے قیمتوں کے اشاریہ کے ساتھ ربط“ کی طرح ہے، جو کہ شرعاً جائز نہیں، جیسا کہ ہم تفصیل سے پیچھے بیان کر چکے ہیں۔

تیسری صورت اور دوسری صورت کے درمیان فرق یہ ہے کہ دوسری صورت میں اشاریہ سے صرف متفقہ اجرت کی تعیین کا کام لیا گیا، اور اشاریہ کی بنیاد پر جب ایک مرتبہ اجرت متعین ہو گئی تو اشاریہ کا کام ختم ہو چکا۔ اب ہمیشہ کے لئے یہی متعین اجرت مالک کے ذمہ واجب رہے گی، اس پر زیادتی نہ ہوگی، چاہے مالک جب بھی ادا کرے۔

بخلاف اس تیسری صورت کے کہ اس صورت میں اجرت ایک ہزار روپے متعین تھی جو ادا نہ کرنے کی بنا پر مالک کے ذمہ قرض بن گئی تھی اور پھر اس قرض کو اشاریہ کے ساتھ ملا دیا گیا تھا۔ لہذا اس تیسری صورت کا بھی وہی عدم جواز کا حکم ہو گیا جو قرضوں کے اشاریہ کے ساتھ ربط کا حکم ہے۔

اس تیسری صورت کے بارے میں ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ اجرت کی تعیین میں اشاریہ اپنا فرض پورا کر رہا ہے کہ جس وقت آپ چاہیں نرخ نامہ کے ذریعہ اجرت متعین کر کے ادا کر دیں۔ اس لئے کہ اجرت کی تعیین عقد اجارہ کے وقت ہی طے ہو جانا ضروری ہے۔ یا دوسرے کسی خاص وقت کے اندر اندر اس کی اس طرح تعیین ضروری ہے کہ اس تعیین کے بعد اجرت میں نہ تو زیادتی

ہو سکے اور نہ کی ہو سکے۔ لہذا اگر اجرت کو کسی دوسری چیز کے ساتھ اس طرح ہمیشہ کے لئے معلق کر دیا جائے کہ اس دوسری چیز کی زیادتی سے اس اجرت میں بھی زیادتی ہو جائے اور اس چیز میں کسی سے اجرت میں بھی کمی واقع ہو جائے، اس صورت میں تو اجرت مجہول ہی رہے گی اور کسی معلوم مقدار پر اس کی تعیین کسی وقت بھی نہ ہو سکے گی، اور ایسی جہالت عقد اجارہ کو فاسد کر دیتی ہے۔ واللہ اعلم (فقہی مقالات از حضرت مولانا تاجی عثمانی صاحب مدظلہ، ص ۷۸۲، ۵۲ مع حذف)۔

## موجودہ کرنسی اور اس کی شرعی حیثیت

مولانا رضوان الحسن مظاہری ☆

الحمد لله وكفى وسلام على عباده الذين اصطفى، أما بعد۔

کسی سے یہ بات مخفی نہیں ہے کہ موجودہ دور بڑی تیز رفتاری کے ساتھ انقلابات سے دوچار ہے، سائنس کی ترقی، نئی ایجادوں اور نئی تدبیروں کو جنم دے رہی ہے اور ان سے نئے مسائل ابھر رہے ہیں۔ ان حالات و انقلابات نے دین کے ان احکام و مسائل کو بھی متاثر کیا ہے جو مجتہد فیہا ہیں منقول و منصوص نہیں ہیں؟ اور یہ ہر زمانے میں ہوتا رہا ہے۔ علماء اور فقہاء نے کبھی ان سے صرف نظر نہیں کیا ہے البتہ جب تک مسائل مستح نہیں ہو جائے حکم لگایا نہیں جاتا، اس کی مثالوں میں لاؤڈ اسپیکر کا استعمال ہو یا ہوائی جہازوں پر نمازوں کی ادائیگی جیسے مسائل پیش کئے جا سکتے ہیں؟ ایک دور تھا کہ لاؤڈ اسپیکر پر نماز کو ناجائز کہتے رہے مگر پوری سائنسی تحقیق کے بعد علماء نے اس کو جائز ہونے کا فتویٰ دیا، اسی طرح ہوائی جہاز پر نماز پڑھنے کی اجازت نہیں دی جاتی تھی مگر بعد میں اس کی بھی اجازت دے دی گئی۔ اور یہ عیب نہیں ہے بلکہ عرف و عادت کی تبدیلی سے احکام و مسائل ہر دور میں بدلتے رہے ہیں۔ متقدمین تعلیم قرآن اور درس حدیث و تفسیر و فقہ پر اجرت کو مطلق ناجائز کہتے تھے، اسی طرح امامت و مؤذنی کی اجرت کے عدم جواز کا فتویٰ دیتے تھے مگر متاخرین نے اپنے دور میں حالات سے مجبور ہو کر ان کے جواز کا فتویٰ دیا اور ملت نے اس

کو قبول کیا اور اس سے فائدہ اٹھایا؛ چنانچہ فقہاء نے صراحت کی ہے:

”العادة والعرف رجع إليه مسائل كثيرة حتى جعلوا ذلك أصلاً فقالوا: تترك الحقيقة بدلالة الاستعمال والعادة ثم ذكر في الأشباه“ (رم المفتی ۹۵) (عادت اور عرف ایسی چیز ہے جس کی طرف بہت سارے مسائل میں رجوع کیا جاتا ہے؛ اس لئے اس کو ایک قاعدہ کلیہ بنا دیا اور کہا کہ استعمال و عادت کی وجہ سے حقیقت ترک کر دی جائے گی)۔

مذکورہ عبارت کو دیکھ کر فقہاء نے اس کو ایک قاعدہ کلیہ تسلیم کر لیا ہے اور کہا کہ استعمال و عادت کی وجہ سے بسا اوقات حقیقت ترک کر دی جائے گی؛ چنانچہ اسی اہمیت کو مد نظر رکھتے ہوئے علماء اور فقہاء کے لئے عرف و زمانہ سے واقف ہونا ضروری اور لازمی قرار دیا گیا۔ رسم المفتی میں یہ عبارت موجود ہے:

”وقد قالوا ومن جهل بأهل زمانه فهو جاهل“ (رم المفتی ۹۸) (جو اپنے زمانہ کے احوال سے واقف نہ ہو وہ جاہل ہے)۔

صاحب مبسوط نے لکھا ہے: ”الثابت بالعرف كالثابت بالنص“ (مبسوط ۵۵)۔  
(عرف و عادت سے جو ثابت ہوتا ہے اس کا تقریباً وہی درجہ ہوتا ہے جو نص سے ثابت ہو)۔

علامہ شامی نے تحریر کیا ہے: ”قد تغيرت أحكامها لتغير الزمان، اما للضرورة، واما للعرف واما لقرائن الأحوال“ (شامی ۹۶)۔

(بہت سے احکام زمانے کے انقلاب سے بدل گئے ایسا یا تو ضرورت کی وجہ سے ہوایا پھر عرف و عادت کی وجہ سے ہوایا احوال زمانہ کے قرائن کو مد نظر رکھتے ہوئے (فقہ اسلامی)۔

فقہاء کرام کی ان تمام تشریحات سے یہ بات صاف طور پر واضح ہو جاتی ہے کہ حالات

دعوت کے بدلنے کا مسائل پر اثر ہوتا ہے، اور عرف و عادت اور حالات کے پیش نظر احکام میں تبدیلی عیب نہیں، بلکہ بہتر ہے، ناجائز نہیں جائز ہے، اسلام رہتی دنیا کے لئے آیا ہے اور تمام دنیا اور کائنات کے لئے آیا ہے، پھر یہ کیوں کر کہا جاسکتا ہے کہ عرف و عادت اور حالات پر نظر نہ رکھی جائے یا ضرورت کا لحاظ و پاس نہ ہو؟

کرنسی نوٹوں کا مسئلہ بھی حالات اور عرف و عادت سے بے نیاز نہیں رہ سکتا ہے اور سو سال پہلے جو حکم تھا ہر حال میں وہی باقی نہ رہے گا بلکہ اس میں تبدیلی ہوگی، نیز اسلامی عدل و مساوات کی وجہ سے تبدیلی ہونی بھی چاہئے، کیوں کہ ایک دور تھا کہ چاندی اور سونے کے سکے ڈھلتے اور بازار میں چلتے تھے اور کرنسی نوٹوں کا نام و نشان تک نہیں تھا، پھر حالات میں تبدیلی آئی، سونے اور چاندی کی کمی ہوئی اور اس کی تلافی دوسری دھاتوں کے سکوں سے کی گئی۔ یہ سکے بھی بہت دنوں تک رائج رہے، یہی وجہ ہے کہ فقہ کی تمام کتابوں میں سونے اور چاندی اور دوسری دھاتوں سے تیار کئے ہوئے (درہم و دینار) سکوں کے مسائل بکثرت پائے جاتے ہیں، آج بھی انہی مسائل کو پڑھایا جاتا ہے۔ پھر ایک دور وہ بھی آیا کہ ہر ملک کی حکومت نے سکوں کی جگہ میں کرنسی نوٹوں کو رائج کیا، کئی قسم کے نوٹ چھاپے گئے (سو، پچاس، پانچ سو، ہزار وغیرہ)، اس کے بعد حکومتیں سونے اور چاندی کے سکوں کو اپنے خزانے میں جمع کراتی گئیں، اس کے بعد دوسری دھاتوں کے سکے بھی آہستہ آہستہ کم ہوتے گئے، اب حال یہ ہے کہ جہاں دیکھئے کاغذ ہی کاغذ کے نوٹ نظر آتے ہیں؟ خواہ وہ ہندوستان ہو یا یورپ، عرب ہو یا امریکہ، یہی وجہ ہے کہ ہمارے ملک میں ہر ایک نوٹ پر یہ عبارت لکھی ہوتی ہے:

I PROMISE TO PAY THE BEARER THE SUM OF RUPEES.

کہ میں حامل ہذا کو اتنا روپیہ ادا کرنے کا وچن دیتا ہوں۔

اسی بنیاد اور دلیل پر ہمارے اکابر نے روز اول ہی سے نوٹ کو اصلاً شمن اور نقد قرار



نہیں دیا؛ بلکہ وہ ایک قابل اعتماد و وثیقہ اور سند زرمانا ہے۔

اس اعتبار سے حکومت اس کے ذریعہ ہماری امین ہے، اور اس وثیقہ اور سند زر سے ہمارا تمول قابل اعتبار ہے اور ہماری ضروریات ہر وقت پوری ہوتی رہتی ہیں اور ہم اس پر عملاً و قلباً مطمئن ہیں۔ چونکہ نوٹ ایک نئی چیز وجود میں آئی پہلے اس طرح کے نوٹوں کا وجود نہ تھا، اس لئے فقہاء کرام کی کتب متداولہ فقہیہ میں اس کا جزئیہ صراحت کے ساتھ تو نہیں ملتا۔ ضرورت ہے کہ ان اصول و ضوابط میں غور و فکر کیا جائے اور ان پر گہری نگاہ ڈالی جائے تو نئے مسائل کا حل تلاش کرنے میں بڑی مدد ملتی ہے، چوں کہ ہر شخص کا طریقہ تخریج و استنباط جدا ہوتا ہے اس لئے اس طرح کے جدید مسائل میں اختلاف رائے ہو جانا ایک لازمی امر ہے؟ اسی بنیاد پر نوٹ کی شرعی حیثیت متعین کرنے میں علماء کرام کا اختلاف ہو گیا۔

حضرت مولانا خلیل احمد صاحب محدث سہارنپوری، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی، حضرت مولانا اشرف علی تھانوی، حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمن عثمانی مفتی اعظم دارالعلوم دیوبند، حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب سابق مفتی اعظم مظاہر علوم سہارنپور وغیرہم نے نوٹ کو حوالہ وثیقہ اور سرکاری سند زرمانا ہے (فقہ اسلامی)۔

ان حضرات کے دلائل کا خلاصہ یہ ہے:

۱۔ اگر نوٹ کے سرکاری سند اور وثیقہ ہونے سے صرف نظر کر لیا جائے تو اسے کوئی بھی ایک روپیہ میں بھی نہ خریدے گا۔

۲۔ حکومت نے نوٹ کو اپنی طرف سے جاری کیا ہے اور اس کے حامل سے حکومت نے معاہدہ کیا ہے، اور اس کی ادائیگی کا ہر وقت ذمہ لیا ہے، حکومت نے اس کو سکھ قرار نہیں دیا جیسا کہ نوٹ پر لکھی ہوئی عبارت سے واضح ہوتا ہے۔

۳۔ یہ ایک رقعہ ہے جو غیر نامی ہے، اس لئے اس پر لکھی ہوئی رقم کو ہر وقت سرکار سے

وصول کیا جاسکتا ہے۔ نیز یہ حضرات درمختار و شامی کی حسب ذیل عبارت بھی اپنے استدلال میں پیش کرتے ہیں:

”ففى الدر المختار بيع البراءة التى يكتبها المدبون على العمال لا يصيح، قلت وعبرة الصيرفة هكذا مثل عن بيع الخط قال لا يجوز فإنه لا يخلو إما أن يباع ما فيه أو عين الخط لا وجه للأول لأنه يبيع ما ليس عنده ولا وجه الثانى، لأن هذا القدر من الكاغذ ليس متقوماً“۔

لیکن اب صورت حال یہ ہے کہ سونے اور چاندی کی کرنسی (سکے، درہم، دینار) بازار سے بالکل ناپید ہو چکی ہے اور قانونی عرفی طور پر نوٹ اس کثرت سے رائج ہو گیا ہے کہ سارا لین دین اسی سے ہو رہا ہے۔

یہ تو ایک حقیقت ہے کہ کاغذی نوٹوں کی اپنی ذاتی کوئی قیمت نہیں ہوتی اور افراط زر کی صورت میں اس کی قوت خرید تیزی سے گر جاتی ہے، مگر جب ان نوٹوں کو اصل سونے یا چاندی کا بدل قرار دے کر اصل مان لیا گیا تو یہ نوٹ اپنے مبدل منہ کا حکم فی الجملہ اختیار کر لیا اور ان پر وہی حکم جاری ہونے لگا جو سونے اور چاندی پر ہوتا تھا (فقہ اسلامی)۔

نیز اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ عصر حاضر کے تمام علماء کرام اور صاحب فتویٰ حضرات، ان نوٹوں کی اسی سند و وثیقہ کی حیثیت پر نظر رکھتے ہوئے اس کی مالیت اور قوت خرید کا اعتبار کر کے مختلف زمانے میں نصاب زکوٰۃ کی تعیین نوٹوں کے مختلف مقدار سے کرتے آئے ہیں اور اب بھی کر رہے ہیں، مثلاً کبھی صرف سچاس ساٹھ نوٹوں کے مالک کو بھی مالک نصاب مانا گیا تھا تو کبھی دو سو اور تین سو نوٹوں کے مالک پر بھی زکوٰۃ واجب سمجھا گیا، لیکن آج جبکہ چاندی اور سونے کا نرخ بہت زیادہ گراں ہو گیا ہے، اب کئی ہزار نوٹوں کے مالک کو مالک نصاب قرار دیا جاتا ہے آخر ایسا کیوں؟ اسی طرح ہندوستانی کئی نوٹوں کا تبادلہ ایک سعودی ریال

سے بلا تکثیر شائع ہے، اسی طرح مختلف ممالک کے کاغذی نوٹوں ریال، ڈالر، پونڈ کا ایک دوسرے سے تبادلہ عددی طور پر کمی بیشی کے ساتھ عام طور پر رائج ہے اور شاید کسی مفتی کی نظر میں یہ تبادلہ غلط اور خلاف شرع بھی نہیں آخر کیوں؟

ظاہر ہے کہ ان مختلف ممالک کے مختلف ریال، ڈالر، پونڈ اور روپے کی اسی مالیت اور قوت خرید کے باہمی تفاوت کے سبب مقدار اور گنتی کی کمی بیشی کی جاتی ہے جس کے نتیجے میں حقیقتاً مماثلت و مساوات پیدا ہو جاتی ہے اور ہم اسے جائز کہتے ہیں ربوا کا شبہ بھی نہیں ہوتا ہے (مجلہ فقہ اسلامی)۔

جب ہم ان مختلف ممالک کے نوٹوں کو اس ملک کی طرف سے اس کی مستند مالیت اور قوت خرید کا لحاظ رکھتے ہیں، اور جب زکوٰۃ کے وجوب و عدم وجوب میں نوٹوں کی اسی سند کی اور قانونی مالیت پر نظر کرتے ہیں تو یہ کیسی عجیب بات ہوگی کہ محتاج انسانوں کے مؤخر مطالبہ کی ادائیگی میں اس سے صرف نظر کر لیا جائے، جب کہ یہ ایک حقیقت اور مشاہدہ ہے کہ ان نوٹوں کی مالیت اور قوت خرید میں ایک خاص مدت گزرنے پر نمایاں کمی آ جاتی ہے تو پھر کیا مؤخر مطالبوں کی ادائیگی ان کم قدر و قیمت کے نوٹوں کے ذریعہ کیسے اسلامی عدل و انصاف کے تقاضہ کو پورا کر سکتی ہے؟

چنانچہ اب دیون اور قرض و مہر کے لئے بہترین شکل اور آسان صورت یہ ہو سکتی ہے کہ سارے معاملات میں تو اس نوٹ کو عین ثمن خلقی کے درجہ میں رکھا جائے اور اس کی حیثیت محض شمعدیت کی ملحوظ نظر رہے؛ کیوں کہ نقد اور معجل معاملات میں ان کی مالیت اور قوت خرید میں کوئی قابل لحاظ تفاوت اکثر نہیں ہوتا ہے، باقی رہا تفاوت یسیرہ تو وہ شرعاً غیر معتبر ہے، صاحب ہدایہ فرماتے ہیں کہ تفاوت یسیرہ جو جھگڑے کی طرف مفضی نہ ہو کوئی حرج نہیں ہے (ہدایہ کتاب البیوع)۔

لیکن جہاں معاملات ادھار اور مؤجل ہو وہاں ان نوٹوں کو سند و وثیقہ کی حیثیت ہی کا

لحاظ ہونا چاہئے؛ کیوں کہ ایک خاص مدت کے بعد ان کی قدر و مالیت میں یقینی تفاوت ہو جانا ہے جو ضرر اور اتلاف حق کو مستلزم ہے، اس لئے قرض دیتے وقت یا دیون و مہر مقرر کرتے اور ادھار خریدتے وقت طرفین واجب الادا نوٹ کی حیثیت و مالیت سونے یا چاندی کے اشاریہ میں طے کر لیں اور بوقت ادائیگی اس قدر سونے یا چاندی کے مساوی نوٹوں کی ادائیگی پر معاملہ طے کر لیں مثلاً اس طرح کہ آج دو تولہ چاندی کے عوض یا اس کے برابر دو سو روپیہ قرض دیتا ہوں، اور وصولیابی کے وقت دو تولہ چاندی کے برابر روپیہ لوں گا خواہ وہ کتنے ہی نوٹوں کے برابر ہو، یہ صورت بلاشبہ جائز ہے جس کی صریح تائید ذیل کی عبارت سے ہوتی ہے (مقالہ فقہ اسلامی)۔

”وفی دعوی البزازیة من النوع الخامس عشر عن فوائد الإمام أبی حفص الکبیر استقرض منه دائق فلوس حال کونها عشرة بدائق فصارت ستة بدائق أو رخص و صار عشرون بدائق يأخذ منه عدد ما أعطی ولا یزید ولا ینقص، قلت هذا مبني علی قول الإمام وهو قول أبی یوسف أولاً وقد علمت أن المفتی به قوله بوجوب قيمتها يوم القرض وهو دائق أي سُدس درهم سواء صار الآن ستة فلوس بدائق أو عشرين بدائق“ (شامی: کتاب البیوع ۴/۲۲۳)۔

”وعند محمد يوم الكساد وهو آخر ما تعامل الناس بها وفي الذخيرة والفتوى علی قول أبی یوسف وأوجب محمد قيمة يوم الكساد وعليه الفتوى“ (در مختار ۴/۲۶۸)۔

ایک دوسرے اندازے سے بھی اس مسئلہ پر غور کیا جائے۔ چنانچہ ہمارے فقہاء نے اشیاء کی تقسیم ذوات الامثال اور ذوات القیم سے کی ہے اور دونوں کے جدا جدا احکام کو مفصل لکھا ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ یہ تقسیم اور پھر مثالی تقیمی کی تعریف محض تقریبی ہے کوئی چیز منصوص چیز نہیں، ہمارے فقہاء نے اجتہادی طور پر صرف اسلام کے قانون عدل و مساوات کے تقاضوں کی تکمیل

ہی کے لئے یہ ساری تعریفات و تخریجات پیش کی ہیں۔ کتب فقہ میں ایسی نظیریں ضرور مل جاتی ہیں کہ اصول عام کے تحت جب مثلی کا ضمان اتلاف بشکل مثلی دلانے سے عدل کا تقاضا پورا نہیں ہوتا تو بصورت قیم قیمت کی شکل میں اس کا ضمان دلواتے ہیں۔ حدیث مصراۃ اس کی واضح مثال ہے اور اس کی روشنی میں کہا جاسکتا ہے کہ مثل اور قیمت کے سوا کسی اور چیز کے دینے دلانے سے بھی تقاضا عدل اگر پورا ہو سکے تو یوں بھی کرنا چاہئے۔ رسول اللہ ﷺ نے اہل مصراۃ کے خریدار کو کھجور دینے کا حکم فرمایا جو تلف شدہ اور پیسے ہوئے دودھ کا نہ مثل ہے نہ قیمت، اس کا کیا منشا ہو سکتا ہے، یہ جناب رسالت مآب رسول اللہ ﷺ کی عدالت ہی کا تقاضا تھا کہ بائع کو معمولی خسارہ سے بھی بھی بچا لیا جائے۔ بہر حال یہ غور طلب امر ہے کہ یہ کاغذی نوٹ فقہاء کی اس تقسیم کے مطابق مثلی ہے یا قیمی، بعض معاصر علماء نے مثلی اور قیمی کی بعض تعریف کے مطابق اسے قیمی قرار دیئے جانے کا امکان بھی ظاہر کیا ہے، اور اگر اسے تسلیم کر لیا جائے تو مسئلہ اور زیادہ سہل اور طے شدہ ہو جاتا ہے کہ ان نوٹوں کے ذریعہ مطالبات مؤخرہ کی ادائیگی میں قیمت کا اعتبار یقیناً ہونا چاہئے لیکن اسے قیمی قرار دینے میں بعض دشواریاں بھی پیدا ہو سکتی ہیں، فقہ حنفی کے اعتبار سے جیسے قرض و استقراض کا معاملہ ہے، فقہ حنفی کے مطابق دشواری ہوگی، اس لئے کہ مثلی کی جو تعریف فقہ حنفی میں مذکور ہے اس کے مطابق ان نوٹوں کے عدوی متقارب ہونے کی بنیاد پر مثلی ہی کہنا مناسب ہے، اور اپنی جگہ یہ بھی طے شدہ اور مسلمہ ضابطہ ہے کہ کسی مثلی کے واجب فی الذمہ ہو جانے کے بعد اسی کے مثل کی ادائیگی سے ذمہ فارغ ہوگا۔

اب غور کیا جائے کہ اگر کسی کے ذمہ دس سال پہلے کسی کے سیونوٹ بطور قرض یا دین واجب الاداء ہو جائیں تو کیا وہ شخص آج کے محض صوری اور عدوی طور پر اس دین و قرض کو برابر نوٹ ادا کرنے سے فارغ الذمہ قرار دیا جائے گا؟ اور کیا ان دونوں نوٹوں میں مالیت اور قیمت خرید کے اعتبار سے تفاوت فاحش کے باوجود محض عدوی اور صوری مساوات کی بنیاد پر ایک کو

دوسرے کا مثل تسلیم کیا جائے گا؟ فقہی تصریحات سے اس کا جواب نفی میں نکلتا ہے، صاحب ہدایہ لکھتے ہیں:

”المماثلة بين الشئین تكون صورة ومعنی“ (ہدایہ ثالث مع فتح القدر: باب ربوا)

دو چیزوں میں برابری صورت اور معنی دونوں اعتبار سے ہوتا ہے۔

علامہ کاسانی بدائع الصنائع میں تحریر فرماتے ہیں: ”والمثل المطلق هو المثل

صورة ومعنی فاما القيمة فمثل من حيث دون الصورة“ (۱۵۰/۷) مثل مطلق کہتے ہیں

صورت اور معنی دونوں کے مساوات کو، اور قیمت میں معنی کے اعتبار سے مساوات ہوتا ہے نہ کہ

صورت کے اعتبار سے۔

ان عبارتوں سے واضح طور پر ثابت ہو رہا ہے کہ قیمت کو بھی دو چیزوں کے درمیان

مماثلت مطلوبہ کے تحقق میں داخل ہے، اور اگر دو چیزیں محض صورتاً مماثل ہوں اور قیمتاً متفاوت

تو مماثلت مطلوبہ فوت ہو جائے گی۔ علامہ ابن قیمؒ تو اعلام الموقعین (۲/۲۵۵) میں جنساً صفةً مالیةً

مقصوداً اور انتفاعاً ہر طرح مساوات کو مماثلت کے لئے ضروری کہتے ہیں۔ المغنی (۳/۳۵۲)

میں وسط سے امام غزالیؒ کا قول نقل کیا ہے: والصحيح انه المثل الذي تتماثل اجزاء

في القيمة والمنفعة (مماثلت کی صحت اور مساوات یہ ہے کہ قیمت اور منفعت دونوں میں

برابری ہو)، ظاہر ہے کہ ان تصریحات کی موجودگی میں دونوںوں میں قدر و قیمت اور مالیت کے

مابین تفاوت فاحش کے باوجود ایک دوسرے کا مثل کہنا بہت مشکل ہوگا، جس کا صاف مطلب یہی

نکلتا ہے کہ نوٹوں کے ذریعہ مطالبات مؤخرہ کی ادائیگی میں قیمت و مالیت کا اعتبار ضرور ہونا چاہئے

تاکہ ادا مثل بن کر فارغ الذمہ ہو جائے ورنہ اتلاف حق کی بنا پر عند اللہ مؤاخذہ کا خطرہ ہو سکتا

ہے۔ فقہاء لکھتے ہیں:

”يجزون رد العين المستقرضة ما دامت لم تتعيب بعيب ينقض

مالیتہ، أما إذا تعيب لا يصح ردھا“ (جب عین مستقرضہ کی واپسی عیب ہونے سے پہلے جائز ہے بعد میں نہیں) تو اس سے پتہ چلتا ہے کہ عیب ایک مثلی کو مثلی رہنے نہیں دیتا اور عیب دار چیز سالم من العیب کا مثل نہیں ہو سکتی، اور اس کے ساتھ فقہاء کا یہ کلیہ پیش نظر رکھا جائے:

”كل ما أوجب نقصان الثمن في عادة التجار فهو أعيب لأن التضور بنقصان المالية وذلك بانتقاص القيمة والمرجع في معرفته عرف أهله“ (ہدایہ ثالث، ۲۳)۔

(جب ہر وہ چیز جو تاجروں کے عرف میں اشیاء کی قیمت کے نقصان کا سبب بن جائے وہ عیب ہے جس کی بنیاد پر ہر مشتری کو بیع واپس کرنے کا حق مل جاتا ہے، اس لئے کہ مالیت کی کمی سے اس کا ضرر اور نقصان ہوتا ہے اور دفع ضرر ہر شخص کا شرعی حق ہے، اور مالیت کی کمی قیمت کے کم ہونے سے ہوا کرتی ہے)، تو کیا نوٹوں کی قیمت میں کمی ہونا صاحب حق کے لئے باعث ضرر نہیں ہوگا، اور اس کے دفع کا حق نہیں ملے گا، یقیناً ملے گا اور ملنا چاہئے؛ کیوں کہ اس کاغذی نوٹ کو ان سارے عیبوں کے ساتھ ماضی کے ان نوٹوں کا مثل کیسے قرار دیا جاسکتا ہے جو اپنے وقت میں ان عیبوں سے محفوظ تھے، اور پھر سب سے بڑھ کر قوی اور نص صریح تو اس سلسلہ میں حضرت امام ابو یوسف کا مفتی بہ قول موجود ہے کہ اگر درہم مغشوشہ اور فلوس نافقہ جو ثمن اصطلاحی کے درجہ کی چیز ہے اس کے ذریعہ بیع و شراء کا معاملہ کیا جائے یا قرض دیا جائے اور ابھی بیع میں ثمن کی یا معاملہ استقرض میں اس قرض کی ادائیگی نہ ہو سکی تھی کہ ان درہم مغشوشہ اور فلوس نافقہ کا چلن بند ہو گیا یا اس کی قدر و قیمت میں کمی آگئی تو اس مشتری اور مستقرض پر ثمن اور قرض میں لیے درہم و فلوس کی قیمت لازمی ہوگی۔ یعنی بیع و شراء کے دن یا قرض کے مسئلہ میں قبضہ کے دن ان درہم و فلوس کی جو قیمت اور جتنی قدر و مالیت تھی اتنی ہی قیمتی اور مالیت کی چیز بطور ثمن مشتری پر اور بطور ادائے قرض مستقرض پر ضروری ہوگا۔ ”قال الثانی: ثانیاً، علیہ قیمتھا من الدراہم یوم البیع

والقبض وعلیہ الفتوی ای یوم البیع فی البیع ویوم القرض فی القرض فلا فرق  
بین الکساد والرخص والغلاء فی لزوم القیمة“ (شامی ۳/۳۲۵)۔

بہر حال ان مذکورہ بالا تمام فقہی تصریحات و نظائر کی روشنی میں، اور حالات حاضرہ میں  
معیشت کی تباہ کاری اور اقتصاد کی خستہ حالی اور کرنسی نوٹوں کی ڈیویلوپیشن کو دیکھ کر اور عرف اور  
عموم بلوی کو سامنے رکھ کر غور کیا جائے؛ چنانچہ ماضی کے ان فیصلوں میں ضروری اور لازمی طور پر  
ترمیم کیا جائے جو عصر حاضر کے تقاضوں پر پورے پورے نہ اتر سکیں، اور اسلام کے قانون عدل  
کا تقاضہ پورا نہ کر سکے۔ اس لئے راقم الحروف کا خیال یہ ہے کہ ان نوٹوں کو نقد اور معجل معاملات  
میں ضمن عرفی تسلیم کیا جائے، مگر ادھار و مؤجل معاملات میں (مثلاً قرض، دین، مہر، پیشین،  
ادھار خرید و فرخت وغیرہ) سند و ثبوت سمجھا جائے اور اس وقت یعنی معاملہ کرتے وقت کرنسی نوٹوں کا  
اشارہ سونے اور چاندی سے کر لیا جائے تاکہ اسلام کے قانون عدل کا تقاضہ پورا کیا جاسکے اور  
صاحب معاملہ غبن فاحش کے ضرر سے اور نقصان سے محفوظ رہ سکے۔ واللہ اعلم۔



## موجودہ کرنسی کی شرعی حیثیت

مولانا سلمان پالنپوری قاسمی ☆

کاغذی نوٹوں کی اگرچہ ذاتی کوئی قیمت نہیں، اور افراط زر کی صورت میں اس کی قوت خرید تیزی سے گر جاتی ہے، مگر یہ ثمن اصطلاحی اور مال ہیں، نیز موجودہ نوٹ مثلی ہیں، یہ گو فقہاء کی زبان میں کیلی اور وزنی نہیں، لیکن عددی غیر متفاوت ہیں، اس لئے کہ ایک تعداد کے دو نوٹ مثلاً سو روپے کے دو نوٹ ایک ہی مالیت ہوتی ہے اور ان کی قدر میں کوئی تفاوت نہیں ہوتا ہے، جیسا کہ فقہاء نے دراہم و درناہم کی طرح فلوس کو بھی مثلی شمار کیا ہے، لہذا ان میں بھی جنس کا تبادلہ جنس سے ہوگا تو برابری مقدار میں شرعاً ضروری ہے، اموال ربونیہ میں قیمت کے تفاوت کا بالکل اعتبار نہیں ہے۔

موجودہ کرنسی کی شرعی حیثیت کے عنوان کے تحت مذکور سوال میں (الف) دیون مثلاً قرض، مہر اور ادھار خریداری کی قیمتیں (ب) پنشن اور (ج) اجرتوں کو قیمتوں کے اشاریہ کے ساتھ وابستہ کرنے کا حکم الگ الگ ہے۔

دیون کا قیمتوں کے اشاریہ کے ساتھ ربط و تعلق:

الف۔ قرض، مہر اور ادھار خریداری کے ثمن کے نوٹوں کو بوقت عقد ہی قیمتوں کے اشاریہ کے ساتھ معلق کرنا جائز نہیں ہے، اسی طرح عقد کے بعد بھی قیمتوں کے اشاریہ کے ساتھ

ان کو وابستہ کرنا جائز نہیں ہے، اور عدم جواز کے بارے میں حضرت مفتی تقی عثمانی صاحب مدظلہ العالی تحریر فرماتے ہیں: قرآن و سنت کے دلائل میں غور کرنے اور لوگوں کے معاملات کا مشاہدہ کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ قرض کی واپسی (اور ہم جنس کی تبادلہ میں) جو برابری شریعت کی نظر میں مطلوب ہے وہ مقدار اور کمیت میں مطلوب ہے، قیمت اور مالیت میں مطلوب نہیں، جس کے دلائل مندرجہ ذیل ہیں:

۱- اگر ایک شخص دوسرے سے ایک کلو گندم بطور قرض لے اور قرض لیتے وقت ایک کلو گندم کی قیمت پانچ روپے تھی اور جب وہ قرض دار اپنا قرض واپس کرنے لگا تو اس وقت ایک کلو گندم کی قیمت دو روپے ہو گئی تھی تو اب بھی وہ صرف ایک کلو گندم واپس کرے گا، زیادہ نہیں کرے گا، باوجود یہ کہ ایک کلو گندم کی قیمت پانچ روپے سے کم ہو کر دو روپے ہو گئی ہے، اور اس مسئلہ میں تمام فقہاء متقدمین و متاخرین کا اجماع ہے، فقہاء میں کوئی ایک بھی اس مسئلہ میں یہ نہیں کہتا کہ اس صورت میں جب کہ گندم کی مالیت کم ہو گئی ہے صرف ایک کلو گندم واپس کرنا قرض خواہ پر ظلم ہے اس لئے گندم کی قیمت میں جتنی کمی واقع ہوئی ہے اسی نسبت سے اضافہ کر کے قرض خواہ کو واپس کرے، یعنی ایک کلو کے بجائے اب قرض دار ڈھائی کلو گندم واپس کرے، اس لئے کہ ڈھائی کلو گندم کی مالیت اب وہی ہے جو قرض لیتے وقت ایک کلو گندم کی تھی۔

۲- تمام لوگوں کے نزدیک یہ مسلم ہے کہ قرضوں کی واپسی میں برابری کی شرط صرف سود سے بچنے کے لئے ہے اور حضور اقدس ﷺ نے اس مطلوبہ برابری کو رب الفاضل کی احادیث میں پوری تشریح کے ساتھ واضح فرمایا ہے۔

صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں حضرت ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے کہ حضور اقدس ﷺ کے زمانے میں ہمارے پاس ہر قسم کی ملی جلی کھجوریں آیا کرتی تھیں۔ ہم (گھٹیا کھجور کے) دو صاع کو (بڑھیا کھجور کے) ایک صاع کے بدلے میں بیچ دیتے تھے، جب حضور ﷺ کو اس کی

اطلاع ہوئی تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ دو صاع کھجور کو ایک صاع کھجور کے بدلے میں مت بیچو اور نہ دو صاع گندم کو ایک صاع گندم کے بدلے میں بیچو، اور ایک درہم کو دو درہم کے عوض مت بیچو (جامع الاصول لابن اثیر ۱/۵۳۶)، یہ بات حضور ﷺ کو معلوم تھی کہ جو کھجور دو صاع کے بدلے میں بیچی جائے گی وہ اس کھجور کے مقابلے میں زیادہ قیمتی ہوگی جو ایک صاع کے عوض بیچی جائے گی، لیکن اس کے باوجود حضور اقدس ﷺ اس پر راضی نہ ہوئے بلکہ مقدار اور ناپ میں مماثلت اور برابری کا حکم دیا اور قیمت کے فرق کا اعتبار نہیں کیا۔

حضرت مفتی تقی عثمانی صاحب جامع الاصول کے حوالہ سے چند اور احادیث قلم بند فرمانے کے بعد تحریر فرماتے ہیں: مندرجہ بالا تمام احادیث اس بات کو واضح طور پر بیان کر رہی ہیں کہ شریعت میں جو تماثل اور برابری معتبر ہے وہ مقدار میں برابری ہے، اموال ربویہ میں قیمت کے تفاوت کا بالکل اعتبار نہیں، یہ احکام اس صورت میں ہیں جب بیع نقد ہو رہی ہو، اور اگر معاملہ قرض کا ہو جس میں اصل سود جاری ہوتا ہے اور جس میں ہر قسم کی زیادتی بلکہ زیادتی کے شبہ سے بھی بچنا ضروری ہے تو پھر اس میں قیمت کے تفاوت کا لحاظ کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا.....

قرآن و سنت کی روشنی میں یہ بات تمام فقہاء کے نزدیک مسلم ہے کہ قرض کی واپسی کے وقت مقدار میں یقینی مثلیت اور برابری شرط ہے، اٹکل اور اندازے سے واپسی کرنا جائز نہیں..... بہر حال! مندرجہ بالا بحث سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ ”اشاریہ“ اپنے تمام مراحل میں اندازہ اور تخمین پر مبنی ہے، اور اگر کسی جگہ پر حساب بہت باریک بینی اور احتیاط سے بھی کی جائے تو بھی اس کے نتیجے کو زیادہ سے زیادہ تقریبی تو کہہ سکتے ہیں، یقینی اور واقعی پھر بھی نہیں کہہ سکتے، جب کہ اوپر احادیث کی روشنی میں یہ واضح ہو چکا ہے کہ قرضوں کی واپسی میں اٹکل اور اندازہ کی شرط لگانا شرعاً جائز نہیں، لہذا قرضوں کی ادائیگی کو قیمتوں کے اشاریہ سے وابستہ کر دینا کسی حال میں بھی جائز نہیں..... جب یہ مسئلہ پاکستان کی ”اسلامی نظریاتی کونسل“ کے

سامنے بھی پیش ہوا تو کونسل کے تمام ارکان بشمول علماء و معاشین سب نے اس بات پر اتفاق کیا کہ ”قرضوں کے قیمتوں کے اشاریہ کے ساتھ ربط“ کے نظریہ کی شریعت اسلامیہ میں کوئی گنجائش اور وجہ جواز نہیں ہے۔ اسی طرح خاص اسی موضوع پر ہونے والے سمینار میں بھی بحث کی گئی جس کو اسلامی ترقیاتی بینک اور عالمی ادارہ برائے اسلامی اقتصادیات، اسلام آباد نے مشترکہ طور پر شعبان ۱۴۰۷ھ میں منعقد کیا تھا، اس سمینار میں مختلف ممالک کے بہت سے علماء اور ماہرین معاشیات نے شرکت کی تھی۔ وہ قرارداد جس پر تمام شرکاء نے اتفاق رائے ظاہر کیا وہ مندرجہ ذیل ہے:

۱- کرنسی نوٹ تمام معاملات (مثلاً اس میں سود جاری ہونے اور زکوٰۃ واجب ہونے، بیع سلم اور مضاربت اور شرکت وغیرہ کے راس المال بننے) میں نقدین یعنی دراہم اور دنانیر کی طرح ہیں۔ اور امام ابو یوسف کا قول کہ اگر سکوں کی قیمت زیادہ ہو جائے یا کم ہو جائے، تو اس صورت میں قرض کی واپسی ادائیگی کے وقت نقدین کے تناسب سے سکوں کی قیمت واپس کرنا ضروری ہے۔ ان کا یہ قول کرنسی نوٹوں میں جاری نہیں ہوگا؛ اس لئے کہ یہ کرنسی نوٹ نقدین کے قائم مقام ہیں اور ان نقدین کی قیمت بڑھنے اور کم ہونے کا معتبر نہ ہونا متفق علیہ ہے۔

۲- سمینار میں حاضر تمام علماء نے اس بات کی توثیق کی ہے کہ سود اور قرض کی احادیث میں جو مثلثیت اور برابری ضروری قرار دی گئی ہے وہ شرعی جنس اور قدر یعنی وزن، ناپ اور عدد میں برابری مراد ہے، قیمت میں برابری مراد نہیں۔ اور یہ بات ان احادیث کے ذریعہ پوری طرح واضح ہو جاتی ہے جو احادیث اموال ربویہ کے تبادلہ کے وقت عمدہ اور گھٹیا ہونے کے وصف کو غیر معتبر قرار دیتی ہیں، اسی پر امت کا اجماع ہے اور اسی پر عمل جاری ہے۔

۳- ذمہ میں ثابت شدہ دیون چاہے وہ کسی بھی قسم کے ہوں، ان کو قیمتوں کے اشاریہ کے ساتھ منسلک کر دینا جائز نہیں؛ بایں طور کہ عاقدین عقد بیع یا عقد قرض کے وقت اس کرنسی کو جس کے ذریعہ عقد بیع یا عقد قرض کر رہے ہیں، کسی سامان کے ساتھ منسلک کر کے یہ شرط ٹھہرائیں

کہ مدیون ادائیگی کے وقت اس سامان کی قیمت موجودہ کرنسی میں ادا کرے گا (فقہی مقالات از مفتی تقی عثمانی، ۱/۳۵۳ ملخصاً)۔

### پنشن کو قیمتوں کے اشاریہ کے ساتھ وابستہ کرنا:

ب۔ پنشن کو قیمتوں کے اشاریہ کے ساتھ وابستہ کرنا جائز ہے، کیوں کہ پنشن شرعاً دین نہیں ہے، بلکہ مستاجر کی طرف سے ملازم پر تبرع و احسان ہے اور اس میں کوئی تبادلہ و بیع کی صورت نہیں ہو رہی ہے، بلکہ پنشن کے نام پر ملازم کو جو بھی رقم ملے گی قیمتوں کے اشاریہ سے وابستہ ہو کر یا اس کے بغیر وہ تبرع و احسان ہوگی، چنانچہ حضرت مفتی محمود حسن گنگوہیؒ ایک سوال (پنشن کی بیع) کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:

”ملازمت سے سبکدوشی پر تازیت ملازم کو رقم ماہانہ متعین کر کے بنام حق الخدمت دینا واجب نہیں، بلکہ تبرع ہے، جس پر جبر نہیں کیا جاسکتا، بلکہ اس کا دل چاہے دے نہ چاہے نہ دے۔ جس طرح ماہانہ رقم دینا تبرع ہے، جبر نہیں، اسی طرح یہ بھی اختیار ہے کہ اندازہ کر کے مجموعی رقم یکمشت دیدے۔ یہ درحقیقت احسان ہی کی ایک صورت ہے، اس میں اس لئے اصلۃً نہ بیع مالا یملک ہے، نہ بیع مالیس عندہ ہے، نہ قمار ہے، نہ ربوا، لہذا یہ لین دین شرعاً درست ہے“  
 ”ونظیرہ بیع الصرا یا“ الخ (قادی محمودیہ ۱۶/۱۱۵، مکتبہ ادارہ صدیق ڈابھیل)۔

### اجرتوں کو قیمتوں کے اشاریہ کے ساتھ منسلک کرنا:

ج۔ اجرتوں کو قیمتوں کے اشاریہ کے ساتھ وابستہ کرنے کے مسئلہ میں تفصیل ہے کہ اجرت جب تک قرض نہ بن جائے تب تک اس کا حکم قرضوں کے اشاریہ سے ربط والے حکم سے مختلف ہوگا، اور جب اجرت قرض بن جائے تو پھر اس کا حکم بھی وہی ہوگا جو قرضوں کے اشاریہ کے ساتھ وابستہ کرنے کا حکم ہے، یعنی ناجائز ہے۔

اجرت جب کہ دین نہ بنی ہو اور اس کو قیمتوں کے اشاریہ کے ساتھ وابستہ کیا جائے تو اس میں تین صورتیں ممکن ہیں، اور ان کا کیا حکم ہے؟ یہ سب تفصیل حضرت مفتی تقی عثمانی کے الفاظ میں حسب ذیل ہے:

اجرتوں کا قیمتوں کے اشاریہ سے ربط و تعلق:

جہاں تک اجرتوں کے قیمتوں کے اشاریہ سے ربط کا مسئلہ ہے، تو جب تک اجرت قرض نہ بن جائے، اس وقت تک اس کا حکم قرضوں کے ربط سے مختلف ہوگا، البتہ اجرت اگر قرض بن جائے تو اس صورت میں اس کا حکم بھی وہی ہوگا جو قرضوں کے ربط کا حکم ہے۔

تفصیل اس کی یہ ہے کہ اجرتوں کے قیمتوں کے اشاریہ سے ربط کی تین صورتیں ممکن ہیں:

۱- پہلی صورت یہ ہے کہ اجرتیں اور تنخواہیں نوٹوں کے ذریعہ طے ہو جائیں کہ اتنی

اجرت یا تنخواہ دی جائے گی اور متعاقدین یعنی مالک اور مزدور کے درمیان یہ معاہدہ ہو جائے کہ یہ

تنخواہ ہر سال قیمتوں کے اشاریہ کی زیادتی کے تناسب سے بڑھتی رہے گی، مثلاً حکومت ایک شخص

کو تین ہزار روپے ماہوار تنخواہ پر ملازم رکھے اور یہ معاہدہ کر لے کہ یہ تنخواہ ہر سال کے شروع میں

قیمتوں کے اشاریہ میں زیادتی کے تناسب سے بڑھتی رہے گی۔ اس صورت میں اس ملازم کو

ہر سال کے آخر تک ہر ماہ تین ہزار روپے ہی قبول کرنے پڑیں گے اور درمیان سال میں قیمتوں

کے اشاریہ میں زیادتی کے تناسب کو نہیں دیکھا جائے گا۔ البتہ جب نیا سال شروع ہوگا تو اس

وقت قیمتوں کے اشاریہ کو دیکھا جائے گا کہ ایک سال کے اندر اس میں کس تناسب سے زیادتی

ہوئی، مثلاً قیمتوں کے اشاریہ میں پانچ فیصد کے تناسب سے زیادتی ہوئی تھی تو اس ملازم کی تنخواہ

میں بھی اسی تناسب سے زیادتی کرنی ہوگی۔ لہذا نئے سال میں اس کی تنخواہ تین ہزار ایک سو

پچاس روپے ہو جائے گی۔ یہ طریقہ بہت سے ممالک مثلاً پاکستان وغیرہ میں رائج ہے۔ اور اس

قسم کے ربط کی شریعت میں کوئی ممانعت نہیں ہے، اس لئے کہ اس صورت کا حاصل یہ ہے کہ

دونوں فریق اجرتوں اور تنخواہوں میں ہر سال یا ہر چھ ماہ بعد ایک معین تناسب سے زیادتی پر متفق ہو گئے ہیں۔ اور یہ زیادتی کا تناسب اگرچہ عقد کے وقت تو فریقین کے علم میں نہیں ہوتا، مگر وہ پیمانہ معلوم ہے جس کی بنیاد پر تناسب کا تعین ہوگا؛ اس لئے زیادتی کی مقدار میں جو جہالت کا شبہ تھا وہ مرتفع ہو گیا۔ یا یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہر نئے سال کے شروع میں جس تناسب سے قیمتوں میں زیادتی ہوئی ہوگی، اسی تناسب سے اضافہ شدہ اجرت پر اس عقد اجارہ کی تجدید کی جائے گی، اور اس میں کوئی شرعی ممانعت نہیں ہے۔

۲- اجرتوں کے قیمتوں کے اشاریہ سے ربط کی دوسری صورت یہ ہے کہ اجرت کی تعیین نوٹوں کی ایک مقدار پر ہو جائے، لیکن عقد میں شرط کر لیں کہ مالک کے ذمہ یہ مقدار معلوم واجب نہیں بلکہ اس کے ذمہ وہ مقدار واجب ہوگی جو قیمتوں کے اشاریہ کی رو سے مہینہ کے آخر میں اس مقدار معلوم کے مساوی اور برابر ہوگی۔ مثلاً زید نے عمر کو ایک ماہ کے لئے ملازم رکھا اور یہ طے پایا کہ زید عمر کو مہینہ کے آخر میں قیمتوں کے اشاریہ کا لحاظ کرتے ہوئے اتنی رقم اجرت میں دے گا، جو موجودہ ایک ہزار روپے کے مساوی ہوگی۔ چنانچہ قیمتوں کے اشاریہ میں ایک ماہ کے اندر دو فیصد کے تناسب سے قیمتیں بڑھ گئیں۔ تو اب زید مہینہ کے آخر میں عمر کو ایک ہزار بیس روپے (۱۰۲۰ روپے) ادا کرے گا؛ اس لئے کہ یہ ایک ہزار اور بیس روپے شروع مہینہ کے ایک ہزار روپے کے مساوی ہیں۔ لیکن جب مہینے کے آخر میں یہ طے ہو گیا ہے کہ تنخواہ ایک ہزار اور بیس روپے ہے تو اب یہ تنخواہ ہمیشہ کے لئے ایک ہزار اور بیس روپے ہے۔ تو اب یہ تنخواہ ہمیشہ کے لئے ایک ہزار اور بیس روپے رہے گی زیادہ نہ ہوگی، لہذا اگر مالک مہینے کے آخر میں یہ تنخواہ ادا نہیں کر سکا حتیٰ کہ ایک مہینہ اور گزر گیا یا ایک سال گزر گیا اور اس نے تنخواہ ادا نہیں کی، تب بھی مالک کے ذمہ ایک ہزار اور بیس روپے واجب ہوں گے، قیمتوں کے اشاریہ میں زیادتی سے اس میں زیادتی نہیں آئے گی۔ مثلاً اگر اس میں عرصہ میں قیمتوں کے اشاریہ میں دس فیصد کے تناسب سے اضافہ ہو گیا

تو وہ ملازم یہ مطالبہ نہیں کر سکے گا کہ چونکہ قیمتوں کے اشاریہ میں دس فیصد کے تناسب سے اضافہ ہو چکا ہے اس لئے اب مجھے ایک ہزار بیس روپے پر دس فیصد کے حساب سے اضافہ کر کے اجرت دی جائے؛ اس لئے کہ عقد کے وقت ہی آپس کے اتفاق سے اجرت کے بارے میں یہ بات طے ہو چکی تھی کہ مہینے کے آخر میں جتنے روپے موجودہ ایک ہزار کے مساوی ہوں گے وہ دیئے جائیں گے، اور صرف اس کی تعیین کے لئے قیمتوں کے اشاریہ کو مد نظر رکھا جائے گا، لیکن جب مہینے کے آخر میں قیمتوں کے اشاریہ کی بنیاد پر ایک مرتبہ اجرت طے ہو گئی تو اب قیمتوں کے اشاریہ کا کام مکمل ہو چکا۔ اب اس کی ضرورت نہیں رہی اور اب وہ معین اجرت مالک کے ذمہ قرض ہو گئی، جس میں آئندہ نہ تو زیادتی ہو سکتی ہے اور نہ کمی واقع ہو سکتی ہے۔ قیمتوں کے اشاریہ میں چاہے کتنے بھی تغیرات واقع ہو جائیں۔

جہاں تک اس صورت کی شرعی حیثیت کا تعلق ہے تو میری رائے میں یہ بھی جائز ہے، بشرطیکہ قیمتوں کا اشاریہ اور اس کے حساب کا طریقہ فریقین کو اچھی طرح معلوم ہوتا کہ بعد میں لاعلمی کی بنا پر آپس میں جھگڑا نہ ہو جائے؛ اس لئے کہ یہاں دونوں فریق اس بات پر متفق ہیں کہ طے شدہ اجرت ایک ہزار روپے نہیں بلکہ قیمتوں کے اشاریہ کے اعتبار سے مہینے کے آخر میں جتنے روپے موجودہ ایک ہزار روپے کے مساوی ہوں گے وہ مالک پر دینے واجب ہوں گے، جس کو حساب کے ذریعہ نکالنے کا طریقہ دونوں فریق کو معلوم بھی ہے۔ لہذا اجرت کی مقدار میں اتنی جہالت جھگڑے کا سبب نہیں بنے گی اور یہ صورت بالکل اسی طرح ہے جیسے کہ ایک شخص نے کسی کو ملازم رکھا اور اجرت یہ طے کی کہ مہینے کے آخر میں دس گرام سونے کی جو قیمت ہوگی وہ مالک کے ذمہ ادا کرنی واجب ہوگی۔ جب مہینے کے آخر میں دیکھا تو دس گرام سونے کی قیمت دو ہزار روپے تھی تو خود بخود یہ طے ہو گیا کہ اجرت دو ہزار روپے ہے۔ اب اس کے بعد اس اجرت میں نہ تو زیادتی ہوگی اور نہ کمی ہوگی، چاہے سونے کی قیمت اس بعد زیادہ ہو جائے یا کم ہو جائے، اس سے



اجرت پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔

۳۔ اجرتوں کے قیمتوں کے اشاریہ کے ساتھ ربط کا تیسرا طریقہ یہ ہے کہ اجرت تو روپے کی معین مقدار کے ذریعہ طے ہو جائے اور فریقین کے درمیان یہ شرط ہو جائے کہ وہ اجرت مالک کے ذمہ واجب ہوگی جو عقد اجارہ میں طے ہوئی ہے۔ لیکن مالک جس دن یہ اجرت ادا کرے گا، اس دن قیمتوں کے اشاریہ میں جس تناسب سے اضافہ ہوا ہوگا، اسی تناسب سے وہ اجرت میں بھی اضافہ کر کے ادا کرے گا۔ مثلاً ایک شخص نے کسی کو ایک ہزار روپے پر ملازم رکھا اور دونوں کے درمیان یہ طے ہو گیا کہ اجرت ایک ہزار روپے ہے۔ لیکن مالک پر یہ ضروری ہوگا کہ جس دن وہ یہ اجرت ادا کرے گا، اس دن قیمتوں کے اشاریہ میں جس تناسب سے اشیاء کی قیمتوں میں اضافہ ہوا ہوگا، اسی تناسب سے وہ بھی ایک ہزار روپے میں اضافہ کر دے گا۔ لہذا مالک نے اگر یہ اجرت مہینے کے آخری دن میں ادا کی اور اس روز قیمتوں کے اشاریہ میں دو فیصد کے تناسب سے اضافہ ہو چکا تھا، تو اب مالک بھی دو فیصد کے تناسب سے اضافہ کر کے ایک ہزار اور بیس روپے ادا کرے گا۔ اور اگر مالک نے یہ اجرت ایک سال کے بعد ادا کی اور اس وقت تک قیمتوں کے اشاریہ میں دس فیصد کے تناسب سے اشیاء کی قیمتوں میں اضافہ ہو چکا تھا تو اب مالک بھی دس فیصد کے تناسب سے اضافہ کر کے گیارہ سو روپے ادا کرے گا۔

میری رائے میں اس کا شرعی حکم قرضوں کے قیمتوں کے اشاریہ کے ساتھ ربط کی طرح ہے، جو کہ شرعاً جائز نہیں، جیسا کہ ہم تفصیل سے پیچھے بیان کر چکے ہیں (فقہی مقالات از حضرت مفتی تقی عثمانی صاحب ۱/ ۷۸۴-۷۸۵)۔

۲۔ نوٹوں کی مالیت کو سونے یا چاندی میں طے کرنا:

قرض میں دیئے جانے والے روپیوں کی مالیت کو سونے یا چاندی میں طے کرنا اور بوقت ادائیگی اس قدر سونے یا چاندی کی قیمت کے مساوی نوٹوں کی ادائیگی پر معاملہ طے کرنا جائز

نہیں ہے، کیوں کہ یہ ربا کی صورت ہے۔ کرنسی نوٹ ایک جنس ہے اور اس کی اسی جنس کی شکل میں ادائیگی برابر کے اصول پر ہی ہونی چاہئے۔ پھر جو صورت پیش کی گئی ہے اسے فقہی نقطہ نظر سے دیکھئے تو ثمن کا تبادلہ سونے کی مقدار سے نسیئہ ہے اور پھر سونے کی مقدار کو ثمن کی شکل میں اضافہ کے ساتھ حاصل کرنا ہے، اس لئے اس کے جواز کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔ ادھار فروخت کا معاملہ بھی اسی طرح (نا جائز) ہے۔ رہا مہر کا معاملہ تو مہر سونے یا چاندی ہی کی شکل میں کیوں نہیں طے کر لیا جاتا؟ اس تکلف کی آخر کیا ضرورت ہے کہ نوٹوں میں مہر مقرر کیا جائے اور سونے یا چاندی میں اس کی مالیت طے کی جائے اور پھر وصولیابی کے وقت سونے یا چاندی کی قیمت کے مساوی نوٹ حاصل کر لئے جائیں۔ سیدھی بات یہی ہے کہ اس چکر میں پڑے بغیر سونے یا چاندی کی مقدار مہر میں مقرر کی جائے۔ عورت چاہے تو ادائیگی کے وقت اس کی قیمت بازار کے نرخ میں وصول کر سکتی ہے، اس میں نہ شرعاً کوئی حرج واقع ہوتا ہے اور نہ عورت خسارہ میں رہتی ہے، نیز مرد پر بھی کوئی زائد بار نہیں پڑتا۔

### خلاصہ بحث:

قرض، مہر اور ادھار خریداری کے ثمن کے روپیوں کو عقد کے وقت یا عقد کے بعد قیمتوں کے اشاریہ کے ساتھ وابستہ کرنا جائز نہیں ہے، اور پنشن چوں کہ دین نہیں ہے، بلکہ تبرع ہے، لہذا اس کو قیمتوں کے اشاریہ کے ساتھ وابستہ کرنا جائز ہے، اور اجرت اگر دین بن چکی ہو تو اس کا حکم دیون کی طرح ناجائز ہے، اور اگر اجرت دین نہیں بنی ہے تو اس میں تفصیل ہے۔ قرض، مہر اور ادھار خریداری کے ثمن کے نوٹوں کی مالیت سونے یا چاندی میں طے کرنا اور بوقت ادائیگی اسی قدر سونے یا چاندی کی قیمت کے مساوی نوٹوں کی ادائیگی پر معاملہ طے کرنا جائز نہیں ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

## نوٹوں کی شرعی حیثیت

مولانا عبدالنواب اناوی ☆

الحمد لله رب العلمين والصلوة والسلام على رسوله الكريم اما بعد۔  
یہ بات اپنی جگہ حقیقت پر مبنی ہے کہ کاغذی نوٹوں کی اپنی ذاتی کوئی قیمت نہیں ہوتی۔  
ساتھ ہی ہم نے یہ بھی تسلیم کر لیا ہے کہ وہ زرِ خلقی تو نہیں، بلکہ مشابہ زرِ خلقی ہو کر زرا اصطلاحی و قانونی  
کا درجہ رکھتا ہے، اور معاملات کی دنیا میں اس کی حیثیت ٹھن کی ہے۔

اور یہ بات بھی اپنی جگہ پر مسلم ہے کہ موجودہ زرا اصطلاحی کی حیثیت بین الاقوامی سطح پر  
گھٹتی بڑھتی رہتی ہے اور مشاہدہ یہی ہے کہ اکثر افراط زر کی وجہ سے کاغذی نوٹوں میں کمی ہی واقع  
ہوتی ہے اور کبھی کبھار بڑھ بھی جاتی ہے، جیسا کہ اخبار وغیرہ میں دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے۔

اس صورت حال میں ان حضرات کے درمیان جن کے یہاں ہفتہ عشرہ یا ماہ دو ماہ کے  
لئے قرض وغیرہ کے معاملات ہوتے ہیں تو ان کے یہاں کسی نوع کا کوئی احساس پیدا نہیں ہوتا۔  
لیکن وہ حضرات جن کے درمیان دو چار دس سال بلکہ اس سے بھی زیادہ مدت تک کے لئے  
معاملات ہوتے ہیں، تو عموماً ایسی صورت میں لین دین کے نوٹوں کی قوت خرید میں ایک بڑی حد  
تک تفاوت نظر آتا ہے۔ اب اس تفاوت کو دیکھ کر بسا اوقات متعاقدین بربناء عقد تو کچھ نہیں کہتے  
لیکن دلوں میں اس کا احساس ضرور پیدا ہوتا ہے۔ جس کا اثر عموماً ظاہر یہ ہوتا ہے کہ آدمی کسی کو

قرض دینے، اپنی رقم کسی پر زیادہ مدت تک کے لئے چھوڑنے، اور اسی طرح بیوی شوہر کے نادار ہونے کے باوجود اپنے حق مہر کے مطالبے کو کچھ لمبے زمانے تک چھوڑے رکھنے کو گوارا نہیں کرتی۔ اسی طرح اور بہت سی خرابیاں معاشرہ میں پیدا ہوتی ہیں۔

بہر حال شرعی نقطہ نظر سے ہم آہنگی برقرار رکھتے ہوئے ان غلط احساسات کو کس طرح دور کیا جاسکتا ہے اس پر نظر کی ضرورت ہے۔

شریعت اسلامیہ کا قرض کے بارے میں خواہ قرض کسی بھی نوع کا ہو اور معجل المطالبہ ہو یا مؤخر المطالبہ واضح موقف ہے۔

مثلاً: ”القروض يجب في الشريعة الاسلامية ان تقضى بامثالها“ یعنی شریعت اسلامیہ میں تمام طرح کے قرضوں کی ادائیگی ان کے مثل سے کرنا واجب ہے (بحوث فی قضایا فقہیہ معاصرہ ۱۷۴ کراچی)۔

”الديون تقضى بامثالها“ یعنی تمام دیون اپنے مثل سے ادا کئے جائیں گے (الاشباہ والنظائر الفن الثانی ۶۵۶)۔

(رد المحتار کتاب الایمان باب الیمن فی الصرف والقتل وغیر ذلک، مطلب الديون تقضى بامثالها ۳/۸۳۸)۔

اکابر علماء کے یہاں بھی اس باب میں کچھ اسی طرح کے فتاویٰ نظر آتے ہیں۔ چنانچہ حضرت مولانا مفتی محمود حسن فرماتے ہیں: اب سے ۱۲، ۱۵ برس پہلے جتنے نوٹ قرض لئے تھے اتنے ہی نوٹ واپس کرنے کا حکم ہے (فتاویٰ محمودیہ ۱۶/۳۰۶، باب القرض)۔ ایک جگہ فرماتے ہیں: اگر سوکا نوٹ لیا تھا تو سوکا نوٹ واپس کر دے، بری الذمہ ہو جائے گا، اس کی گرانی سے اس پر اثر نہ ہوگا، جن کو نوٹ قرض دیا ہے ان سے نوٹ ہی واپس لینے کا حق ہے (فتاویٰ محمودیہ ۱۶/۳۰۷، باب القرض)۔

صاحب تنویر الابصار قرض کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ”ہو عقد مخصوص یرد علی دفع مال مثلی لآخر لیود مثله“ (تنویر الابصار مع الدر المختار، باب المراجحة والتولیة، فصل فی القرض، شامی ۱۶/۵)۔

یعنی قرض ایسا عقد مخصوص ہے جو وارد ہوتا ہے اموال مثلیہ کے دینے پر دوسرے کے لئے کہ وہ اسی کا مثل واپس کرے۔

نوٹ، سکہ، درہم، وونانیر، یہ سب کے سب مثلیات میں سے ہیں اور مثلیات میں مثل ہی واپس کرنا مشروع ہے، لہذا ان کی ادائیگی کو قیمتوں کے ساتھ وابستہ کرنا کئی وجہوں سے درست معلوم نہیں ہوتا۔

(۱) سنن ابوداؤد میں ہے:

”عن ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما قال: کنت أبيع الإبل بالبقیع،

فأبيع بالدنانیر و آخذ الدراهم وأبيع بالدراهم و آخذ الدنانیر، آخذ هذه من هذه وأعطی هذه من هذه، فأتیت رسول اللہ ﷺ، و هو فی بیت حفصة رضی اللہ عنہا فقلت: یا رسول اللہ ﷺ رویدک، أسئلك إنی أبيع الإبل بالبقیع، فأبيع بالدنانیر و آخذ الدراهم وأبيع بالدراهم و آخذ الدنانیر، و آخذ هذه من هذه وأعطی هذه من هذه، فقال رسول اللہ ﷺ: لا بأس أن تأخذ بسعر یومها ما لم تتفرقا و بینكما شیء“ (سنن ابوداؤد: کتاب البیوع، باب فی اقتضاء الذهب من الورق ۱۲۰/۲ الملتان)۔

دیکھئے اگر دیون کو اشیاء کی قیمتوں سے وابستہ کر دیا جائے تو مذکورہ حدیث شریف کی مخالفت لازم آئے گی، کیوں کہ آپ ﷺ نے یہاں پر جو بات ارشاد فرمائی ہے وہ صرف معاملہ کے دن سے ہی وابستہ فرمائی ہے اور اسے مزید مجلس اور متعاقدین کی رضامندی سے بھی مقید کیا

ہے اور صورت مسئلہ میں تو حدیث کا مقصود ہی مفقود ہوتا نظر آتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ بعض اکابر فقہاء کرام نے معاملۃ الیوم میں بھی اس طرح کی صورتوں کو درست قرار نہیں دیا ہے، بذل الحجوہ میں مذکورہ حدیث کی وضاحت کرتے ہوئے صاحب کتاب لکھتے ہیں: "فذهب اکثر اهل العلم إلى جوازه ومنع من ذلك أبو سلمة بن عبد الرحمن وأبو شبرمة وکان ابن ابی لیلی یکره ذلك إلا بسعر یومه، ولا یعتبر غیره السعر ولم یبالوا کان ذلك بأغلی او أرخص من سعر الیوم" (بذل الحجوہ: کتاب البیوع، باب فی اقتضاء الذہب من الورق ۵، ۲۳۶، امدادیہ - ملتان)۔

اکثر اہل علم حضرات نے سعر یوم پر معاملہ کو جائز قرار دیا ہے، البتہ ابو شبرمہ اور ابو سلمہ بن عبد الرحمن نے اس سے منع فرمایا ہے اور ابن ابی لیلی تو معاملۃ الیوم کے سعر سے ہٹ کر معاملہ کرنے کو مکروہ قرار دیتے تھے، اور معاملۃ الیوم کے سعر کے علاوہ فقہاء کے یہاں کسی بھی سعر کا کوئی اعتبار نہیں ہے؛ خواہ وہ معاملۃ الیوم کے سعر سے بڑھا ہوا ہو یا گھٹا ہوا۔

۲- دیون کو اشیاء کی قیمتوں سے وابستہ کرنے میں نزاع ہے؛ کیوں کہ ایک شئی کی قیمت ایک ہی بازار میں مختلف سمتوں کے اعتبار سے الگ الگ ہوتی ہے، مثلاً ایک ہی شئی کارخانے میں بہت کم قیمت کی ہوتی ہے، فٹ پاتھ پر کچھ اس سے زیادہ، پھر چھوٹی بازار میں اس کی قیمت کچھ اور، بڑی بازار میں کچھ اور، پھر شوروم میں جا کر وہی شئی ایک متوسط گھرانے سے تعلق رکھنے والے شخص کے لئے ناقابل خرید بن جاتی ہے۔

۳- اگر دیون کو اشیاء کی قیمتوں سے جوڑ دیا جائے تو لوگوں کے درمیان سودوربا کا دروازہ وا ہو جائے گا اور لوگ بلا جھجک سود خوری میں مبتلا ہو جائیں گے، اور پھر وبا سے بچنا بچانا مشکل ترین امر ہوگا۔

البتہ اگر مہر، تنخواہ، قرض اور ادھار فروختگی میں ہر ایک کے مد مقابل کو مثلاً مہر کے

مد مقابل قیمت ملک بضع، تنخواہ کے مد مقابل اجرت عمل، ادھار فروختگی کے مد مقابل ثمن بیع اور قرض میں واپسی قرض کو سونا یا چاندی میں بمعاملہ ثانی تبدیل کر دیا جائے پھر بوقت ادائیگی وہی مبدولہ شئی خواہ سونا ہو یا چاندی یا اس کی بوقت ادا قیمت ادا کی جائے تو درست معلوم ہوتا ہے۔ لیکن پنشن میں چوں کہ اس کا کوئی مد مقابل معلوم نہیں ہوتا ہے اس لئے اس میں یہ صورت بھی بنتی نظر نہیں آتی۔

رہی بات یہ کہ ایسے اشاریہ جن کے ذریعہ ادائیگیوں میں انضباط ممکن ہو تو چاندی سونا کے علاوہ چوں کہ کوئی دوسری چیز ثمن خلقی نہیں ہے اس لئے اور اس لئے بھی کہ دوسری چیزوں میں تنازع کی اتنی صورتیں ہیں کہ جن سے بچنا مشکل ترین امر ہے، لہذا سونا چاندی کے علاوہ دوسری چیزوں سے اس طرح کا معاملہ مفضی الی النزاع ہی رہے گا۔

اور ایسے معیار مقرر کرنا جن کی بنیاد دقیق فنی اصولوں پر ہو وہ عوام الناس میں مفضی الی النزاع ہو کر حضرات اہل علم اور ارباب افتا کے لئے مواضع تہمت، نیز ابواب ربا کے کھولنے میں معین و مددگار ثابت ہوں گے۔

چوں کہ نوٹ مثلیات میں سے ہیں لہذا ان کی قوت خرید گھٹے یا بڑھے، لین دین میں کسی بھی طرح کمی زیادتی ہوگی تو وہ یقیناً ربا ہوگی، اور دیون کی قیمتوں سے اشاریہ قائم کیا جائے یا اسے دقیق فنی اصولوں پر منطبق کیا جائے بہر حال نزاع و فساد کا باعث رہے گا اور عوام الناس کو اس سے سود لینے اور دینے کا ایک جائز راستہ ملے گا؛ کیوں کہ عوام الناس اتنی باریکیوں میں نہ جائیں گے اور نہ ہی ان کے اندر دقیق فنی اصولوں کو سمجھنے اور ان پر عمل کرنے کی صلاحیت ہی ہے، اس لئے وہ سیدھے سیدھے ہر کمی و زیادتی کو جائز سمجھتے ہوئے معاملات کریں گے۔ اس لئے دیون کو نہ قیمتوں سے وابستہ کیا جائے نہ اشاریہ کا قیام ہو اور نہ ہی اسے دقیق فنی اصولوں پر منطبق کیا جائے؛ بلکہ انہیں اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے اور جس طرح معاملات دیون ہو رہے ہیں ہونے

دئے جائیں..... البتہ پنشن یا اس کے علاوہ کوئی دوسری چیز جن کا کوئی مد مقابل نہ ہو مثلاً انعام وغیرہ کے علاوہ مثلاً مہر، قرض وقت پر نہ دی جانے والی تنخواہ، ادھار فروختگی وغیرہ جن کا مد مقابل ہو، پہلے معاملے کے بعد دوسرا معاملہ کما حقہ چاندی یا سونے سے ان کی اپنی اپنی قیمت و قیمت کے اعتبار سے کی جائے تو درست معلوم ہوتا ہے۔

۲- نوٹوں کی شکل میں قرض دیتے وقت یا مہر کے تقرر کے وقت یا ادھار فروختگی کے وقت طرفین واجب الاداء نوٹ کی مالیت سونے یا چاندی میں طے کر لیں اور بوقت ادائیگی اسی قدر سونے یا چاندی کی قیمت کے مساوی نوٹوں کی ادائیگی عمل میں آئے، یہ صورت کئی وجہوں سے درست معلوم نہیں ہوتی۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ قرض وغیرہ میں یہاں لئے دئے جا رہے ہیں کاغذی نوٹ اور معاملہ ہو رہا ہے چاندی یا سونے کا، یہ کسی بھی طرح جائز نہیں ہو سکتا، اگر اس کو درست مان لیا جائے تو ربا کا دروازہ کھل جائے گا جس کا بند کرنا محال ہوگا؛ کیوں کہ یہاں پر چاندی اور سونے کا معاملہ موہوم ہوگا اور نوٹوں کا معاملہ معقود ہوا، اور نوٹ مثلی ہیں جن کی ادائیگی مثل سے ہونی چاہئے مگر معاملہ موہوم کی وجہ سے مثل کی ادائیگی زیادتی کے ساتھ ہوگی اس لئے اس کے جواز سے تو کھلم کھلا ربا کا جواز ثابت ہوگا، حالانکہ فقہاء کرام کی تشریحات مثلیات کے سلسلے میں بہت واضح طور پر موجود ہیں۔

”رجل استقرض من آخر مبلغا من الدراهم وتصرف بها ثم غلی سعرها فهل علیہ ردھا مثلھا؟ الجواب نعم، ولا ینظر إلی غلاء الدراهم وخصھا“ (تنقیح الفتاویٰ الحامدیہ: باب القرض ۱/۲۹۴ رشیدیہ)۔

(صاحب تنقیح الفتاویٰ لکھتے ہیں کہ ایک شخص نے کسی سے ایک متعین مقدار دراہم قرض لیے اور ان کو خرچ کر ڈالا پھر ان کا بھاؤ بڑھ گیا وہ کیا تو شخص جتنے دراہم قرض میں لئے تھے



اتنے ہی واپس کرے؟ جواب: جی ہاں، اس شخص نے جتنے درہم قرض میں لیے تھے اتنے ہی واپس کرے، درہم کے بھاؤ کے بڑھنے یا گھٹنے کی طرف بالکل نظر نہیں کی جائے گی۔

اسی طرح علامہ کا سانی فرماتے ہیں:

”ولو استقرض فلوسا نافقة وقبضها ولم تكسد لکنها رخصت او

غلت فعليه رد مثله ما قبض بلا خلاف“ (بدائع الصنائع: کتاب البيوع، فصل فی حکم البيع ۷/۲۳۷، دارالکتب العلمیہ بیروت)۔

(اگر کسی نے فلوس نافقہ قرض لیے اور ان پر قبضہ کر لیا اور وہ کاسد نہیں ہوئے لیکن ان کا بھاؤ اتر گیا یا چڑھ گیا تو بالاتفاق اسی کا مثل واپس کرنا ہوگا جس پر اس نے قرض لیتے وقت قبضہ کیا تھا)۔

اور فتاویٰ کالمیہ میں ہے:

”سئلت عن رجل أقرض آخر مقدارا من الريال المحیدی وقت

رواجه بثلاثین قرشا ثم رد المستقرض له مثل المقدار الذی استقرضه منه بعد أن نزل إلى عشرين قرشا فامتنع المقرض من قبوله وطلب منه صرفها علی سعر ثلاثین قرشا فهل لیس له ذلك؟ فالجواب أنه لیس له الامتناع من قبول مثل مادفع..... وفي نتیجه الفتاوی ما نصه والمقبوض علی وجه القرض مضمون بمثله وفيها نقلا عن جامع الفصولین والواجب فی القرض رد المثل“ (الفتاویٰ الکالمیہ ۹۲، باب القرض، مطلب الواجب فی القرض رد المثل - مکتبہ حقانیہ پشاور)۔

(ایک ایسے آدمی کے سلسلے میں سوال کیا گیا جس نے ایک آدمی کو محیدی وقت کے چند ریال قرض دیے اس وقت محیدی ریال کی قیمت ۳۰ قرش تھی جب قرض لینے والے نے قرض کی واپسی کا ارادہ کیا تو اس کی قیمت گھٹ کر بیس قرش ہی رہ گئی تھی، جب اسے لے کر قرض خواہ کے

پاس گیا تو اس نے اسے لینے سے انکار کر دیا بلکہ پورے تیس قرش کا مطالبہ کیا، تو کیا اس کے لئے یہ مطالبہ درست نہیں ہے؟ جواب یہ ہے کہ جو کچھ اس کو دیا جا رہا ہے اس کو لینے سے اسے انکار کا حق نہیں ہے اسے اتنا ہی لینا ہوگا، اور نتیجہ الفتاویٰ میں ہے: وہ قبضہ جو قرض کے طور پر ہوا ہے اس کا ضمان اسی کے مثل سے دیا جائے گا۔ اور اسی میں جامع الفصولین سے نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ قرض میں مثل کا لوٹانا واجب ہے۔

اب رہی بات یہ کہ قرض میں جو چیز دی گئی ہے وہ مثلی ہے تو اس کا مثل ہونا کس اعتبار سے ہوگا آیا کیفیت اور کمیت کے اعتبار سے یا کیل و وزن کے اعتبار سے، یا پھر قیمت کے اعتبار سے، ظاہر ہے کہ پچھلی توضیحات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ مثل جس کو ردالمثل کہا جا رہا ہے یہ مقدار و کیفیت اور کمیت کے اعتبار سے ہے نہ کہ قیمت و مالیت کے اعتبار سے۔

چنانچہ بحوث فی قضا یا فقہیہ میں ہے:

”والذی یتحقق من النظر فی دلائل القرآن والسنة ومشاهدة معاملات الناس إن المثلیة المطلوبة فی القرض هی المثلیة فی المقدار والکمیة دون المثلیة فی القيمة والمالۃ“ (بحوث فی قضا یا فقہیہ معاصرہ ۱۷۴، دارالعلوم کراچی)۔  
(قرآن و حدیث کے دلائل اور لوگوں کے معاملات پر غور و فکر اور نظر کر لینے کے بعد جو چیز متحقق ہوتی ہے وہ یہی ہے کہ قرض میں جو مطلوب مثل ہے وہ مثل مقدار و کمیت ہے نہ کہ مثل قیمت و مالیت)۔

مذکورہ عبارات دلالت کرتی ہیں کہ دیون جب کہ مثلی ہوں تو بہر صورت مثل ہی کی واپسی ہوگی کمی زیادتی کی گنجائش ہرگز ہرگز نہیں ہو سکتی۔

البتہ صورت مسؤلہ میں عاقدین (خواہ وہ مہر سے متعلق ہو یا ادھار فروختگی سے متعلق یا ان کا تعلق قرض سے ہو) باہم یہ طے نہ کریں کہ واجب الاداء نوٹوں کی مالیت سونے یا چاندی

(متعینہ) میں ادا کی جائے گی، بلکہ اتنے نوٹوں کے بقدر سونا یا چاندی پر عقد کیا جائے۔ مثلاً ایک آدمی ایک لاکھ روپیہ دس سال کی مدت کے لئے قرض چاہ رہا ہے تو اس کو ایک لاکھ روپیہ دے کر یہ نہ کہا جائے کہ آج کی تاریخ میں ایک لاکھ روپیہ کا دس تولہ سونا ہے اور ہم آپ کو گویا دس تولہ سونا دے رہے ہیں لہذا جب آپ واپس کریں گے تو ہم آپ سے دس تولہ سونا یا اس وقت جو دس تولہ سونا کی قیمت ہوگی وہ لیں گے؛ بلکہ براہ راست اس کو ایک لاکھ روپیہ کا جو بھی ہو رہا ہو سونا یا چاندی دے دی جائے اور کہہ دیا جائے کہ آپ کو قرض میں یہ سونا یا چاندی دی جا رہی ہے لہذا واپسی میں بھی آپ یہی مقدار سونا یا چاندی یا اس وقت جو اس متعینہ مقدار سونا یا چاندی کی قیمت ہو اس کو ادا کریں گے۔

اسی طرح مہر اور ادھار فروختگی یا ادھار خریداری میں بھی یہ صورت اختیار کی جاسکتی ہے۔ رہی بات یہ کہ قرض اور ادھار فروختگی میں تو مال موجود ہے وہاں تو آسانی سے یہ صورت ہو سکتی ہے لیکن مہر میں تو بسا اوقات متعاقبین میں سے کسی کے پاس اتنی وسعت نہیں ہوتی بلکہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ روزانہ کے اخراجات آمدنی پر بھاری ہوتے ہیں اس صورت میں یہ صورت کس طرح ممکن ہوگی؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ایسی صورت میں ہم بلا واسطہ سونا یا چاندی ہی پر کیوں نہ عقد کریں کہ تمام بکھیڑوں سے نجات رہے۔ مذکورہ صورت تو صرف درمیان میں چونکہ نوٹوں کا واسطہ آگیا اس لئے ہے، ورنہ حق بات تو یہ ہے کہ جس صورت میں بھی بلا واسطہ چاندی یا سونے پر عقد کیا جائے وہاں ان تمام نقطوں اور بحثوں کی ضرورت ہی نہیں ہے، معاملہ بالکل صاف اور سٹھرا ہے، قرض کی بابت ایک شخص نے کہا بھائی اتنی چاندی قرض دیدے، اس نے کہیں سے بھی لا کر دے دی، بلا تامل اس کی ادائیگی اسی مقدار چاندی سے ہوگی خواہ کبھی بھی ہو یا اتنی مقدار چاندی کی اس وقت جو قیمت ہوگی وہ ادا کی جائے گی۔

اسی طرح کسی نے کہا کہ میں اپنا یہ سامان اتنی مقدار چاندی یا اتنی مقدار سونے میں

فروخت کرتا ہوں مشتری نے کہا میں نے آپ کا یہ سامان اتنی مقدار چاندی یا اتنی مقدار سونے میں خریدا، معاملہ ہو گیا؛ خواہ نقد ہو یا ادھار جب بھی ادا کرے گا اتنی ہی مقدار چاندی یا سونا یا ان کی اس وقت یعنی بوقت ادا قیمت ادا کرنی ہوگی۔

ان مذکورہ صورتوں میں خواہ قرض ہو یا مہر یا ادھار یا کوئی اور چیز چاہے جب دی جائے کسی نوع کا نہ فساد ہو گا نہ کوئی نزاع اور نہ کسی کے دل میں رنج و شکوہ، اور شرعی نقطہ نظر سے اگر دیکھا جائے تو ہر کسی کے یہاں بلا خلاف یہ صورتیں جائز ہیں کسی کا کوئی اختلاف نہیں۔

لہذا قرض میں دی جانے والی رقم اور اسی طرح مہر میں دی جانے والی رقم اور ادھار فروخت کئے جانے والے سامان کی قیمت اگر بلا واسطہ سونا یا چاندی ہی بنا لیا جائے اور اسی پر عقد تمام ہو تو کسی کو بھی کسی نوع کا کوئی اختلاف نہ ہوگا۔ اور باتفاق جملہ ائمہ یہ صورت جائز ہوگی کہ اس کا عوض سونا یا چاندی یا ان کی قیمتیں ادا کی جائیں۔

بصورت دیگر اور سوال نامہ میں درج صورت مسئلہ میں اگر نوٹوں کو بلا عقد ثانی صرف سونا یا چاندی مان لیا جائے اور پھر اسی طے کرنے کے تحت بوقت ادائیگی سونا یا چاندی یا ان کی ادائیگی قیمتوں کے مطابق ہو تو یہ نرا سود ہوگا اور عوام الناس کے درمیان آندھی اور طوفان کی طرح سو دور با پھیل جائے گا، جس کا انسداد مشکل ہی نہیں ناممکن ثابت ہوگا۔

لہذا معاملہ کو صحت کی طرف لانے کے لئے ضروری ہوگا کہ عقد ثانی اس طرح کیا جائے کہ ان نوٹوں کو حقیقہ سونا یا چاندی میں تبدیل کر دیا جائے اور پھر ان پر دوبارہ، عقد ثانی کیا جائے، اور اس طرح مستقرض، شوہر اور مشتری کے ذمہ بجائے نوٹ کے سونا یا چاندی، لازم آئے پھر سونا یا چاندی یا ان کی مروجہ قیمتیں ادا کرنے میں کسی نوع کی کوئی قباحت باقی نہ رہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

## کرنسی کی شرعی حیثیت

مولانا نعیم اختر قاسمی ☆

یہ بات تو روز روشن کی طرح واضح ہے کہ کرنسی کی قوت خرید امتداد زمانہ کے ساتھ ہمارے جیسے ملک میں متاثر ہوتی رہتی ہے۔ خواہ ایسا ہونا افراط زر کے نتیجہ میں ہو جسے ہم روپیہ کی قدر میں کمی ہونے سے تعبیر کریں۔ یا بازار میں طلب و رسد کے توازن میں فرق پیدا ہونے کی وجہ سے ہو جسے ہم گرانی اور اشیاء کی قیمتوں میں اضافہ کا نام دیں۔ بات ایک ہے یعنی کرنسی کی قوت خرید میں کمی واقع ہونا۔

البتہ یہ بات غور طلب ہے کہ ثمن کی قوت خرید میں کمی واقع ہونا یہ کوئی نوپیش آمدہ مسئلہ ہے یا زمانہ قدیم میں بھی اس کی مثالیں ملتی ہیں؟ تاریخ بتاتی ہے کہ اشیاء کی قیمتوں میں اتار چڑھاؤ ہر دور میں ہوتا رہا ہے اور ایسا ہونا فطری ہے، بازار کبھی ایک حالت پر رہ ہی نہیں سکتا؛ کیوں کہ بازار دراصل طلب اور رسد کے مجموعہ ہی کا نام ہے جب طلب اور رسد کے درمیان توازن بگڑے گا تو اس کا اثر اشیاء کی قیمتوں پر یا بلقضا دیگر ثمن کی قوت خرید پر پڑے گا، اسی وجہ سے تو حدیث میں تلتقی جلب (بخاری ۲۸۹۱ - کتاب البیوع، نسائی ۱۸۹۲)، بیع الحاضر للبادی (بخاری ۱۲۸۹ - کتاب البیوع)، اور ذخیرہ اندوزی (لا تحکر الا خاطئ: ابوداؤد ۳۸۸۲)، وغیرہ سے منع کیا گیا ہے؛ کیوں کہ اس کے نتیجہ میں اشیاء کی قیمتوں میں گرانی آتی ہے جس میں خلق اللہ کو مشقت اور

پریشانی ہوتی ہے۔

لیکن بایں ہمہ قرض کے معاملہ میں اسلامی نقطہ نظر سے مساوات اور برابری کو ضروری قرار دیا گیا ہے، یعنی جو چیز جس نوعیت کی جتنی مقدار میں قرض لی گئی ہو اتنی ہی مقدار میں اس کا مثل ادا کرنا ضروری ہے، کمی بیشی سود ہے اور ادائیگی کے وقت سامان کی قیمتوں میں اتار چڑھاؤ اور ٹمن کی قوت خرید میں کمی بیشی کو شرعاً و عرفاً نظر انداز کیا گیا ہے۔ کرنسی بھی چوں کہ ایک مثلی چیز ہے جس میں قرض جاری ہوتا ہے اس لئے اس کے اندر بھی اگر قرض ادا کیا جائے تو اس کے برابر نوٹوں کا ادا کرنا ضروری ہے۔ اس کی قوت خرید کے متاثر ہونے کا اعتبار نہیں کیا جائے گا۔

البتہ ایک اہم مسئلہ یہ پیش آتا ہے کہ پہلے دور میں ٹمن کی قوت خرید میں کمی واقع ہونے کا سبب عموماً بازار میں طلب و رسد کے توازن کا متاثر ہونا تھا جب کہ موجودہ دور میں چونکہ مارکیٹ میں ٹمن کے طور پر کاغذی نوٹوں کا چلن ہے، اس کی قوت خرید کے گرنے کا ایک بڑا اور اہم سبب افراط زر بھی ہے۔ یعنی نوٹوں کا زیادہ ہو جانا۔ بعض مرتبہ کسی ترقیاتی منصوبہ کی تکمیل کے لئے سرکاری خزانہ اس کی اجازت نہیں دیتا تو حکومت نوٹوں کی ایک بڑی مقدار چھاپ کر اپنے منصوبہ کو عملی جامہ پہناتی ہے۔ یہی افراط زر ہے۔ اس کا اثر مارکیٹ پر یہ پڑتا ہے کہ نوٹوں کی قوت خرید گر جاتی ہے اور اشیاء کی قیمتیں زیادہ ہوتی معلوم پڑتی ہیں۔ ایسا اس لئے ہوتا ہے؛ کیوں کہ یہ نوٹ دراصل قومی پیداوار کے ایک حصہ کی نمائندگی کرتے ہیں، لہذا جس قدر نوٹ زیادہ ہوتے جائیں گے قومی پیداوار کے حصوں میں اضافہ ہوتا جائے گا اور جو چیز جتنے زیادہ حصوں میں منقسم ہوگی اس کا حجم اتنا ہی چھوٹا ہوگا۔ نتیجتاً ایک کلوگرام کوئی سامان مثلاً اگر پہلے دس روپیہ کا ملتا تھا تو افراط زر کے بعد اب ایک کلوگرام ملنے کے بجائے اس سے کم ملے گا۔ ایک کلوگرام حاصل کرنے کے لئے دس روپے سے زیادہ ادا کرنا پڑیں گے۔ معلوم ہوا کہ افراط زر کے نتیجے میں کرنسی کی قوت خرید بڑی حد تک متاثر ہوتی ہے بلکہ اس وجہ سے کرنسی کی قوت خرید میں

گراوٹ کی رفتار کچھ زیادہ ہی ہوتی ہے۔ بیس پچیس سال پہلے ایک سو روپے میں جتنی مقدار میں سامان ملتا تھا آج اتنے کا آدھی مقدار تو کیا چوتھائی مقدار بھی حاصل ہونا مشکل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو مالک معاشی اعتبار سے مستحکم ہوتے ہیں اور جہاں افراط زر نہیں ہوتا وہاں کی کرنسی کی قوت خرید بڑی حد تک محفوظ رہتی ہے اور بین الاقوامی تجارتی معاملات میں اشیاء کی قیمتوں کا معیار اسی سے متعین کیا جاتا ہے، مثلاً امریکی ڈالر۔

اب اگر لوگ عام معاملات اور قلیل المیعاد قرضوں میں روپیہ کی قوت خرید میں ہونے والی کمی زیادتی کو گوارا کر لیتے ہیں تو ضروری نہیں کہ طویل المیعاد قرضوں اور مؤخر مطالبات میں بھی اس بڑے نقصان کو گوارا کر لیں کیوں کہ اس میں قرض خواہ کا ایک ایسا بدمذہب نقصان ہے جس سے صرف نظر کرنا اولاً تو اسلام کے تقاضہ عدل کے خلاف، آیت قرآنی: ”ہل جزاء الإحسان إلا الإحسان“ کے مغائر، اور حدیث نبوی: ”لا ضرر ولا ضرار“ (موطما لک ص ۲۲۲-باب مالا يجوز من حق الکاتب) کے منافی ہے۔ دوسرے اس کی وجہ سے طویل المیعاد قرضوں کا سرنے سے دروازہ ہی بند ہو جائے گا جب کہ ترقیاتی سارے پروجیکٹ طویل المیعاد قرضوں ہی کی مرہون منت ہیں۔

چنانچہ قرض خواہ سے اسی ضرر کو دور کرنے کے لئے ماہرین معاشیات نے یہ تدبیر بتائی کہ طویل المیعاد قرضوں کو قیمتوں کے اشاریہ سے وابستہ کر دیا جائے۔ مگر جب شرعی نقطہ نظر سے ہم اس کا جائزہ لیتے ہیں تو یہ صورت دو وجہوں سے درست نہیں معلوم ہوتی:

پہلی وجہ یہ ہے کہ قیمتوں کا اشاریہ معلوم کرنے کے لئے دقیق فنی اصولوں اور پیچیدہ حساب و کتاب کا سہارا لینا پڑتا ہے جسے ماہرین معاشیات ہی صحیح طور پر سمجھ سکتے ہیں، عام آدمی کی سمجھ سے یہ اصول بالاتر ہیں، اور شریعت کسی ایسی چیز کو مدار نہیں بناتی جسے صرف مخصوص لوگ ہی

سمجھ سکتے ہوں۔ آپ ﷺ کے ارشاد: ”إنا أمة أمية لا نكتب ولا نحسب“ (بخاری اور ۲۵۶ کتاب الصوم) کا یہی مفہوم ہے۔

دوسری اور اہم وجہ اس کے عدم جواز کی یہ ہے کہ اموال ربویہ میں جو برابری مقصود ہے اس کا قطعی اور یقینی ہونا ضروری ہے، اٹکل اور اندازہ سے برابری کرنا درست نہیں، چنانچہ آنحضرت ﷺ نے بیع مزابنہ سے منع فرمایا ہے (بخاری اور ۲۹۱ کتاب البیوع)، جس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ درخت پر لگی ہوئی کھجور کی مقدار کا اندازہ کر کے اسے ٹوٹی ہوئی کھجور کے بدلہ بیچا جائے۔ ”هو بيع التمر على النخيل بتمر مجذوذ مثل كيله خوصا“ (ہدایہ ۳/۳۱ باب البیع الفاسد)۔

اس کی حرمت کی وجہ یہی ہے کہ ٹوٹی ہوئی کھجور کی مقدار توازن کے ذریعہ معلوم کی جا سکتی ہے مگر درخت پر لگی ہوئی کھجور کا اندازہ کرنے کا طریقہ تخمین اور اٹکل کے علاوہ کچھ نہیں۔ ایسی صورت میں ربا کا شبہ بہر حال باقی رہتا ہے؛ اسی لئے آپ ﷺ نے بیع مزابنہ کو علی الاطلاق ناجائز قرار دیا۔ اب اس اصول کی روشنی میں جب ہم قیمتوں کے اشاریہ کا جائزہ لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ قیمتوں کا اشاریہ اپنے تمام مراحل میں ظن اور تخمین پر مبنی ہے، اگر کسی جگہ پر حساب بہت باریک بینی اور پوری احتیاط سے بھی کیا جائے تو بھی اس کے نتیجہ کو زیادہ سے زیادہ تقریبی کہہ سکتے یقینی اور واقعی نہیں کہہ سکتے؛ جب کہ مذکورہ حدیث کی رو سے واقعی مماثلت ضروری ہے۔ لہذا قرض وغیرہ کو قیمتوں کے اشاریہ سے وابستہ کرنے میں اگر ربا نہیں تو شبہ ربا ضرور ہے، جو ناجائز ہونے کے لئے کافی ہے۔

### مسئلہ کے حل کی صورت:

اس مسئلہ کے حل کی ایک آسان صورت تو وہی ہے جو سوالنامہ میں بیان کی گئی اور جس میں شرعاً کوئی قباحت بھی نظر نہیں آئی اور وہ اسلام کے قانون عدل کے مغائر بھی نہیں معلوم ہوتی



کہ فریقین باہمی رضامندی سے کسی بھی مثلی چیز کو معیار متعین کر کے معاملہ کر سکتے ہیں۔ مثلاً زید ایک لاکھ روپے قرض بکر کو یہ کہہ کر دے کہ آج جس قدر سونا ایک لاکھ روپے کا ملتا ہے ادائیگی کے وقت اسی قدر سونے کے بقدر نوٹ ادا کرنے ہوں گے۔ اگر قرض دار بکر اس کو قبول کرتا ہے تو اس کے جائز ہونے میں شبہ نہیں ہونا چاہئے۔ شامی کا ایک جزئیہ اسی مسئلہ سے متعلق ہے:

”وفی دعوی البزازیة من النوع الخامس عشر عن فوائد الإمام أبی حفص الكبير: استقرض منه دائق فلوس حال كونها عشر بدائق فصارت ستة بدائق أو رخص و صار عشرون بدائق يأخذ منه عدد ما أعطى ولا يزيد ولا ينقص۔ قلت هذا مبني على قول الإمام وهو قول أبی يوسف أولاً، وقد علمت أن المفتی به قوله ثانياً بوجوب قيمتها يوم القرض وهو دائق أي سدس درهم سواء صار الآن ستة فلوس بدائق أو عشرين بدائق“ (رد المحتار ۲/۲۴۳: کتاب البيوع)۔

(فتاویٰ بزازیہ میں ہے..... کہ اگر کسی سے ایک دائق (سدس درہم) کے بقدر فلوس قرض لیا جب کہ ایک دائق کے بدلہ دس فلوس ملتے تھے۔ پھر ایک دائق کے بدلہ چھ فلوس ملنے لگے۔ یا سستے ہو کر بیس فلوس ملنے لگے۔ تو بغیر کمی زیادتی کئے ہوئے جتنے فلوس دیئے تھے اتنے ہی واپس لے گا۔ میں کہتا ہوں کہ ایسا امام صاحب کے قول پر ہوگا جو کہ امام ابو یوسف کا پہلا قول ہے۔ اور تم جانتے ہو کہ مفتی بہ قول ان کا دوسرا قول یعنی قرض کے دن ان فلوس کی جو قیمت تھی یعنی دائق (سدس درہم) وہ واجب ہوگی؛ خواہ اب ایک دائق میں چھ فلوس ملیں یا ایک دائق میں بیس فلوس ملیں)۔

کیا یہ صورت باب ربا کو کھولے گی؟

یہ شبہ کرنا کہ یہ صورت باب ربا کو کھولنے کا ذریعہ بنے گی صحیح نہیں؛ کیوں کہ اس کا

مقصد فریقین کو ہونے والے نقصان سے بچانا ہے، حدیث میں بھی بعض مرتبہ اسی قسم کے ضرر سے بچاؤ کے لئے اس قسم کی صورت اختیار کرنے کی اجازت دی گئی۔ صحیحین کی روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ایک شخص کو خیبر کا عامل بنا کر بھیجا جب وہ واپس آیا تو رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں کچھ عمدہ قسم کی کھجور پیش کی، آپ ﷺ نے دریافت کیا کہ کیا خیبر کی تمام کھجوریں ایسی ہی ہوتی ہیں؟ انہوں نے جواب دیا کہ ہم اس عمدہ کھجور کے ایک صاع کو گھٹیا کھجور کے دو صاع کے بدلے میں اور دو صاع کو تین صاع کے بدلے میں تبدیل کر لیتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ایسا مت کرو بلکہ ہلکی کھجور کو پہلے دراہم کے عوض فروخت کر دو پھر ان دراہم سے عمدہ کھجور خرید لیا کرو۔

مذکورہ بالا حدیث میں غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اگر ردی کھجور کا تبادلہ عمدہ کھجور سے کرنا ہو تو چوں کہ اموال ربویہ میں مساوات ضروری ہے اور جید وردی کا اعتبار ساقط ہے تو برابری کی صورت میں ظاہر ہے کہ عمدہ کھجور دینے والا خسارہ میں رہے گا، اس کو خسارہ سے بچانے کی آپ ﷺ نے ایک تدبیر بتادی۔ تو اگر بتقاضائے عدل حدیث میں ایک تدبیر اختیار کرنے کی اجازت دی جا رہی ہے اور وہ باب ربا کو کھولنے کا سبب نہیں بن رہی ہے تو مؤخر مطالبات کے معاملات میں بھی مذکورہ تدبیر اختیار کرنا باب ربا کو کھولنے کا ذریعہ نہیں بننا چاہئے۔

دوسری صورت: اس مسئلہ کے حل کی ایک اور صورت جیسا کہ مولانا عبید اللہ اسعدی صاحب نے بیان کی ہے یہ ہے کہ قرض دینے والا کسی غلہ وغیرہ کی قیمت طے کر کے اس کے حق میں بیع سلم یعنی ادھار خرید کا معاملہ کر کے طے شدہ مقدار کی قیمت دے دے اور ادائیگی کے موقع پر خواہ اصل سامان لے لے یا اسے قبضہ میں لے کر قرض لینے والے کے ہاتھ ہی بیچ ڈالے، یا اصل کی جگہ نقد یا جو چاہے بقدر مالیت لے لے۔ مالکیہ کے نزدیک سلم میں قبضہ سے پہلے خریدے ہوئے سامان کے اندر تصرف درست ہے (مجلہ فقہ اسلامی: کرنسی کی شرعی حیثیت، ۸۶)۔

## خلاصہ جوابات:

لہذا ان معروضات کی روشنی میں کرنسی نوٹوں کی حیثیت کے تعلق سے دونوں سوالوں کے جواب حسب ذیل ہوں گے:

۱- مؤخر مطالبات وغیرہ کی ادائیگی کو قیمتوں کے اشاریہ سے وابستہ کرنا درست نہیں، کیوں کہ وہ ظن اور تخمین پر مبنی ہوتا ہے جب کہ اموال ربویہ میں تبادلہ میں قطعی مساوات ضروری ہے۔

۲- نوٹوں کی شکل میں معاملہ کرتے وقت طرفین اگر واجب الاداء نوٹ کی مالیت سونے چاندی وغیرہ میں طے کر لیں اور بوقت ادائیگی اسی قدر سونے یا چاندی کے مساوی نوٹوں کی ادائیگی عمل میں آئے تو یہ صورت درست ہے۔ واللہ اعلم۔

## نوٹوں کی حیثیت - شریعت کی نظر میں

مفتی عبدالرحیم قاسمی ☆

۱- دیون اور اجرتوں وغیرہ کو قیمتوں کے اشاریہ سے جوڑنا:

حضرت مفتی تقی عثمانی دامت فیوضہم تحریر فرماتے ہیں: یہ بات طے شدہ ہے کہ اب نوٹ سونے کی نمائندگی نہیں کرتے، یہ خود شمن عرفی ہیں اور فلوس کی طرح ہیں، شمن عرفی اور فلوس کی اپنی ذاتی قدر کا اعتبار ہوتا ہے، ان کو ادائیگی میں سونے سے وابستہ نہیں کیا جاسکتا، یہاں بعض لوگ حضرت امام ابو یوسف کے مذہب سے استدلال کرتے ہیں، ان کا مذہب یہ ہے کہ ادائیگی سے پہلے فلوس کی قیمت بڑھ گئی یا کم ہو گئی تو ادائیگی قیمت کے اعتبار سے ہوگی۔ لیکن یہ استدلال صحیح معلوم نہیں ہوتا، اس لئے کہ نوٹ اور فلوس میں فرق ہے، فلوس سونے چاندی سے مرتبط ہوتے ہیں، فلوس کی قیمت سونے چاندی کی بنیاد پر ہی طے ہوتی تھی لہذا ان فلوس کی حیثیت دنانیر اور درہم کی ریزگاری کی طرح تھی اور فلوس کو درہم و دنانیر کے ساتھ ایک خاص نسبت تھی، مثلاً یہ کہ ایک فلس چاندی کے درہم کا عشر (دسواں حصہ) ہے، بازار کی اصطلاح میں اس نسبت کے بدلنے کو ہی فلوس کی قیمت میں کمی بیشی سے تعبیر کرتے ہیں، ایسی صورت میں جب کہ فلوس سونے چاندی سے مرتبط ہوں امام ابو یوسف فلوس کی قیمت کی ادائیگی کو ضروری قرار دیتے ہیں، نوٹوں کی صورت حال اس سے بالکل مختلف ہے، یہ سونے چاندی سے مرتبط نہیں، یہ مستقل شمن

☆ ناظم جامعہ خیر العلوم، نور محل روڈ، بھوپال۔

اصطلاحی ہیں، ان کی اپنی ایک قدر ہے جس کا سونے چاندی سے کوئی تعلق نہیں، پھر اس زمانے کے فلوس اور نوٹوں میں ایک اور فرق بھی ہے وہ یہ کہ فلوس کی قیمت معلوم کرنے کے لئے ایک واضح معیار سونے چاندی کا موجود تھا جس کو سامنے رکھ کر فلوس کی قیمت تحقیقی طور پر معلوم کی جاسکتی تھی لیکن اب نوٹوں کی قدر کا تخمینہ اندازہ تو لگایا جاسکتا ہے قدر کا حقیقی علم نہیں ہو سکتا (اسلام اور جدید معیشت، ص ۱۱۱)۔

اداائیگیوں کو قیمتوں کے اشاریہ سے وابستہ کرنے کا نظریہ پیش کیا جاتا ہے، اس نظریہ کی دلیل یوں دی جاتی ہے کہ نوٹ بذات خود کچھ نہیں، یہ سلتہ البضائع یعنی کچھ اشیاء کی ٹوکری کی قوت خرید کی نمائندگی کرتے ہیں لہذا جب کسی نے دوسرے کو کچھ نوٹ قرض دئے تو گویا اس نے اس کو سلتہ البضائع دی ہے جس کا طریقہ یہ ہے کہ اداائیگی کو قیمتوں کے اشاریے سے وابستہ کیا جائے یعنی اداائیگی کے وقت نوٹوں کی اتنی مقدار زیادہ ادا کی جائے جو افراط زر کی شرح کے مساوی ہو مثلاً سو روپے قرض دئے تھے اور اداائیگی کے وقت افراط زر میں دس فیصد اضافہ ہو تو اب ایک سو دس روپے ادا کئے جائیں۔

(یہ اشاریہ کے نظریہ کا خلاصہ ہے)، قیمتوں کا اشاریہ ایک تخمینہ چیز ہے تحقیقی نہیں؛ اس لئے کہ اس میں کون سی اشیاء لینی ہے اس کا فیصلہ تخمینہ ہے پھر ہر شے کو جو وزن دیا جاتا ہے وہ بھی تخمینہ، ہر شے کی جو قیمت لی جاتی ہے وہ بھی تخمینہ ہے (اسلام اور جدید معیشت، ص ۱۰۹)۔

فقہی لحاظ سے یہ نقطہ نظر بوجہ غلط ہے:

پہلی وجہ تو یہ کہ نوٹ کی پشت پر کچھ مخصوص اور متعین اشیاء ہوتیں تو یہ کہا جاسکتا تھا کہ نوٹ دراصل سلتہ البضائع کی نمائندگی کرتا ہے لیکن سلتہ البضائع کوئی متعین چیز نہیں بلکہ اس سے حاصل ہونے والا فائدہ ہے، چنانچہ کسی کو نوٹ دینے کا مطلب سلتہ البضائع دینا نہیں بلکہ ایسا آلہ تبادلہ دینا ہے جس سے سلتہ البضائع خریدی جاسکتی ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ اس نظریہ کا حاصل یہ ہے کہ ادائیگی میں مثلیت باعتبار قیمت حقیقیہ معتبر ہونی چاہئے صرف قیمت اسمیہ میں مثلیت کا اعتبار درست نہیں شرعی نقطہ نظر سے جائز لیا جائے تو بات اس کے برعکس ہے، شرعاً قرض کی ادائیگی میں مقدار میں مثلیت کا اعتبار ہے حقیقی قیمت میں مثلیت کا اعتبار نہیں، مثلاً کسی نے گندم قرض لی، جب واپسی کا وقت آیا تو وہ گندم کی اتنی مقدار ہی واپس کرے گا خواہ قیمت کم ہو یا زیادہ اس بات پر کہ اعتبار مقدار کا ہوتا ہے حقیقی قیمت کا نہیں۔ ایک کافی واضح دلیل حضرت ابن عمرؓ کی حدیث ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ یہ صحابی منقح میں اونٹ بیچا کرتے تھے، کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ بیع دراہم پر ہوتی تھی اور ادائیگی دنانیر میں ہوتی تھی اور کبھی بیع دنانیر میں ہوتی اور ادائیگی دراہم میں ہوتی، اس کے بارے میں آن حضرت ﷺ سے سوال کیا گیا تو آپ نے اس شرط کے ساتھ اجازت دی کہ ادائیگی کے دن کی قیمت کے مطابق ہو، اس سے معلوم ہوا کہ ذمے میں تو اسی چیز کی مقدار واجب ہوتی ہے جس پر بیع ہوئی تھی پھر ادا کے وقت اس دن کی قیمت کے لحاظ سے تبادلہ ہو سکتا ہے، معلوم ہوا کہ دیون میں جو چیز واجب ہوتی ہے وہ دیون کی مقدار ہے نہ کہ قیمت، اگر قیمت واجب ہوتی تو وجوب کے دن کی قیمت کے لحاظ سے تبادلہ ہوتا۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ اموال ربویہ میں مجازتہ کو جائز نہیں قرار دیا اور ادائیگی کو قیمتوں کے اشاریہ کے ساتھ وابستہ کرنے میں مجازتہ لازم آتی ہے؛ اس لئے کہ یہ بات پہلے واضح ہو چکی ہے کہ قیمتوں کا اشاریہ تخمینہ ہوتا ہے، افراط زر کی صورت میں جیسے ادائیگی کو ضروری سمجھا جاتا ہے تو تفریط زر کی صورت میں ادائیگی میں کمی بھی ہونی چاہئے حالاں کہ اس کا کوئی بھی قائل نہیں۔ البتہ جہاں کسی کرنسی کی قیمت اس حد تک گر جائے کہ کساد میں داخل ہو جائے تو اس کا حکم مختلف ہو سکتا ہے (اسلام اور جدید معیشت، ص ۱۱۲-۱۱۳)۔

فتاویٰ عالمگیری میں ہے: "قال مشائخنا لم یفتوا بجواز ذلک (التفاضل)

فی العدالی والخطارفة لأنها أعز الأموال فی دیارنا فلو أبيع التفاضل فیہ یفتح باب الربوا“ (فتاویٰ عالمگیری ۱۰۶/۳) (ہمارے مشائخ نے عدالی اور غطارفہ سکوں میں زیادتی کے ساتھ لین دین کے جواز کا فتویٰ نہیں دیا؛ کیوں کہ وہ ہمارے ملک میں عزیز ترین مال ہیں، اگر اس میں زیادتی کے ساتھ لین دین کو جائز قرار دیا جائے تو سود کا دروازہ کھل جائے گا۔

سود کا دروازہ کھلنے کے اندیشے کی وجہ سے اس معاملہ کو ناجائز کہنا ضروری ہے۔ اور حضور ﷺ نے حساب و شمار کی باریکیوں سے بچا کر چاند کے دیکھنے اور نہ دیکھنے پر تاریخ کے شروع ہونے کی بنیاد رکھی اور اس کی وجہ یہ بتلائی کہ ہم امت امیہ ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ حساب اور کتاب کی باریکیوں میں عوام کو الجھانا شرعی نقطہ نظر سے درست نہیں؛ لہذا ان کے لئے معاملات کے آسان طریقے بتلائے گئے ہیں۔

۲- مہر یا ادھار فروختگی کی سونے چاندی کی قیمت کے مساوی نوٹوں کے ذریعہ ادائیگی:

سونا اور چاندی کیوں کہ ثمن خلقی اور ثمن حقیقی ہیں لہذا قرض دیتے وقت یا ادھار فروختگی کے وقت یا مہر مقرر کرتے وقت سونا یا چاندی کی خاص مقدار مقرر کر دی جائے اور ادائیگی کے وقت اس مقدار کے سونا چاندی کی قیمت کے برابر روپے دے دئے جائیں تو یہ شرعاً جائز ہوگا جیسا کہ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نقیح میں اونٹ بیچتے تھے، کبھی ایسا ہوتا تھا کہ بیع دراہم پر ہوتی تھی اور ادائیگی دنانیر میں ہوتی تھی اور کبھی دنانیر میں بیع ہوتی تھی اور ادائیگی دراہم میں ہوتی تھی، اس کے بارے میں حضور ﷺ سے سوال کیا گیا تو آنحضرت ﷺ نے اس شرط کے ساتھ اجازت دی کہ ادا کے دن کی قیمت کے مطابق ہو (ابوداؤد شریف

اور اگر روپے مقرر کئے تو متعینہ مقدار اتنی ہی تعداد کے روپے ادا کئے جائیں، مبسوط

میں ہے:

”وإن اشترى فاكهة بدائق فلس والدائق عشرون فلسا فلم يرد الفلوس حتى غلت أو رخصت فعليه عشرون فلسا لأن بالغلاء والرخص لا ينعدم صفة الثمنية وصار هو عند العقد بتسمية الدوائق مسميا ما يوجد به من الفلوس وذلك عشرون ولو صرح بذلك القدر لم يتغير العدد بعد ذلك بغلاء السعر ورخصه فهذا مثله“ (مبسوط ۲۹/۱۲)۔

(اگر ایک دانق کے برابر پیسوں میں میوہ خریدا، ایک دانق بیس پیسوں کے برابر ہوتا ہے پھر پیسے نہیں دئے یہاں تک کہ پیسے مہنگے ہو گئے یا سستے ہو گئے تو اس پر بیس پیسے ہی دینے لازم ہوں گے؛ کیوں کہ مہنگا اور سستا ہونے سے شمہیت ختم نہیں ہوگی، اور دانق کو مقرر کرنے سے اس کے برابر پیسوں کی تعداد مقرر ہوگی اور وہ بیس پیسے ہیں، اگر اتنی مقدار پیسوں کی وضاحت کر دیتا تو پیسوں کے مہنگے اور سستے ہونے سے وہ تعداد نہیں بدلتی، اسی طرح یہ مسئلہ ہے)۔

”وإن استقرض دانق فلوس أو نصف درهم فلوس فرخصت أو غلت لم يكن عليه إلا مثل عدد الذي أخذ“ (مبسوط ۳۰/۱۳) (اگر ایک دانق کے برابر پیسے قرض لیے یا آدھا درہم کے برابر پیسے قرض لیے پھر پیسے سستے ہو گئے یا مہنگے ہو گئے تو جتنی مقدار میں پیسے لیے تھے تو اتنی ہی تعداد میں واپس کرنا اس پر لازم ہوگا)۔

ہدایہ میں ہے: ”قال مشائخنا لم يفتوا بجواز ذلك (التفاضل) في العدالي والخطارفة لأنها أعز الأموال في ديارنا فلو أبيع التفاضل فيه يفتح باب الربو ثم إن كانت تروج بالوزن فالتبايع والاستقراض فيها بالوزن وإن كانت تروج بالعد فبالعد“ (ہدایہ ۱۰۹/۳)۔



(ہمارے مشائخ نے عدالی اور عطارفہ سکوں میں زیادتی کے ساتھ لین دین کے جواز کا فتاویٰ نہیں دیا کیوں کہ وہ ہمارے ملک میں عزیز ترین مال ہیں اگر اس میں زیادتی کے ساتھ لین دین کو جائز قرار دیا جائے تو سود کا دروازہ کھل جائے گا۔ پھر یہ سکے اگر وزن سے رائج ہیں تو خرید و فروخت اور قرض کا لین دین وزن سے ہوگا اور گن کر ان کے لین دین کا رواج ہو تو شمار کر کے اور گن کر ہی ان سکوں سے معاملہ کیا جائے گا۔)

## کرنسی نوٹوں کے ذریعہ ادھار معاملات

مولانا ڈاکٹر سید اسرار الحق سبیلی ☆

### ۱۔ پچھلے بقایہ جات کی وصولی:

یہ صحیح ہے کہ یورپی ممالک کے مقابلہ ایشیائی ممالک کی کرنسیوں میں انضباط نہیں ہے، اور گاہے گاہے ان کی قدر میں کمی اور افراط زر ہوتا رہتا ہے، کم از کم ہر تین اور چھ ماہ میں اشیاء کی قیمتوں میں اضافہ اور نوٹوں کی قدر میں کمی واقع ہوتی رہتی ہے، اس لئے حکومت اپنے ملازمین کے لئے ہر چھ ماہ میں گرانی بھتہ جاری کرتی ہے اور بعض محکمہ میں ہر تین ماہ میں گرانی الاؤنس (DA) جاری کیا جاتا ہے، اسی طرح ایک سال میں اشیاء کی قیمتوں اور نوٹوں کی قدر میں نمایاں فرق نظر آتا ہے۔

لیکن پچھلے بقایہ جات کی وصولی کے لئے سرکاری اور عوامی سطح پر عملاً مقررہ رقم ہی کا مطالبہ کیا جاتا ہے، مثلاً کسی ملازم نے سرکار سے غلطی سے یا کسی اور وجہ سے گذشتہ پانچ سال تک ہر ماہ اپنی حقیقی تنخواہ سے ایک سو روپے زیادہ حاصل کئے تو اس کو آئندہ پانچ سال تک ہر ماہ اپنی تنخواہ سے ایک سو روپے ہی وضع کرانے پڑتے ہیں۔ روپے کی قدر کی کمی کی بنا پر اس سے زیادہ رقم کا مطالبہ نہیں کیا جاتا ہے۔ اسی طرح عوامی سطح پر کسی نے ایک لاکھ روپے قرض لئے یا ایک لاکھ روپے کا ادھار سامان خریدا، تو دائن ایک یا چند سال بعد ایک لاکھ روپے کی وصولی کو ہی کافی سمجھتا

☆ لکچرر گورنمنٹ جونیور کالج مظہیر آباد، اے، پی۔

ہے، اور ایک لاکھ کی قدر میں ہونے والی کمی کو برداشت کرتا ہے، کیوں کہ قرض یا ادھار دیتے وقت نوٹ کی قدر اور موجودہ قدر کا حساب لگانا ایک پیچیدہ عمل ہے، اور اس زیادہ رقم کی ادائیگی کا پہلے سے مقروض یا مدیون سے معاہدہ نہیں ہوا ہے اور وہ اس زائد رقم کی ادائیگی کے لئے تیار نہیں ہو سکتا، لہذا قرض یا ادھار دینے والا جس طرح چند سال اپنی رقم کے نفع سے محروم رہا، اسی طرح اس رقم کی قدر میں ہونے والی کمی کو بھی برداشت کرتا ہے (البتہ ایسے موقع پر بینک پچھلے سالوں کا حساب کر کے سود مقرر کرتا ہے)۔

اس مسئلہ میں امام ابوحنیفہؒ کے قول پر عمل کیا جاسکتا ہے، علامہ برہان الدین مرغینانیؒ بیان فرماتے ہیں:

”ولو استقرض فلوسا نافقة، فكسدت، عند أبي حنيفة يجب مثلها  
لأنه إعارة وموجبه رد العين ومعنى الثمنية فضل فيه، إذ القرض لا يختص به“  
(الهدية: ۳/۱۱۰ ط: المكتبة لأشرفية ديوبند)۔

(اگر راج چلر پیسے قرض لئے گئے، پھر ان کا رواج ختم ہو گیا، تو امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک ان کی مثل واجب ہوگی، کیوں کہ یہ اعارہ ہے، اور اس میں بعینہ اس چیز کو لوٹانا واجب ہوتا ہے، اور ثمنیت کی صفت اس میں زائد ہے، کیوں کہ قرض اس کے ساتھ مخصوص نہیں)۔

علامہ کاسائی نے امام ابوحنیفہؒ کے ساتھ امام ابو یوسفؒ کا بھی یہی قول ذکر کیا ہے:

”ولو اسقرض فلوسا نافقة وقبضها، فكسدت فعليه رد مثل ما قبض  
من الفلوس عددا في قول أبي حنيفة وأبي يوسف وفي قول محمد قيمتها“  
(بدائع الصنائع ۳/۴۹۶)۔

(اور اگر کسی نے راج چلر پیسے قرض لئے اور اس پر قبضہ بھی کر لیا، پھر اس کا چلن ختم ہو گیا، تو امام ابوحنیفہؒ و ابو یوسفؒ کے قول کے مطابق اتنی ہی تعداد میں قبضہ کردہ چلر پیسوں کی مثل

لوٹانا ضروری ہوگا، اور امام محمدؒ کے قول کے مطابق ان کی قیمت لوٹانا ضروری ہوگا۔  
آگے علامہ کاسائی نے جو بات لکھی ہے اس سے کرنسی نوٹ کے مسئلہ پر صحیح روشنی  
ملتی ہے:

”ولو لم تكسد ولكنها رخصت او غلت فعليه رد مثل ما قبض بلا  
خلاف، لما ذكرنا ان صفة الثمنية باقية“ (بدائع الصنائع ۳/۴۹۶)۔  
(اور اگر ان کا چلن ختم نہیں ہوا، لیکن وہ سستے یا مہنگے ہو گئے تو بلا اختلاف قبضہ کردہ  
پیسوں کی مثل کا لوٹانا ضروری ہوگا، جیسا کہ ہم نے بیان کیا کہ ثمنیت کی صفت باقی ہے)۔  
اور علامہ حاکمی نے لکھا ہے:

”استقرض من الفلوس الرائجة والعدالي، فكسدت، فعليه مثلها  
كاسدة، ولا يغرم قيمتها..... لما مر أنه مضمون بمثله، فلا عبرة بفلاته  
ورخصه“ (الدر المختار مع رد المحتار: ۷/۲۹۴ ط: دارالکتب دیوبند)۔

(کسی نے مروج پیسوں اور عدالی درہم (عدال بادشاہ کی طرف منسوب درہم جس  
میں کھوٹ ہوا کرتا تھا) قرض لئے، پھر ان کا رواج ختم ہو گیا، تو اس کے لئے ویسے ہی غیر مروج  
پیسوں کا لوٹانا واجب ہوگا، ان کی قیمتوں کا تاوان اس سے وصول نہیں کیا جائے گا..... جیسا کہ  
گزر چکا کہ وہ مثل کا ضامن ہوگا، چنانچہ اس کے مہنگا یا سستا ہونے کا اعتبار نہیں ہوگا)۔  
علامی شامی نے اس پر اضافہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

”وكذلك لو قال: أقرضني عشرة دراهم غلة بدینار، فأعطاه عشرة  
دراهم، فعليه مثلها، ولا ينظر إلى غلاء الدراهم ولا إلى رخصها“ (رد المحتار ۷/۲۹۴  
ط: دارالکتب دیوبند)۔

(اسی طرح اگر کسی نے کہا: ایک دینار کے بدلہ مجھے دس مہنگے درہم قرض دو، اس نے

دس دراہم دیئے، تو اس کے لئے عام دراہم ادا کرنا کافی ہوگا، دراہم کے مہنگے اور سستے ہونے کا خیال نہیں کیا جائے گا۔

اس مسئلہ میں صاحبین کے قول اس لئے اختیار نہیں کیا جاسکتا کہ فلوس رائجہ کا رواج ختم ہونے کی بنا پر ان کی ثمنیت باقی نہیں رہتی ہے، جب کہ مروجہ کرنسی نوٹوں میں چند سال گزرنے کے باوجود ان کی ثمنیت باقی رہتی ہے، البتہ ان کی قیمت میں کمی واقع ہوتی ہے، مگر صاحب بدائع نے عدد کا اعتبار کیا ہے، اور تمام فقہاء نے فلوس نافقہ کے مہنگا یا سستا ہونے کا اعتبار نہیں کیا ہے۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ افراط زر کی بنا پر زائد رقم وصول کرنا اس لئے بھی مناسب نہیں کہ افراط زر کی بنا پر بعض چیزیں مہنگی ہو جاتی ہیں تو بعض چیزیں سستی ہو جاتی ہیں۔

۲- سونے کی قیمت کو معیار بنا کر دین کا معاملہ:

البتہ یہ بات جائز ہو سکتی ہے کہ نوٹوں کی شکل میں قرض دیتے وقت یا مہر مقرر کرتے وقت یا سامان ادھار فروخت کرتے وقت طرفین واجب الاداء نوٹ کی مالیت سونے یا چاندی میں طے کر لیں اور بہ وقت ادائیگی اسی قدر سونے یا چاندی کی قیمت کے مساوی نوٹوں کی ادائیگی کریں؛ کیوں کہ باہمی رضامندی کی بنا پر اس میں نزاع کا اندیشہ نہیں ہے اور سونے یا چاندی کی قیمت ادا کرنے کی وجہ سے ربا کا شبہ بھی ختم ہو جاتا ہے، کیوں کہ مقروض نے قرض لیتے وقت جس قدر سونے کی مالیت کے نوٹوں سے استفادہ کیا ہے، ادائیگی کے وقت اتنی ہی مقدار سونے کی مالیت کا نوٹ واپس کر رہا ہے، یہ عین انصاف کے مطابق ہے، اور اس میں کسی کا ضرر نہیں ہے۔ اس بارے میں مندرجہ ذیل آیات و احادیث سے رہنمائی حاصل کی جاسکتی ہے:

(۱) "وإن تبتم فلکم رؤوس أموالکم، لا تظلمون ولا تظلمون"

(البقرہ: ۲۷۹)۔

(اور اگر تم (سو سے) توبہ کر لو تو تم کو تمہارے اصل مال مل جائیں گے، نہ تم ظلم کرو اور نہ تم پر ظلم کیا جائے)۔

یہاں سو سے بچنے کی تاکید کی گئی ہے، لیکن پورا پورا اصل مال لینے کا حق دیا گیا ہے اور اس میں کمی زیادتی سے روکا گیا ہے۔

(۲) ”یا ایہا الدین امنوا اوفوا بالعقود“ (المائدہ: ۱)۔

(اے ایمان والو! عہدوں کو پورا کرو)۔

(۳) ”لا ضرر ولا ضرار“ (سنن ابن ماجہ)۔

(نہ ابتداءً نقصان پہنچایا جائے، نہ بدلہ میں نقصان پہنچایا جائے)۔

(۴) ”المسلون علی شروطہم“ (بخاری)۔

(مسلمان اپنی شرطوں پر قائم رہتے ہیں)۔

اس مسئلہ میں صاحبین کے قول کو اختیار کیا جاسکتا ہے، علامہ شامی لکھتے ہیں:

”وإذا استقرض عشرة أفلس، ثم كسدت لم يكن عليه إلا مثلها في

قول أبي حنيفة وقالوا: عليه قيمتها من الفضة، يستحسن ذلك“ (رد المحتار: ۷/۲۹۳)۔

(کسی نے دس فلوس قرض لئے، پھر ان کا رواج ختم ہو گیا، تو امام ابو حنیفہ کے قول کے

مطابق ویسے ہی فلوس کی ادائیگی اس پر لازم ہے، صاحبین کا قول یہ ہے کہ اس کے ذمہ اتنی ہی

قیمت کی چاندی کی ادائیگی لازم ہے، یہ بہتر بات ہے)۔

خلاصہ جواب:

!- دیون یعنی مؤخر مطالبوں میں متعینہ رقم ہی ادا کی جائے گی، کرنسی نوٹوں کی قدر میں

کمی ہونے کی وجہ سے زائد رقم کا مطالبہ کرنا درست نہیں ہوگا۔

۲- البتہ یہ بات جائز ہوگی کہ نوٹوں کی شکل میں قرض دیتے وقت یا مہر مقرر کرتے وقت یا ادھار فروخت کرتے وقت فریقین واجب الاداء نوٹ کی مالیت سونے یا چاندی میں طے کر لیں، اور یہ وقت ادائیگی اسی قدر سونے یا چاندی کی قیمت کے مساوی نوٹ ادا کریں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

## موجودہ کرنسی کی شرعی حیثیت

مولانا محمد نصر اللہ ندوی ☆

گذشتہ زمانوں میں سونے اور چاندی کے سکوں کا رواج تھا، اور بہت حد تک دونوں کی قیمتوں میں استحکام تھا، اس لئے طویل عرصہ تک ان کو کرنسی کی حیثیت حاصل رہی۔ پھر آہستہ آہستہ ان کی جگہ کاغذی نوٹوں نے لے لی۔ دنیا کے معاشی نظام میں بڑے پیمانے پر انقلابات اور تغیرات رونما ہونے کی وجہ سے یہ نوٹ ایک حالت اور کیفیت پر قائم نہیں رہتے ہیں، بلکہ بازار میں عام اشیاء کے دام بڑھنے اور کم ہونے کی وجہ سے اس کی قوت خرید میں فرق آجاتا ہے، جسے ہم موجودہ علم معاشیات کے الفاظ میں افراط زر اور تفریط زر سے تعبیر کر سکتے ہیں۔

یہاں پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ افراط زر اور تفریط زر کی تشریح کری جائے تاکہ آئندہ کی گفتگو کو آسانی سے سمجھا جاسکے۔

عصر حاضر کی اصطلاح میں افراط زر کا مطلب ہوتا ہے کہ کسی ملک کی کرنسی اس ملک کی اشیاء اور خدمات کے مقابلہ میں زیادہ ہو جائے، اس کی وجہ سے اشیاء اور خدمات کی قیمت بڑھ جاتی ہے اور ملک میں مہنگائی پیدا ہو جاتی ہے، کیوں کہ کسی بھی ملک کی کرنسی اشیاء اور خدمات کی طلب کی نمائندگی کرتی ہے اور ملک میں موجود اشیاء و خدمات رسد کی نمائندگی کرتے ہیں، اور جب رسد کے مقابلہ میں طلب زیادہ ہو جاتی ہے تو بہت زیادہ مہنگائی پیدا ہو جاتی ہے۔



اور تفریط زر کا مطلب ہوتا ہے کہ ملک کی کرنسی اشیاء اور خدمات کی مقابلہ میں کم ہو جائے، اس کی وجہ سے اشیاء اور خدمات کی قیمت کم ہو جاتی ہے اور زرانی پیدا ہو جاتی ہے۔ چنانچہ تفریط زر کے وقت ہم کرنسی کے ذریعہ اشیاء صرف کی بڑی مقدار خرید سکتے ہیں، لیکن افراط زر کے وقت اتنی مقدار میں اشیاء نہیں خرید سکتے جتنی مقدار میں تفریط زر کے وقت خریدی تھیں۔ بلکہ اس مقدار سے کم خرید سکیں گے، مثلاً تفریط زر کے وقت پانچ سو روپے میں چاول ۱۵ رکلو، نمک ۱۵ رکلو، کپڑا دس میٹر خرید سکتے ہیں لیکن افراط زر کے وقت ہم پانچ سو روپے میں مذکورہ بالا اشیاء صرف مندرجہ ذیل مقدار میں خرید سکتے ہیں:

چاول ۸ رکلو، نمک ۸ رکلو، کپڑا چھ میٹر۔

غور کرنے کی بات ہے کہ ان دونوں حالتوں میں پانچ سو روپے تو وہی رہے اس کی مقدار میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی لیکن دوسری صورت میں روپے کی قوت خرید پہلی کی بہ نسبت کمزور ہو گئی۔

اس کا حل ماہرین معاشیات نے نکالا کہ وہ کرنسی نوٹوں کی پیمائش قوت خرید سے کرنے لگے اور قوت خرید ہی کے ذریعہ اس کی حقیقی قیمت کا اندازہ لگانے لگے۔ اس فرق کو ماہرین معاشیات کرنسی کی قیمت فرق سے تعبیر کرتے ہیں۔ جیسا کہ ہم نے گذشتہ مثال میں دیکھا کہ افراط زر کے وقت روپے کی قوت خرید کم ہو گئی ہے کیوں کہ افراط زر کے وقت ہم تفریط زر کے مقابلہ میں تقریباً آدھی اشیاء ہی خرید سکتے ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا حقوق و واجبات کی ادائیگی میں افراط زر کے وقت کے پانچ سو روپے تفریط زر کے وقت کے پانچ سو روپے کے مساوی قرار دئے جائیں گے یا ڈھائی سو روپے کے برابر سمجھے جائیں گے؟

بعض ماہرین معاشیات کے نزدیک اس کا حل یہ ہے کہ کرنسی اور نوٹ کی قیمت متعین

کرنے کے لئے قیمتوں کے اشاریہ کو معیار بنایا جائے اور تمام حقوق و واجبات کی ادائیگی میں قیمتوں کے اشاریہ کے ساتھ کرنسی کی قیمت کے تعلق کو بنیاد بنایا جائے، مثلاً اگر ایک ہزار روپے کسی نے قرض لئے اور قرض کی واپسی کے وقت قیمتوں کے اشاریہ میں دس فیصد کی تناسب سے اضافہ ہو چکا ہے تو اب قرض دار بھی قرض میں دس فیصد کے تناسب سے اضافہ کر کے گیارہ سو روپے واپس کرے، کیا شرعی نقطہ نظر سے ایسا کرنا درست ہے؟

اس سوال کا جواب جاننے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے یہ طے کیا جائے کہ نوٹ مثلی ہے یا غیر مثلی؟

نوٹ مثلی ہے یا غیر مثلی؟

فقہاء نے مثلی کی تعریف مندرجہ ذیل الفاظ میں کی ہے:

۱۔ جس میں ایک ہی نوع کے مختلف اجزاء میں قیمت کے اعتبار سے تفاوت نہ ہو،

”ما لا یختلف أجزاء النوع الواحد منه بالقیمة“ (الاشباه والنظائر للسیوطی ۷۷۶-۵۷۶)۔

۲۔ وہ اشیاء جن کی مقدار ناپ تول کر معلوم کی جاتی ہو یا شمار کر کے معلوم کی جاتی ہو

لیکن اس کے مختلف افراد میں قابل لحاظ تفاوت نہ ہو، جیسے کیلی، وزنی اور وہ عددی اشیاء جن کے

افراد میں قابل لحاظ تفاوت نہ ہو۔ اسی طرح ہاتھ اور گز سے ناپی جانے والی اشیاء اور ایسی شمار کی

جانے والی جن کے افراد میں باہم کافی تفاوت ہو، مثلی نہیں ہوگی۔

مثلی اور قیسی کی تعریف میں فقہاء کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے، اگر ہے بھی تو تعبیر

و بیان کا اختلاف ہے، کسی شے کے مختلف افراد میں فرق نہ ہو یا اتنا کم فرق ہو جس کو عام طور پر نظر

انداز کر دیا جاتا ہے، وہ مثلی ہے اور جس کے افراد میں قابل لحاظ فرق ہو وہ قیسی ہے۔

کسی چیز کی مثلی یا قیسی ہونے کا دار و مدار بہت حد تک عرف پر بھی ہوتا ہے۔ مثلاً گز سے

ناپ کر فروخت کی جانے والی اشیاء کپڑے وغیرہ، فقہی تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ زمانہ

قدیم میں کپڑوں کے ایک ہی تھان کے مختلف حصوں میں خاصا فرق ہوتا تھا، مگر آج ایسا نہیں ہے۔ کپڑوں کی انواع اس طرح مشخص ہو گئی ہیں اور ایک ہی نوع کے کپڑے میں اتنا کم اور ناقابل لحاظ فرق ہے کہ ان کے مثلی ہونے میں کوئی شبہ باقی نہیں رہا۔

ان تفصیلات سے معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ نوٹ مثلی ہی ہیں، اگرچہ یہ فقہاء کی زبان میں کیلی اور وزنی نہیں لیکن عددی غیر متفاوت ہیں، اس لئے ایک ہی تعداد کی دو نوٹ ایک ہی مالیت رکھتے ہیں اور ان کی قدر میں کوئی فرق نہیں جیسا کہ فقہاء نے دراہم و دنانیر کی طرح فلوس کو بھی مثلی شمار کیا ہے۔

### مثلی اشیاء میں مقدار کا اعتبار:

جب یہ بات متعین ہو گئی کہ نوٹ کا تعلق مثلی اشیاء سے ہے تو اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا قرض کی ادائیگی کے وقت صرف اس کی مقدار ادا کرنا واجب ہے یا اس کی مالیت اور قیمت کو بھی ملحوظ رکھنا ضروری ہے؟

نصوص شرعیہ میں غور کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ قرض کی واپسی میں مقدار اور قیمت میں برابری مطلوب ہے، قیمت اور مالیت میں نہیں۔ اس کے دلائل مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ اگر ایک شخص دوسرے سے دس کلو چاول بطور قرض لے اور قرض لیتے وقت دس کلو چاول کی قیمت پچاس روپے تھی اور واپسی کے وقت دس کلو چاول کی قیمت تیس روپے ہو گئی تو اب وہ صرف دس کلو چاول واپس کرے گا زیادہ نہیں، باوجودیکہ دس کلو چاول کی قیمت پچاس روپے سے کم ہو کر تیس روپے ہو گئی ہے۔ اس پر تمام فقہاء کا اجماع ہے۔ یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ قرض میں جس مثلیت اور برابری کا اندازہ شریعت میں ضروری ہے، وہ مقدار اور قیمت میں برابری ہے، قیمت اور مالیت میں برابری معتبر نہیں۔

۲۔ قرضوں کی واپسی میں برابری کی شرط صرف سود سے بچنے کے لئے ہے، اس سے کسی کو اختلاف نہیں ہے، صحیح مسلم میں ہے:

”عن عبد المجید بن سہیل بن عبد الرحمن أنه سمع سعید بن المسیب يحدث أن أبا هريرة وأبا سعيد حدثاه أن رسول الله ﷺ بعث أبا بني عبد الأنصاري فاستعمله على خبير فقدم بتمر جنيب، فقال له رسول الله ﷺ: أكل تمر خبير هكذا، قال: لا، والله يا رسول الله! إنا لنشتري الصاع بالصاعين من الجمع فقال رسول الله ﷺ: لا تفعلوا ولكن مثلاً بمثل أو بيعوا هذا واشتروا بثمنه من هذا، وكذلك الميزان“ (بخاری، ۵۶۷/۷)۔

(حضرت ابو ہریرہ اور حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے بنی عدی کے ایک شخص کو خیبر کا عامل بنا کر بھیجا، وہ عامل جب واپس آیا تو حضور اقدس ﷺ کی خدمت میں جنیب کھجور (عمدہ قسم کی کھجور) پیش کیں۔ حضور اکرم ﷺ نے سوال کیا کہ کیا خیبر کی تمام کھجوریں ایسی ہوتی ہیں؟ انہوں نے جواب دیا: نہیں، ہم اس (عمدہ) کھجور کے ایک صاع کو (گھٹیا) کھجور کے دو صاع کے بدلہ میں تبدیل کر لیتے ہیں۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ایسا مت کرو؛ بلکہ برابری کے ساتھ اس کا تبادلہ کیا کرو۔ یا نہیں تو پہلے جمع کھجور (مختلف قسم کی ملی جلی کھجور) کو دراہم کے عوض فروخت کر دو، پھر ان دراہم سے جنیب کھجور خرید لیا کرو)۔

یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ اموال ربویہ میں جو مماثل اور برابری مطلوب ہے وہ مقدار میں مماثل ہے، قیمت میں یہ مماثل اور برابری مطلوب نہیں؛ اس لئے کہ جنیب جمع کھجور کے مقابلہ میں بہت اعلیٰ درجہ کی تھی۔ مگر حضور ﷺ نے کھجور کی ایک قسم کو دوسری قسم سے تبدیل ہونے کی صورت میں عمدہ اور گھٹیا ہونے کا بالکل اعتبار نہیں کیا بلکہ وزن میں برابری کو ضروری قرار دیا۔

۳- "عن عبادة بن الصامت قال: قال رسول الله ﷺ: الذهب بالذهب، والفضة بالفضة، والبر بالبر، والشعير بالشعير، والتمر بالتمر، والملح بالملح مثلاً بمثل، سواء بسواء يدا بيد، فإذا اختلفت هذه الأوصاف فبيعوا كيف شئتم إذا كان يدا بيد" (فتح الملبم ۵۵۶/۷)۔

(حضرت عباده بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ حضور اقدس ﷺ نے فرمایا: سونے کو سونے کے بدلہ میں، چاندی کو چاندی کے بدلہ میں، گیہوں کو گیہوں کے بدلہ میں، جو کو جو کے بدلہ میں، کھجور کو کھجور کے بدلہ میں اور نمک کو نمک کے بدلہ میں برابر برابر اور ہاتھوں ہاتھ نقد بیچو، ہاں اگر ان اشیاء کی بیچ میں جنس مختلف ہو جائے تو پھر جس طرح چاہو کی زیادتی کے ساتھ بیچو، بشرطیکہ نقد نقد ہو)۔

۴- "عن أبي هريرة قال: قال رسول الله ﷺ: الذهب بالذهب وزناً بوزن مثلاً بمثل والفضة بالفضة وزناً بوزن مثلاً بمثل، فمن زاد أو استزاد فهو ربا" (فتح الملبم ۵۵۷/۷)۔

(حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ حضور اقدس ﷺ نے فرمایا: سونا سونے کے بدلہ میں، چاندی چاندی کے بدلہ میں وزن کر کے برابر برابر بیچو، ان میں جو شخص اضافہ کرے یا اضافہ طلب کرے تو وہ اضافہ سود ہے)۔

### خلاصہ بحث:

مندرجہ بالا احادیث اس بات کو واضح کرتی ہیں کہ شریعت میں جو تماثل اور برابری معتبر ہے وہ مقدار میں برابر ہے۔ اموال ربویہ میں قیمت کے فرق کا بالکل اعتبار نہیں، یہ احکام اس صورت میں ہیں جب بیع نقد ہو رہی ہو، اور اگر معاملہ قرض کا ہو جس میں اصل سود جاری ہوتا

ہے اور جس میں ہر قسم کی کمی زیادتی بلکہ زیادتی کے شبہ سے بھی بچنا ضروری ہے، تو پھر اس میں قیمت کے تفاوت کا لحاظ کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

یہ بات طے شدہ ہے کہ قیمتوں کو اشیاء سے منسلک کرنے کا پورا حساب اندازہ اور تخمین پر مبنی ہے اور اگر کسی جگہ پر حساب بہت باریک بینی اور پوری احتیاط سے بھی کیا جائے تو اسے قطعی اور یقینی نہیں کہہ سکتے، جب کہ اوپر مذکورہ احادیث سے یہ واضح ہو چکا ہے کہ قرضوں کی ادائیگی میں انکل اور اندازہ کی شرط لگانا شرعاً جائز نہیں؛ لہذا قرضوں کی واپسی کو قیمتوں کے اشاریہ سے وابستہ کرنا جائز نہ ہوگا۔ واللہ اعلم۔

## موجودہ کرنسی کی شرعی حیثیت

مولانا عطاء اللہ قادری ☆

(۱)

تعارف

موجودہ کرنسی کاغذی نوٹ ہیں، جن کی اپنی ذاتی قدر و قیمت کچھ نہیں ہے۔ ان نوٹوں کی سونے چاندی کے ساتھ وابستگی ایک قصہ پارینہ بن چکی ہے، کیوں کہ دنیا کے تمام ممالک کے نوٹوں پر ادائیگی کا وعدہ ضرور لکھا ہوتا ہے لیکن عملی طور پر کسی بھی بینک میں سو کے نوٹ پر سونے کی ادائیگی نہیں کی جاتی، بلکہ قانوناً سونے کی ادائیگی بند کر دی گئی ہے۔ اس طرح نوٹ پر درج شدہ وعدہ صرف وعدہ ہے۔

عمومی رواج، عوام کا اعتماد، حکومتوں کی ضمانت اور قانون نے مل کر کاغذ کے اس پرزہ کو مالی قوت عطا کر دی ہے، اس کو ٹھن کا درجہ دے دیا، تمام اشیاء و خدمات کا معاوضہ بنا دیا، عالمی سطح پر ادائیگیوں کا ذریعہ ٹھہرایا گیا ہے۔ چنانچہ اگر کوئی شخص ان نوٹوں کو اشیاء و خدمات کے عوض لینے سے انکار کر دے تو وہ شخص عرف، قانون اور حکومت سب کی نظر میں مجرم متصور ہوگا۔

شرعی حیثیت:

کسی بھی سکہ کو ثمنیت کا درجہ دینے کے لئے شریعت نے جو شرطیں عائد کی ہیں وہ تمام

☆ صدر مدرس، مدرسہ امداد العلوم کوپانج، منو۔

شرطیں موجودہ کرنسی میں بدرجہ اتم پائی جا رہی ہیں۔ یہ نوٹ بذات خود موجودہ دور کا بہت اہم مال اور مطلوب ترین چیز ہیں، علامہ شامیؒ نے مال کی جو تعریف کی ہے وہ بھی یہاں صادق آ رہی ہے۔

المال: ما یمیل إلیہ الطبع ویمکن ادخارہ بوقت الحاجة والمالیة

تثبت بتمویل الناس كافة (شامی ۳/۳، دیوبند) (مال وہ ہے جس کی طرف طبیعتوں کا میلان فطری طور پر ہوتا ہے، اور وقت ضرورت کے لئے اسے ذخیرہ بنانا ممکن ہو، مالیت کا ثبوت عوام الناس کے مالیت تسلیم کر لینے سے ہوتا ہے)۔

لہذا موجودہ کرنسی شرعی اعتبار سے ”شمن عرفی“ یا ”شمن اصطلاحی“ کی حیثیت رکھتی

ہے۔ اس کرنسی پر وہ تمام احکامات مرتب ہوں گے جو سونے چاندی کے سکوں پر مرتب ہوتے ہیں۔ مثلاً ان نوٹوں پر زکوٰۃ واجب ہوگی اور ان نوٹوں سے زکوٰۃ کی ادائیگی صحیح ہوگی، وغیرہ وغیرہ۔

### نوٹوں کی قدر اور اشاریہ:

البتہ ان نوٹوں کے ساتھ عالمی حالات کے تناظر میں ایک اہم مسئلہ جڑا ہوا ہے اور وہ ہے ان کرنسی نوٹوں کی حقیقی قدر میں ”عدم استقلال“ یعنی افراط زر کی صورت میں ان کا غذی نوٹوں کی قدر اور قوت خرید گر جاتی ہے اور تفریط کی صورت میں ان کی قدر بڑھ جاتی ہے، قدروں اور قیمتوں کی کمی بیشی کو منضبط کرنے کے لئے ریاضی کا پیچیدہ اور بظاہر سائنٹفک طریقہ نکالا گیا جسے ”اشاریہ“ کہا جاتا ہے۔

### اشاریہ: ہیئت ترکیبی:

اشاریہ جسے پختہ اور مضبوط نظریہ سمجھا جاتا ہے یہ بہت غیر یقینی اور پھسپھسا ہے۔

اشاریہ کے تین بنیادی عناصر ترکیبی ہیں:

۱۔ اشیاء ضروریہ کی تعیین اور ان کی فہرست سازی۔



۲- ان اشیاء کی اہمیت کا تعین۔

۳- ان کی قیمتوں کا تعین۔

یہ تینوں عناصر افراد، زمانہ اور مکان کے اختلاف سے یقینی طور پر متاثر ہوتے ہیں، کیوں کہ کچھ اشیاء کچھ افراد کے لئے ضروری اور بڑی اہم ہوتی ہیں تو دوسرے اشخاص کے لئے قطعاً غیر ضروری اور بالکل بے کار ہوتی ہیں، اس طرح وقت اور مکان کے فرق سے اشیاء کی قیمتوں میں کھلا ہوا فرق روزمرہ کا مشاہدہ ہے، نتیجہ ظاہر ہے کہ اشاریہ کے عناصر ترکیبی مختلف فیہ غیر یقینی ہیں، تو ان سے برآمد ہونے والا نتیجہ بھی غیر یقینی اور تخمینہ ہی ہوگا، یقینی اور قطعی ہرگز نہیں ہوگا۔ ایسے اشاریہ کے ساتھ نوٹوں کی حقیقی قدر وابستہ کرنا غیر مناسب اور ادائیگیوں کو اس کے ساتھ وابستہ کرنا ناممکن ہے، یہی وجہ ہے عملی طور پر کہیں نافذ نہیں ہو سکا۔

پر فریب نظریہ:

کرنسی نوٹوں کے قدر میں عدم استحکام اور اس کو اشاریہ سے وابستہ کرنے کا نظریہ سرمایہ دارانہ ذہنیت کی تسکین کے لئے بنایا گیا ہے؛ کیوں کہ ”شمن“ خلقی ہو یا عرفی اس کی قدر اور قیمت متعین ہوتی ہے اس میں کمی بیشی کا سوال نہیں پیدا ہوتا۔ کرنسی کی قیمت میں بعض اوقات کمی اس طرح ہوتی ہے کہ خود حکومت اپنے سکے کی قیمت گرا دیتی ہے۔ لیکن اس کا براہ راست اثر بیرونی کرنسی کی شرح تبادلہ پر پڑتا ہے، اندرونی معاملات پر اس کا اثر نہیں ہوتا؛ بلکہ اس شمن کے مقابلہ میں جو اشیاء و خدمات حاصل کی جاتی ہیں ان کی قیمتوں میں کمی بیشی ہوتی ہے۔ وجوہات مختلف ہو سکتی ہیں، مثلاً:

الف- اشیاء کی کمی: جیسے قحط سالی، کم پیداوار جس کے سبب قیمت بڑھ جاتی ہے۔

ب- حکومتیں اپنے خزانے بھرنے اور وزراء و حکام کی تنخواہوں میں اضافہ کے لئے

تاجروں پر ٹیکس لا دیتی ہے اور تجارتی اشیاء کی قیمتیں بڑھا کر اسے وصول کر لیتے ہیں۔

ج۔ کمیاب اور نایاب اشیاء کی قیمتوں میں بالقصد اضافہ کر لیتے ہیں۔  
د۔ حکومتوں کا رویہ: حکومت کے اشارہ پر قیمتوں میں اضافہ اور کمی روزمرہ کا معمول اور

مشاہدہ ہے۔

مختصر یہ کہ کرنسی کی قدر مستحکم ہوتی ہے اور اشیاء کی قیمتوں میں کمی بیشی ہوتی ہے، حکومت اپنی ناکامی کو چھپانے کے لئے کرنسی کی قدر میں عدم استحکام اور اشاریہ کا بہانہ بنا لیتی ہے اور اس طرح رائے عامہ کو گمراہ کرتی ہے۔  
اشاریہ ایک نظریہ ہے جو عملی نفاذ سے محروم ہے۔

### ادائیگی اور اشاریہ: شرعی حیثیت:

اشاریہ اپنے تمام مراحل میں اندازہ و تخمین پر مبنی ہے، اگر کسی جگہ بہت باریک بینی اور پوری احتیاط سے بھی مرتب کیا جائے تو بھی اس کا نتیجہ تقریبی اور تخمینہ ہوتا ہے یقینی نہیں ہوتا۔ اس لئے دیون یعنی موخر مطالبوں کی ادائیگی کو اشاریہ سے وابستہ کرنا شرعی نقطہ نظر سے ہرگز جائز نہیں۔  
اس کی بہترین فقہی نظیر بیع مزابنہ کی حرمت ہے:

”ولا يجوز بيع المزابنة وهو بيع التمر على رؤوس النخل بخرصة  
تمراً إنما لا يجوز هذا البيع لنهيه عليه السلام عن المزابنة والمحاقله“ (الجوهرة  
البرہۃ ۱/۲۳۶) (بیع مزابنہ یعنی درخت پر لگی ہوئی کھجور کو توڑی گئی کھجوروں کے عوض اندازہ کر کے  
بیچنا جائز نہیں؛ کیوں کہ نبی علیہ السلام نے بیع مزابنہ اور بیع محاقلہ سے منع فرمایا ہے)۔

تمام فقہاء کا اتفاق ہے کہ قرض کی واپسی میں مقدار کی یقینی مشلیت اور یقینی برابری  
بنیادی شرط ہے، اندازہ و تخمین سے واپسی ہرگز جائز نہیں، اسی طرح تمام فقہاء کا اتفاق ہے کہ  
اموال ربویہ میں تبادلہ یقینی برابری کے ساتھ ہونا چاہئے، اندازہ و تخمین بہر حال ناجائز ہے۔

ظاہر ہے توڑی گئی کھجوروں کی مقدار وزن کر کے معلوم کی جاسکتی ہے جب کہ درخت

پر لگی ہوئی کھجوروں کی مقدار معلوم کرنے کا طریقہ اندازہ و تخمین کے سوا دوسرا نہیں ہے، اسی وجہ سے نبی علیہ السلام نے اس کو علی الاطلاق حرام قرار دیا ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ ادائیگی کو اشاریہ کے ساتھ جوڑنے کی صورت میں معاملہ ربوا اور سود کا بن جائے گا، کیوں کہ کرنسی ایک جنس ہے اس کا تبادلہ اور اس کی ادائیگی اسی جنس سے ہونی ضروری ہے، اشاریہ سے جوڑنے کی صورت میں جو اضافہ ہوگا وہ تاخیر (نسیئہ) کے مقابلہ میں ہو جائے گا جو کھلا ہوا ربوا ہے، اس لئے: ”ادائیگیوں کو اشاریہ سے جوڑنا باب ربوا کھولنے کا سبب بنے گا“۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ یہ مستقل تنازعہ کا سبب بنے گا؛ کیوں کہ نوٹ کی قدر افراط زر کی صورت میں گرے گی تو سو روپے قرض کی ادائیگی ایک سو دس یا بیس روپے ہونی چاہئے، اور تفریط زر کی صورت میں نوٹ کی قدر بڑھے گی تو اسی قرض کی ادائیگی ننانوے روپے میں ہوگی۔ ظاہر ہے دونوں صورتیں متنازع ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایسا عملی طور پر کہیں بھی نافذ نہیں ہو سکا اور نہ ہی اسے قبول عام حاصل ہو سکا۔

چوتھی توجہ یہ ہے کہ شریعت انہیں اصولوں کو حکم کی بنیاد بناتی ہے جو ہر شخص کی دسترس میں ہو اور عامۃ الورد ہو جیسے حکم ہے: ”صوموا لرؤیتکم و أفطروا لرؤیتکم“ (چاند دیکھ کر روزہ رکھو اور چاند دیکھ کر عید کرو)، ظاہر ہے ایسا اصول ہے جو ہر جگہ ہر شخص کے لئے قابل فہم ہے؛ جب کہ:

اشاریہ ایک نظریہ ہے جو ریاضی کے پیچیدہ اصولوں اور دقیق فنی بنیادوں پر مبنی ہے جو ہر شخص کے فہم سے بالاتر ہے اس لئے کسی شرعی حکم کی بنیاد نہیں بن سکتا۔ هذا ما ظہر لی واللہ أعلم بالصواب۔

(۲)

اس سوال میں جو صورت مسئلہ ذکر کی گئی ہے وہ قطعی طور پر حرام اور ناجائز ہے، اس کی حرمت دو وجہ سے ہے، ایک تو یہ سودی معاملہ ہے، دوسرے سود کو جائز کرنے کا حیلہ ہے۔

مسئلہ کی نوعیت یہ بنتی ہے کہ مثلاً زید نے دس ہزار روپے قرض لئے یا دس ہزار روپے کا ادھار سامان خریدا۔ جس وقت یہ معاملہ ہو رہا تھا اس وقت دس ہزار میں دس تولہ سونا خریدا جاسکتا تھا۔ طرفین نے یہ طے کر لیا کہ بوقت ادائیگی اتنے نوٹ دینے ہوں گے جن سے دس تولہ سونا خریدا جاسکے۔ طے شدہ شرط کی بنا پر ادائیگی کے وقت دس تولہ سونے کی قیمت بارہ ہزار روپے ہونے کی صورت میں زید بارہ ہزار روپے دینے کا پابند ہوگا۔

اس صورت میں نوٹ قرض میں دیا گیا ہے اور واپسی بھی نوٹ ہی کی شکل میں ہو رہی ہے۔ اور کرنسی نوٹ کا شمار جنس ہونے کی بنا پر اموال ربویہ میں ہوتا ہے لہذا مقدار میں برابری کے ساتھ لین دین واجب ہوگا، کمی بیشی بہر صورت ربا اور سود ہوگی۔

اس معاملہ کو جائز قرار دینے میں دوہرے گناہ کو دعوت دینا ہے: ایک سودی معاملہ، دوسرے سود کے جواز کے لئے حیلہ۔

یہاں پر یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ قرض لیتے وقت دس ہزار روپے کی مالیت واپسی کے وقت کے بارہ ہزار کی مالیت کے برابر ہے؛ اس لئے ربا کا تحقق نہیں ہوتا۔

لیکن یہ اعتراض باطل ہے؛ اس لئے کہ وہ تمام نصوص جو سود کی حرمت پر دلالت کرتی ہیں ان سے برابری اور مثلیت کے معنی پوری صراحت و وضاحت کے ساتھ متعین ہو جاتے ہیں،

وہ یہ کہ اموال ربویہ کی مقدار اور کیفیت میں برابری معتبر ہے مالیت اور قیمت میں برابری قطعاً غیر معتبر ہے۔ تمام فقہاء کے نزدیک یہ بات مسلم ہے کہ قرضوں کے لین دین میں برابری کی شرط

صرف سود اور ربا سے بچنے کے لئے ہے۔ دلیل:

۱۔ تمام متقدمین و متاخرین فقہاء کا متفقہ فتویٰ ہے کہ اگر ایک کلو گندم قرض لیا گیا تو ایک کلو گندم ہی واپس کرنا واجب ہے، قرض لیتے وقت اور واپس کرتے وقت گندم کی مالیت میں چاہے جتنا بھی تفاوت ہو جائے۔ یہ بالکل واضح دلیل ہے کہ شریعت قرض میں جس برابری کو ضروری قرار دیتی ہے وہ مقدار اور کمیت میں برابری ہے نہ کہ قیمت اور مالیت کی برابری۔

دس ہزار روپے کو سونے کے ساتھ وابستہ کر کے قرض دینا ربوایا شبہہ رباسے ہرگز خالی نہیں ہے، اگر یہ معاملہ ایسے کر لیا جائے کہ قرض دینے والا سونا قرض دے اور قرض لینے والا اس کو بیچ کر کام میں لائے پھر اتنی مقدار سونے کی خرید کر قرض ادا کر دے۔

اگر اس طرح معاملہ کرنے میں کوئی دقت نہ ہو تو اسی طریقہ کو اپنانے کی ترغیب دینی

چاہئے۔

## موجودہ کرنسی کا شرعی حکم

مفتی محمد احتشام قاسمی ☆

اس عنوان کے تحت پہلے سوال کی یہ عبارت کہ ”کاغذی نوٹوں کی اپنی ذاتی کوئی قیمت نہیں ہوتی اور افراط زر کی صورت میں اس کی قوت خرید تیزی سے گر جاتی ہے“ اس عبارت کے سلسلہ میں اولاً تو یہ عرض ہے کہ ”افراط زر کی صورت میں کاغذی نوٹ کی قوت خرید تیزی سے گر جاتی ہے“ صحیح نہیں ہے۔

کیوں کہ ثمن خلقی یا ثمن عرفی و اصطلاحی کی قیمت متعین ہوتی ہے، اس میں کمی بیشی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، بلکہ جو اشیاء خریدی جاتی ہیں ان کی قیمتوں میں اضافہ ہوتا ہے اور اس اضافہ کی مختلف وجہیں ہو سکتی ہیں مثلاً کبھی پیداوار کم ہونا، یا قحط سالی کا ہونا، یا کسی چیز کا کم یا ب یا نایاب ہونا، یا حکومتوں کا اپنے خزانے کو بھرنے کے لئے یا تنخواہوں وغیرہ میں اضافہ کرنے کے لئے تجارت پر مختلف قسم کے ٹیکس لگا کر یا بڑھا کر رقم وصول کرنا، جس کی وصولی تجارتی قیمتوں میں اضافہ کر کے کرتے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔

مختصر یہ کہ روپیہ کی قوت خرید کم نہیں ہوتی، بلکہ ارزانی یا گرانی سامان و اشیاء میں ہوتی ہے، اب کچھ لوگ تعبیر کوالٹ کریوں کہتے ہیں کہ ”روپیہ کی قیمت یا روپیہ کی قوت خرید کم ہو گئی، جو لوگ ایسا کہتے ہیں یا سمجھتے ہیں صحیح نہیں ہے۔“

☆ پھولاس اکبر پوری، معرفت گولڈن گارمنٹس دیوبند۔

جب ہم اس کے متعلق ذخیرہ حدیث کو بنظر غائر دیکھتے ہیں تو یہ بات بالکل مستح ہو کر سامنے آتی ہے کہ ارزانی و گرانی کا تعلق سامان و اشیاء سے متعلق ہے ثمن سے نہیں، کیوں کہ سامان و اشیاء کی قیمت بڑھنے کی وجہ سے ثمن میں کم و بیش کا مسئلہ پیش آتا ہے۔

مشکوٰۃ باب الاحتکار میں، ص ۲۵۱ پر حدیث ہے:

”عن ابن عمر قال: قال رسول الله ﷺ: من احتكر طعاما أربعين

يوما يريد الغلاء فقد برئ من الله وبرئ الله منه“۔

حدیث مذکور میں گرانی کا تعلق جنس غلہ سے ظاہر کیا گیا ہے، روپیہ کی قدر میں کمی بیشی

سے نہیں۔

اور اسی صفحہ پر ایک دوسری حدیث ہے:

”عن أنس قال: غلا السعر على عهد النبي ﷺ فقالوا: يا رسول الله!

سعر لنا“۔

اس حدیث میں بھی غلہ اور دوسری اشیاء کی قیمتوں کو مقرر کرنے کی درخواست کی گئی کہ

یہ طے ہو جائے کہ فلاں چیز کی قیمت یہ ہوگی یہ نہیں کہ اتنی کھجور کے برابر اتنے درہم ہوں گے یا

فلاں چیز کے برابر اتنے درہم ہوں گے، بلکہ یہ طے کر دیا جائے کہ اتنے درہم کے بدلے میں اتنی

کھجور وغیرہ ملیں گی اور یہی عرف و دستور آج تک چلا آ رہا ہے۔

اور اسی صفحہ پر ایک تیسری حدیث ہے:

”عن معاذ قال: سمعت رسول الله ﷺ يقول: بئس العبد المحتكر

إن أرخص الله الأسعار حزن وإن أغلاها فرح“۔

اس حدیث میں بھی ارزانی و گرانی کو اشیاء ہی سے متعلق کیا گیا ہے ثمن سے نہیں۔

اور ابوداؤد کی ایک حدیث میں تو اس کی صراحت ملتی ہے کہ اونٹ گراں ہو گئے۔

”قال: كانت قيمة الدية على عهد رسول الله ﷺ ثمان مائة دينار أو ثمانية آلاف درهم..... حتى استخلف عمر فقال خطيباً: ألا إن الإبل قد غلت فافترضها عمر على أهل الذهب ألف دينار وعلى أهل الورق اثني عشر ألف درهم“ (ابوداؤد در ۶۲۵)۔

یہاں حدیث کی یا مسئلہ کی بحث میں نہ جاتے ہوئے صرف یہ عرض ہے کہ خلیفہ راشد کی زبان سے یہی نکلا کہ ”الا إن الإبل قد غلت“ کہ اونٹ کی قیمت بڑھ گئی، یہ نہیں فرمایا کہ درہم و دینار کی قیمت گھٹ گئی۔

جب یہ بات واضح ہو گئی کہ کاغذی نوٹوں کی قیمت یا قوت خرید میں کوئی کمی، ارزانی اور گراؤٹ نہیں ہوتی بلکہ وہ بحالہ باقی رہتی ہے تو یہ کہنا صحیح نہیں ہوگا کہ ”افراط زر کی صورت میں کاغذی نوٹ کی قوت خرید تیزی سے گر جاتی ہے“، اور سوال میں مذکور مؤخر مطالبوں مثلاً قرض، مہر پنشن، ادھار خریداری کی اور وقت پر ادانہ ہونے کے ادائیگی کو قیمتوں کے اشاریہ سے وابستہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

اور اگر مؤخر مطالبوں کو کسی اشاریہ سے وابستہ کیا جاتا ہے تو اس کی سب سے بڑی اور بنیادی خرابی یہ ہے کہ اس سے سود کا دروازہ کھل جائے گا جس کی حرمت کو قرآن حکیم نے بڑے شد و مد کے ساتھ بیان کیا ہے اور جس کے بارے میں احادیث میں بڑی بڑی وعیدیں آئی ہیں اور شریعت اسلامی نے سود کے بارے میں جو آہنی دیواریں قائم کی ہیں وہ ریت کے تودے سے زیادہ کمزور ہو جائیں گی اور سود خوار بڑی آسانی سے مدیون سے سود وصول کریں گے اور کہیں گے کہ اتنی مدت میں بازار کی قیمتوں میں اس قدر تفاوت ہو گیا ہے، اس لئے اتنا اضافہ لینا ضروری ہے، اور مفتیان کرام نے اس کو جائز ہونے اور وصول کرنے کا فتویٰ بھی دے رکھا ہے، حالانکہ یہ اضافہ اور زیادتی سود ہی ہے۔



کیوں کہ فقہاء نے سود کی یہ تعریف کی ہے: ”کل زیادة لا یقابلها عوض“ (احکام

القرآن للجصاص: ص ۲۲۲)۔

لہذا جتنی مالیت کی کرنسی نوٹ قرض لئے ہیں، برسوں کے بعد بھی اتنی ہی مالیت کے نوٹ ادا کرنے ضروری ہوں گے، مثلاً دس ہزار روپے قرض لئے ہیں تو دس ہزار روپے ہی واپس کرنے ضروری ہوں گے چاہے جتنی مدت کے بعد لوٹائے، زیادتی کرنا شرعی طور پر قطعاً جائز نہ ہوگا، اور اگر زیادتی کی جائے گی تو وہ سود ہی ہوگی۔

دوسری خرابی یہ ہے کہ ایسے کسی اشاریہ کو منضبط کرنا بھی عوام الناس کے لئے سہل نہیں ہے جس کی بنیاد دقیق فنی اصولوں پر ہو۔

تیسری خرابی یہ ہے کہ اس نظام کی وجہ سے عوام الناس یقیناً مشکلات اور تنازعات میں مبتلا ہو جائیں گے۔

۲- سوال (۲) میں جو یہ شکل بیان کی گئی ہے کہ ”قرض وغیرہ دیتے وقت ان کی مالیت کو سونے چاندی میں طے کر لیں اور بوقت ادائیگی اسی قدر سونے یا چاندی کی قیمت کے مساوی ادائیگی کر دی جائے“ تو یہ صورت شرعی اصول کی روشنی میں صحیح اور جائز ہے۔

لیکن یہ صورت بھی عوام الناس کے لئے مختلف مشکلات اور ان کے درمیان نوع بنوع کے تنازعات سے خالی نہیں ہے، مثلاً حق دار چاہے گا کہ میرا حق اس وقت طے جب سونے چاندی کی قیمت گراں ہو، اور مقروض چاہے گا کہ اس وقت ادا کروں جب ان کی قیمت ارزاں ہو، جو نزاع کا باعث ہے۔

اور یہ طریقہ پیغمبر اسلام اور اسلام کے مزاج کے بھی منافی ہے؛ کیوں کہ پیغمبر اسلام اور اسلام کو سہل الحصول اور سادگی کا طریقہ پسند ہے، مشکوٰۃ میں ہلال کے سلسلہ میں ایک حدیث ہے: ”إنا أمة أمية لا نكتب ولا نحسب“، اس حدیث کا حاصل یہی تو ہے کہ رسول اللہ

صلی اللہ علیہ نے عوام کے لئے اس طریقہ کو پسند نہیں کیا جس کی وجہ سے عوام دقتوں، پریشانیوں اور مشکلات میں مبتلا ہو جائیں، یا قدم قدم پر کسی حساب کرنے والے کے محتاج ہوں۔

اور فقہاء نے جہاں عرف و عادت سے بحث کی ہے، وہاں یہ بھی لکھا ہے: ”یعمل

بمثل ما عملوا من اعتبار تغیرات العرف و أحوال الناس وما هو أرفق بالناس

وما ظهر علیہ التعامل“ (رسم المفتی: ص ۹۷) اس میں خط کشیدہ عبارت پرانے طریقہ کی بھرپور

تائید کر رہی ہے۔

لہذا جو پرانا طریقہ عرصہ سے چلا آ رہا ہے اور عوام الناس کے لئے سہل و سادہ بھی ہے،

اسی کو باقی رکھنا چاہئے اور پرانے طریقہ کو چھوڑ کر اس نئے طریقہ کو اختیار کرنے میں سہولت کو ختم

کرنا، سرمایہ داروں کو اور زیادہ سرمایہ دار بنانا، غریبوں کی ہمدردی کے بجائے ان کا اور زیادہ خون

چوسنا اور لوگوں کو مشکلات اور تنگی میں ڈالنا ہے، جو کسی بھی طرح قابل ستائش نہیں ہو سکتا، اسلام کی

سادگی اس مشکل صورت کو پسند نہیں کرتی جو بہت سے مشکلات اور پیچیدگیوں کی حامل ہے، جب

کہ حدیث نبوی ہے: ”یسروا ولا تعسروا“ (آسانی پیدا کرو دشواری میں نہ ڈالو)، لہذا

پرانے طریقہ کو باقی رکھنا ہی بہتر ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

## موجودہ کرنسی اور اس کی شرعی حیثیت

مولانا محمد احسن عبدالحق ندوی ☆

کسی سے یہ بات مخفی نہیں کہ موجودہ دور بڑی تیزی کے ساتھ انقلاب سے دوچار ہے، سائنس کی ترقی، نئی نئی ایجادوں کو جنم دے رہی ہے اور ان سے نئے نئے مسائل ابھر رہے ہیں، ایسی ترقی جن کا انکار کوئی سمجھ دار انسان نہیں کر سکتا، پہلے جو چیزیں خواب و خیال تھیں اب وہ مشاہدہ میں آرہی ہیں اور لوگ ان سے بھرپور فائدہ اٹھا رہے ہیں، چنانچہ حکومت نے ابتداء میں جب نوٹ رائج کیا تو اس کو سند اور وثیقہ قرار دیا اور اس پر طبع کرایا کہ اس کا مال سونے یا چاندی سے دیا جائے گا۔

سوال: نوٹ کا جب نوٹ سے تبادلہ ہو تو کیا اس میں مالیت کے کم و بیش کی اجازت ہوگی یا نہیں؟

جواب: نوٹ ثمن عرفی ہے اور یہ ثمن خلقی کے قائم مقام ہے، تو جس طرح ثمن خلقی میں کم و بیش جائز نہیں، اسی طرح ثمن عرفی میں بھی کم و بیش جائز نہیں ہوگا، احناف میں امام محمد تقاضی کے جواز کے قائل نہیں ہیں۔

”وقال محمد: لا يجوز لأن الثمنية تثبت باصطلاح الكل فلا تبطل باصطلاحهما، وإذا بقيت أمانة تتعين، فصار إذا كانا بغير أعيانها وكبيع الدرهم بالدرهمين“ (ہدایہ ۶۵/۳)۔

☆ مرکز الامام ابی الحسن الندوی، دار عرفات، تکیہ کلاں رائے بریلی۔

(فلوس کی بیع میں امام محمد فرماتے ہیں کہ تقاضل جائز نہیں؛ کیوں کہ اس کی شہیت عوام کی اصطلاح میں ثابت ہو چکی ہے، تو دو شخصوں کے مان لینے سے وہ باطل نہیں ہوگی، اور جب وہ شمن باقی رہے تو متعین نہیں ہوں گے، جیسا کہ غیر اعیان سے اور ایک درہم کا دو درہم کے عوض بیچنا درست نہیں ہے)۔

امام مالک کا مسلک بھی امام محمد کی طرح ہے، امام مالک نے فلوس کی بیع میں تقاضل کو کسی طرح بھی جائز قرار نہیں دیا ہے۔

”لأن مالکاً قال: لا يجوز فلس بفلسين ولا تجوز الفلوس بالذهب والفضة ولا بالدينير نظرة“ (المدونة الكبرى ۱۰۲)۔

(امام مالک فرماتے ہیں کہ ایک فلوس کا تبادلہ دو فلوس سے کیا جائے تو جائز نہیں ہوگا، اسی طرح فلوس کا تبادلہ سونے چاندی یا دنانیر سے کمی بیشی کے ساتھ جائز نہیں ہوگا)۔

کھوٹے سکوں کے تقاضل میں جو صاحب ہدایہ نے لکھا ہے اس سے بھی امام محمد کے مسلک کی تائید ہوتی ہے۔ صاحب ہدایہ تحریر فرماتے ہیں:

”وقال ومشاينحنالهم يفتوا بجواز ذلك في العدالي والخطارفة لأنها اعز الأموال في ديارنا فلم أبيع التفاضل فيه يفتح باب الربوا“ (ہدایہ ۹۳/۳)۔

(صاحب ہدایہ فرماتے ہیں کہ ہمارے مشائخ نے عدالی اور غطارفہ کے سکوں میں بھی تقاضل کے جواز کا فتویٰ نہیں دیا ہے، اس لئے کہ وہ ہمارے دیار میں بیش قیمت مال شمار ہوتے ہیں، اگر تقاضل کو ان سکوں میں مباح کر دیا تو سود کا دروازہ کھل جائے گا، اس لئے سد للباب تقاضل کے ناجائز ہونے کا فتویٰ دینا لازم ہے۔

کرنسی سے متعلق دو سوالات کے جوابات:

سوال ۱۔ کیا شرعیاً صحیح ہوگا کہ دیون یعنی مؤخر مطالبوں مثلاً قرض، مہر پینشن، ادھار

خریداری کی رقم اور وقت پر ادائہ ہونے والی تنخواہوں کی ادائیگی کو قیمتوں کے اشاریہ سے وابستہ کر دیا جائے.....؟

جواب: دیون یعنی مؤخر مطالبوں میں جیسے قرض، مہر، پینشن اور ادھار خریداری کی رقم کی ادائیگی کو قیمتوں کے اشاریہ سے متعین کرنا نہ تو شرعاً جائز ہے اور نہ قیمتوں کے اشاریہ کے ذریعہ ادائیگی کے لئے کوئی متعین منضبط قاعدہ ہے، اور جو دقیق فنی قاعدے اس سلسلہ میں بیان کئے جاتے ہیں وہ عوام الناس کے فہم و ادراک سے بالاتر ہیں، جن کی وجہ سے عوام الناس کے درمیان قرض کی ادائیگی کے لئے قیمتوں کے اشاریہ کو معیار قرار دینا ایک مستقل تنازع کا سبب بھی بن جائے گا، اس کے علاوہ اس طریقہ کار سے سود کا دروازہ بھی کھل جائے گا، لہذا شرعی نقطہ نظر سے قیمتوں کے اشاریہ کا اعتبار کرنا کسی طرح بھی جائز قرار نہیں دیا جاسکتا۔

### خلاصہ بحث:

راقم الحرف کے نزدیک مذکورہ بحث کا ما حاصل یہ ہے کہ جتنی چیزوں کا سوال میں ذکر ہے ان کو قیمتوں کے اشاریہ سے وابستہ کرنا شرعاً جائز نہیں ہے؛ اس لئے کہ موجودہ دور میں اگر اس کی اجازت دے دی گئی تو سود کا دروازہ کھل جائے گا اور یہ باہمی تنازع کا بھی موجب بنے گا؛ لہذا اس کی اجازت نہیں ہونی چاہئے۔ واللہ اعلم۔

سوال ۲- کیا یہ جائز ہوگا کہ نوٹوں کی شکل میں قرض دیتے وقت یا مہر کے تقرر کے وقت یا ادھار فروختگی کے وقت طرفین واجب الاداء نوٹ کی مالیت سونے یا چاندی میں طے کر لیں اور بوقت ادائیگی اسی قدر سونے یا چاندی کی قیمت کے مساوی نوٹوں کی ادائیگی عمل میں آئے؟

جواب ۲: حکومتوں کا نظام اب تک یہی رہا ہے کہ جس قدر قرض دیا گیا ہے، پانچ، دس سال بعد بھی اتنی ہی رقم واپس ہوتی ہے، اصل رقم میں کوئی اضافہ یا کمی نہیں ہوتی ہے۔ سود کے نام

پر جو اضافہ ملتا ہے اس کا تعلق اصل رقم کی کمی بیشی سے قطعاً نہیں ہوتا ہے۔

قدر و قیمت کے بڑھنے اور گھٹنے کے سلسلہ میں حدیث میں صراحت ملتی ہے کہ دراصل سامان کی قیمت بڑھنے کی وجہ سے ہی قیمت میں کمی بیشی کا مسئلہ پیش آیا ہے۔ یعنی ارزانی اور گرانی کا تعلق سامان اور اشیاء سے متعلق ہے، ثمن خلقی کی قدر میں کمی و بیشی سے نہیں ہے۔

”باب الاحتکار“ میں ایک حدیث ہے: ”عن ابن عمر رضی اللہ عنہما قال: قال رسول اللہ ﷺ: من احتکر طعاماً أربعین يوماً یزید الغلاء فقد برئ من اللہ وبرئ اللہ منه“ (مشکوٰۃ ۲/۲۵۱)۔

(اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو کھانے کا سامان چالیس دن دبا کر رکھے اور اس کا مقصد گراں کرنے کا ہو تو ایسا شخص اللہ سے بری ہے اور اللہ اس سے بری ہے)۔ اس حدیث میں گرانی کا تعلق جنس غلہ سے ظاہر کیا گیا ہے، روپے کی قدر میں کمی بیشی سے نہیں۔

اگر نوٹوں سے قرض کا معاملہ کیا جائے تو جتنی مدت کے بعد بھی اس کی ادائیگی ہوگی بعینہ اسی مقدار کے نوٹ واپس کرنے ضروری ہیں، ایک روپیہ کا بھی اضافہ جائز نہیں ہے۔ خواہ قیمتوں میں آسمان وزمین کا فرق ہو جائے ورنہ یہ سود ہو جائے گا، مثلاً کسی نے دس سال قبل ایک ہزار روپے قرض لئے تھے اور قرض کی ادائیگی آج کر رہا ہے تو وہ ایک ہزار روپے ہی واپس کرے گا، ایک روپے زیادہ دینا یا لینا سود کا موجب ہوگا۔

زیر بحث مسئلہ کے سلسلہ میں سب سے بہتر اور آسان صورت یہ ہے کہ قرض دیتے وقت یا دیون یعنی مہر مقرر کرتے وقت، اسی طرح ادھار فروختگی کے وقت طرفین واجب الاداء نوٹ کی مالیت سونے یا چاندی میں طے کر لیں اور بوقت ادائیگی اسی قدر سونے یا چاندی کی قیمت کے مساوی نوٹوں کی ادائیگی پر معاملہ کر لیں، مثلاً اس طرح کہ آج ایک تولہ چاندی کے برابر دس

ہزار روپے قرض میں دے رہا ہوں اور وصولیابی کے وقت ایک تولہ چاندی کے برابر روپے لوں گا، خواہ کتنے ہی نوٹوں کے برابر ہوں۔

خلاصہ بحث:

راقم الحروف کا اس سلسلہ میں یہ خیال ہے کہ قرض دیتے وقت یا مہر وغیرہ مقرر کرتے وقت سونے چاندی کی مالیت طے کر لی جائے اور قرض یا مہر وغیرہ کی ادائیگی کے وقت اسی کے مطابق عمل کیا جائے، تاکہ طرفین کے مابین نزاع کا اندیشہ باقی نہ رہے۔ واللہ اعلم۔

Handwritten text in Urdu script, likely a continuation of the article or a separate section. The text is dense and covers most of the lower half of the page.

## موجودہ کرنسی کا حکم

مفتی سید باقر ارشد قاسمی بنگلوری ☆

۱- دیون یعنی مؤخر مطالبوں مثلاً قرض، مہر، پنشن، ادھار خریداری کی رقم اور وقت پر ادا نہ ہونے والی تنخواہوں کی ادائیگی کو قیمتوں کے اشاریہ کے نظام سے مربوط کر دینے میں کئی ایک مشکلات و الجھنیں پیدا ہو جائیں گی اور عوام الناس کے لئے یہ بڑی پیچیدگی والی بات ہوگی؛ کیونکہ اشاریہ میں سارا دار و مدار حساب و کتاب پر ہے اور حساب و کتاب ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں۔

دیون کی ادائیگی کے سلسلہ میں (کاغذی نوٹ یا موجودہ کرنسی کو شمن عرفی مان لینے کے باوجود) دو پہلو ہیں اور دونوں ہی میں الجھن و کشمکش ہے۔

ایک پہلو یہ ہے اگر دینار و درہم کے جیسا شمن نہ مانا جائے بلکہ قیمتوں کا لحاظ کیا جائے تو ایسی صورت میں سود کا دروازہ کھل جائے گا۔ مثلاً دس سال پہلے اگر کسی نے سو روپے قرض لئے تو دس سال بعد اس کو روپے کی قدر کے مطابق سو سے زائد روپے قرض میں ادا کرنے ہونگے۔ اور دس سال پہلے جو قدر روپے کی تھی، جو قیمت روپے کی تھی، اس قیمت و قدر میں اور اب دس سال بعد کی قیمت و قدر میں زمین آسمان کا تفاوت ہے۔

نیز معیار روپے کی قدر رکھ دیا جائے تو ایسی صورت میں عوام کو کاروباری سطح پر کافی

☆ سرپرست مجاہد یعقوب، چین پٹن، بنگلور، کرناٹک۔



مشکلات کا سامنا ہوگا، حساب و کتاب کا ایک مستقل نظام رکھنا پڑے گا اور یہ عوام کے لئے کافی دقت والا معاملہ ہے۔ کیونکہ حساب و کتاب کرنا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں، اور ایسا کرنے سے رسول اکرم ﷺ نے روکا بھی ہے کہ عوام کو زیادہ الجھنوں اور مشکلات میں ڈالا جائے اور ان کے لئے دین مشکل بنا دیا جائے۔ اسلام ایک سادہ منہب ہے اور اس میں بجائے پیچیدگیوں کے عوام کو سہولتیں مہیا ہیں۔ چنانچہ ایک موقع پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ انا امة أمية لا نكتب ولا نحسب..... (صحیح البخاری رقم حدیث ۱۹۱۳، دارالکتب العربی، بیروت)۔ یعنی ہم امی جماعت سے تعلق رکھتے ہیں جو دقیق حساب و کتاب نہیں جانتی۔

دوسرا پہلو یہ ہے کہ اگر نوٹ کو دینا رو درہم کی جگہ مان لیا جائے اور ان کو دینا رو درہم جیسا ٹمن قرار دیا جائے تو مطلب یہ نکلتا ہے کہ چند سال قبل اگر کسی نے سو روپے بطور قرض لئے تھے، اب اس کو سو روپے ہی کی ادائیگی لازم ہے نہ کہ آج کی کرنسی کی قدر کے مطابق زائد دینے کی ضرورت ہے۔ سو روپے سے اوپر ایک روپے کا اضافہ بھی سود میں داخل ہوگا۔ اور ایسا کرنا جائز نہیں۔ حالانکہ اس میں قرض دینے والے کا نقصان ہے اور قرض لینے والا فائدہ میں رہتا ہے؛ کیونکہ دس سال پہلے کی روپے کی قدر میں اور آج دس سال بعد روپے کی قدر میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ ایک نقصان یہ ہے کہ روپے کی قدر میں کمی آرہی ہے لیکن اس سے بڑا نقصان یہ ہو رہا ہے کہ سود کا دروازہ کھل رہا ہے، سود خوروں کو اذن عام دیا جا رہا ہے کہ وہ حیلے بہانوں سے سود کھائیں اور غریب عوام کو لوٹیں، نیز آپسی رشتوں میں بھی سود کا چلن عام ہو جائے گا، شوہر کے لئے لازم ہوگا کہ وہ بیوی کا مہر روپے کی قدر کے مطابق زائد ادا کرے، اور یہ سود ہوگا، اس سے کئی ایک مفاسد کے کھلنے کا اندیشہ ہے۔ اسی لئے فقہ کا اہم ترین و مشہور قاعدہ ہے: الضرر الأشد يزال بالضرر الأخف، یعنی شدید نقصان خفیف نقصان کو گوارا کر کے دور کیا جائے۔ ایک اور نکتہ یہ ہے کہ عام طور سے یہ مشہور ہے کہ کرنسی کی قدر گر گئی، حالانکہ ایسا نہیں ہے،

کرنسی تو وہی ہے، دس سال پہلے جو سو کا نوٹ تھا وہی نوٹ اب نئے ایڈیشن، نئے ڈیزائن کے ساتھ چھپ رہا ہے۔ اصل بات قیمتوں میں اضافہ کی نہیں اشیاء کی گرانی کی ہے۔ اشیاء گراں ہو جاتی ہیں، آسانی سے دستیاب نہیں ہوتیں؛ لہذا اس کو خریدنے کے لئے زیادہ کرنسی کی ادائیگی ضروری ہو جاتی ہے۔ پہلے جو چیز آسانی سے دستیاب ہوتی تھی اب اس کی فراہمی مشکل ہو گئی۔ ملک کے اقتصاد پر اثر پڑتا ہے تو حکومت ٹیکس میں اضافہ کرتی ہے، قحط سالی کے موقع پر چونکہ پیداوار ہی کم ہوتی ہے اور وہ ملک کے عوام کو نا کافی ہوتی ہے لہذا اس کا حصول مشکل ہو جاتا ہے اور جو چیز مشکل سے حاصل ہوتی ہے اس کی قیمت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ یعنی روپیہ تو وہی رہتا ہے، اشیاء کی قیمتوں میں کمی بیشی ہوتی رہتی ہے۔ جیسا کہ عہد رسول اکرم ﷺ میں دیت آٹھ سو دینار یا آٹھ ہزار درہم تھی، اور یہ اسی طرح باقی رہی، یہاں تک کہ حضرت عمرؓ نے اپنے دور خلافت میں خطبہ دیا اور فرمایا کہ اب اونٹ مہنگے ہو گئے ہیں۔ پھر آپ نے سونا والوں پر ایک ہزار دینار اور چاندی والوں پر بارہ ہزار درہم دیت مقرر کی۔ چنانچہ ابوداؤد میں ہے: عن عمرو بن شعيب عن أبيه عن جده قال كانت قيمة الدية على عهد رسول الله ﷺ ثمان مائة دينار أو ثمانية آلاف درهم، ودية أهل الكتاب يومئذ النصف من دية المسلمين، قال: فكان ذلك كذلك حتى استخلف عمر فقام خطيباً: فقال ألا أن الإبل قد غلت قال: ففرضها عمر على أهل الذهب ألف دينار و على أهل الورق اثني عشر ألفاً..... الخ (أبوداؤد، رقم حدیث: ۴۵۳۲، مکتبۃ المعارف، الریاض)۔

لہذا موجودہ کرنسی ٹمن عرفی ہے اور اس کو وہی مقام حاصل ہو گیا ہے جو مقام دینار و درہم کا تھا۔ اس لئے اس کرنسی میں دیون کا جو بھی معاملہ کیا جائے بعد مدت کے ادائیگی میں اتنی ہی مقدار میں لوٹانا چاہئے، اسپر ایک روپیہ کا اضافہ بھی سود میں داخل ہے۔

اس سلسلہ میں کہا یہ جاتا ہے کہ قرض والے کا نقصان ہے، لیکن یہاں یہ بھی بات ذہن

میں رکھنی ہوگی کہ قرض دینے والا قرض مدد و ہمدردی کے جذبات کے تحت دیتا ہے نہ کہ سودا بازی یا کاروبار کے لئے، لہذا اس میں نفع نقصان کی بات ہی نہیں، قرض، مہر، پنشن، ادھار خریداری وغیرہ میں اختیار ہے چاہے تو دے یا نہ دے مثلاً مہر اسی وقت عورت مانگ سکتی ہے لیکن اس میں مہلت ہمدردی کے جذبات کے تحت ہے۔

دوسری غور طلب بات یہ ہے کہ کیا قرض دینے والا اس سال پہلے قرض نہ دیتا اور وہ رقم اپنے پاس رکھتا تو کیا وہ رقم اس کے پاس موجودہ قدر کے حساب سے بڑھ جاتی؟ جو وہ قرض دار سے وصول کرنا چاہتا ہے۔ چاہے قرض دے یا نہ دے اس کی رقم کی قدر میں گراوٹ کا ہونا لازمی ہے۔ ہاں اس نے اپنے ایک بھائی کے ساتھ بھلائی کا معاملہ کیا اور اس کی مدد کر دی جس کا اجر اس کے لئے دنیا یا آخرت میں مختص ہے۔

فی الجملہ دیون یعنی موخر مطالبوں مثلاً قرض، مہر، پنشن، ادھار خریداری کی رقم اور وقت پر ادا نہ ہونے والی تنخواہوں کی ادائیگی کو قیمتوں کے اشاریہ سے وابستہ کرنا درست نہ ہوگا۔ کیونکہ ایسا کرنے سے غریبوں کی مشکلات میں اضافہ ہوگا؛ عوام کے لئے کاروباری دقتوں میں زیادتی ہوگی اور سود کا اور اس کے مفاسد کا دروازہ کھل جائے گا۔

۲- اب چونکہ موجودہ کرنسی کو ثمن عرفی کی حیثیت حاصل ہے اور دینار و درہم کے قائم مقام ہے تو ایسی صورت میں نوٹوں کے ذریعہ ہی تمام معاملات طے کئے جاسکتے ہیں۔ شریعت نے دین کو آسان رکھا ہے۔ اب سونے و چاندی کی مالیت کے نوٹوں میں دیون کا معاملہ طے ہو تو یہ پیچیدگی پھر بھی باقی رہے گی کہ دونوں کو سونے و چاندی کے نرخ کا علم رکھنا ہوگا اور اس کا حساب و کتاب بھی رکھنا پڑے گا۔ یہ چیز عوام کے لئے تکلیف دہ ہے۔ لہذا جب یہ بات واضح ہے کہ دنیا میں موجودہ کرنسی کا چلن اتنا عام ہے اور اس کو ثمن عرفی کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے اور لوگ بلا تکلف اسی سے اپنے معاملات طے کر رہے ہیں تو اس کی کوئی ضرورت نہیں کہ طرفین آپس میں

معاملہ بجائے نوٹوں کے سونے و چاندی میں کریں، کیونکہ ایسا کرنا شرعاً جائز بھی نہیں ہے۔ چنانچہ اسی سلسلہ میں اس حدیث سے استدلال کیا جاسکتا ہے کہ: عن عبادة ابن الصامت قال: قال رسول الله ﷺ: الذهب بالذهب والفضة بالفضة والبر بالبر والشعير بالشعير والتمر بالتمر والملح بالملح مثلاً بمثل سواء بسواء يدا بيد فإذا اختلف هذه الأصناف فبيعوا كيف شئتم إذا كان يداً بيد (صحیح مسلم: باب الصرف وبيع الذهب بالورق نقداً، ص ۵۶۸، دار الفکر الجدید، مصر)۔ یعنی رسول اکرم ﷺ نے فرمایا کہ سونے کو سونے کے بدلے اور چاندی کو چاندی کے بدلے، گیہوں کو گیہوں کے بدلے، جو کو جو کے بدلے، کھجور کو کھجور کے بدلے اور نمک کو نمک کے بدلے میں برابر کر کے ہاتھ در ہاتھ فروخت کرو۔ اور اگر جنس بدل جائے تو پھر جس طرح چاہے فروخت کرو مگر شرط یہ ہے کہ ہاتھ در ہاتھ یعنی نقد ہو ادھار نہ ہو۔

اس حدیث میں اللہ کے رسول نے نقد معاملات طے کرنے کا حکم دیا ہے اور ایسے معاملات کو ادھار کرنے سے منع فرمایا ہے۔ اس لئے بہتر ہے کہ عرف عام میں موجودہ کرنسی کا چلن ہے اور لوگ بلا جھجک نوٹوں ہی کے ذریعہ اپنے معاملات طے کر رہے ہیں، لہذا یہی صورت حال برقرار رہے تاکہ عوام کے لئے سہولت و آسانی کا سبب بنے۔

چنانچہ رسم المفتی میں لکھا ہے: يعمل بمثل ما عملوا من اعتبار تغيرات الصرف وأحوال الناس وما هو الأرفق بالناس وما ظهر عليه التعامل (ص ۹۷) یعنی عرف اور عوام کے احوال بدل جانے سے جس پر عوام عمل کر رہے ہوں اسی پر عمل کیا جائے گا جو عوام کے لئے زیادہ سہولت کا باعث ہو اور جس پر تعامل بھی غالب آچکا ہو۔

خلاصہ کلام:

☆ اب موجودہ کرنسی اور اشیاء میں درکار تناسب نہ رہا جس کی وجہ سے اشیاء کی قیمتوں

میں اضافہ ہو گیا، جس کو عام طور پر کرنسی کی قدر میں گرواٹ سے تعبیر کیا جاتا ہے، جب کہ اشیاء گراں ہوئی ہیں، کرنسی کی قدر میں کمی نہیں۔

☆ زمانہ جدید میں موجودہ کرنسی دینار و درہم یعنی سونے و چاندی کے قائم مقام ہو گئی ہے اور اس کو ثمن اصطلاحی و ثمن عرفی کی حیثیت حاصل ہو چکی ہے۔ لہذا اس کرنسی میں دیون کا جو بھی معاملہ کیا جائے بعد مدت ادائیگی کی صورت میں اتنی ہی مقدار میں لوٹانا چاہئے، اس پر ایک روپے کا اضافہ بھی سود میں داخل ہے۔

☆ دیون کے سلسلہ میں ادائیگی کو قیمتوں کے اشاریہ سے وابستہ کرنا عوام کے لئے باہمی تنازع و دقت کا بھی باعث ہے۔

☆ حدیث میں اللہ کے رسول ﷺ نے نقد معاملات طے کرنے کا حکم دیا ہے اور جنس بدل جانے کی صورت میں ادھار معاملات سے منع کیا ہے۔

☆ نیز چونکہ موجودہ کرنسی ثمن عرفی و اصطلاحی کی حیثیت کی حامل ہے، کرنسی ہی کے ذریعہ تمام معاملات کئے جائیں۔ اسی میں عوام کے لئے سہولت ہے۔ ہذا ما عندی واللہ تعالیٰ اعلم۔

## موجودہ کرنسی اور شرعی نقطہ نظر

مولوی ارشد شاد اب ندوی ☆

موجودہ زمانہ بڑی تیزی کے ساتھ انقلابات سے دوچار ہے، سائنس کی ترقی، نئی ایجاد اور نئی تدبیروں کو جنم دے رہی ہے، ان سے نئے مسائل ابھر رہے ہیں، ان حالات و انقلابات نے دین کے ان احکام و مسائل کو بھی متاثر کیا ہے، جو مجتہد فیہا ہیں، اور منقول و منصوص نہیں ہیں، انہی میں سے ایک اہم مسئلہ ”موجودہ کرنسی کی شرعی حیثیت“ ہے۔

کرنسی انسانی سماج میں بہت بڑی ضرورت ہے، کیوں کہ انسان اپنی ضروریات کو خرید و فروخت کے بغیر پورا نہیں کر سکتا اور خرید و فروخت میں ایک ایسی شے کا وجود ضروری ہے، جسے اشیاء کے تبادلہ کا ذریعہ مانا گیا ہو، اللہ تعالیٰ نے جہاں انسانی غذا کی ضرورت کے لئے اجناس، پھل اور ترکاریاں پیدا فرمائیں اس کی دوسری ضرورتوں کے لئے مٹی، پتھر اور لکڑی وغیرہ کو وجود بخشا، اسی طرح اشیاء کے تبادلہ میں ذریعہ و وسیلہ بنانے کے لئے سونا چاندی کو پیدا فرمایا، لیکن نظام معیشت اور تبادلہ زر میں آنے والی تبدیلی کے باعث مختلف چیزیں اس کی جگہ لیتی رہی ہیں، اس وقت پوری دنیا میں اس مقصد کے حصول کے لئے کاغذی نوٹ جاری ہیں۔ اور اس وقت کاغذی نوٹ کو شمن اصطلاحی کی حیثیت حاصل ہے۔ تو اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر کسی کے ذمہ دس سال پہلے کسی کے سونوٹ بطور دین و قرض واجب الاداء ہو جائیں تو کیا وہ شخص محض صورتی

☆ تاج برتن اسٹور رام بابو مارکٹ پل روڈ، مہو ضلع ویشالی، بہار۔

اور عددی طور پر اس دین و قرض کے برابر نوٹ ادا کرنے سے فارغ الذمہ قرار دیا جائے گا، اور کیا ان دونوں نوٹوں میں مالیت اور قیمت خرید میں تفاوت فاحش کے باوجود محض عددی و صوری مساوات کی بنیاد پر ایک کو دوسرے کا مثل تسلیم کیا جائے گا؟ یا دقیق فنی اصول اور اشاریہ کے ذریعہ قرض ادا کرے گا؟

اس تناظر میں فقہی تصریحات پر غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ قرض ادا کرنے میں مماثل لازم و ضروری ہے یعنی جتنا قرض لیا تھا اتنا ہی واپس کرے گا، مثلاً زید نے بکر سے دس سال پہلے دو سو (۲۰۰) روپے لیا تھا تو اب زید بکر کو دس سال بعد دو سو (۲۰۰) روپے ہی ادا کرے گا خواہ اس کی خرید و فروخت میں زمین و آسمان کا فرق ہی کیوں نہ ہو جائے۔ اس کی مالیت کی طرف کوئی دھیان نہیں دیا جائے گا۔

چنانچہ علامہ ابن قدامہ اپنی کتاب المغنی میں لکھتے ہیں:

”إن المستقرض يرد المثل في المثليات سواء رخص سعره أو غلا أو كان بحاله ولو كان ما أقرضه موجودا بعينه فرده من غير عيب يحدث فيه لزوم قبوله سواء تغير سعره أو لم يتغير“ (المغنی لابن قدامہ ۳۶۰/۳ مطبوعہ بیروت لبنان)۔

(قرض خواہ مثلیات میں مثل ہی واپس کرے گا خواہ اس کی قیمت کم ہوگی ہو، بڑھ گئی ہو یا جوں کاتوں ہو، اگر قرض لی ہوئی چیز بعینہ موجود ہو اور کوئی عیب پیدا ہوئے بغیر اس کو لوٹا دے تو قرض دہندہ کے لئے اس کو قبول کرنا لازم ہے، خواہ اس کی قیمت میں کوئی تبدیلی ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو)۔

ہدایہ میں ہے:

”المماثلة بين الشيئين باعتبار الصورة والمعنى“ (ہدایہ مع اللغ ۷/۷)۔

(دونوں چیزوں کے درمیان صورت و معنی کے اعتبار سے مماثلت ہو)۔

علامہ کاسائی بدائع الصنائع میں لکھتے ہیں:

”والمثل المطلق هو المثل صورة ومعنى فأما القيمة فمثل من حيث المعنى دون الصورة“ (بدائع الصنائع ۳/۴۰۱)۔

(تماثل مطلق اس وقت ہوگا جب کہ صورت و معنی تماثل پایا جائے، جہاں تک بات رہی قیمت کی تو یہ معنا تماثل ہے نہ کہ صورت)۔

بلغۃ السالک میں ہے:

”أخذ بمثله ولا ينظر للسعر الرافع“ (بلغۃ السالک ۲/۲۱۲)۔

(مثل لیا جائے گا، گراں ہوتی قیمت پر توجہ نہیں کیا جائے گا)۔

علامہ نووی فرماتے ہیں:

”إذا أقرض شيئاً له مثل كالحبوب والادهان، والدراهم والدنانير

وجب على المقرض رد مثلها لأنه أقرب إليه (شرح المہذب ۲/۲۱۵، دار التراث بیروت)۔

(اگر مثلی چیز مثلاً دانے، تیل، دراہم، دنانیر، قرض دیا جائے تو مقروض پر اسی کے مثل

واپسی واجب ہوگی؛ کیوں کہ یہی اس کے قرض سے قریب ترین ہے)۔

علامہ شامی فرماتے ہیں:

”يجب عليه رد مثله إن كان ذوات الأمثال كالمكيل والموزن والعدد

الذی لا يتفاوت“ (مجموعہ رسائل ابن عابدین، تنبیہ الرقود فی الحکام القنوی: ۵۶)۔

(اگر ذوات الامثال کے قبیل کی چیزیں ہیں مثلاً کیلی، موزونی اور ایسا عددی جس میں

بہت زیادہ تفاوت نہیں ہوتا ہے تو قرض خواہ پر اس کی مثل لوٹانا واجب ہے)۔

مذکورہ بالا تمام فقہی عبارتوں سے پتہ چلتا ہے کہ قرض ادا کرنے میں تماثل و برابری

ضروری ہے، تعارف کسی طرح بھی جائز نہیں ہے؛ کیوں کہ قیمتوں کی کمی و بیشی ایک اضافی چیز



ہے، حقیقی نہیں ہے۔ مثلاً جس وقت قرض لیا تھا اس وقت ایک کتاب کی قیمت ایک سو روپے تھی جب کہ آج اس کی قیمت دو سو روپے ہے، تو کیا کہا جائے گا کہ کتاب کی قیمت بڑھ گئی یا روپے کی قیمت گھٹ گئی؟ تو عام بول چال اور عرف میں گرانی کی اضافت سامان کی طرف کیا جاتا ہے۔ یعنی کتاب کی قیمت بڑھ گئی یا سبزی وغیرہ کی گھٹ گئی، یہی بات صحیح معلوم ہوتی ہے کیوں کہ روپیہ تو ثمن ہے، اس کی قیمت کیا گھٹے گی یا بڑھے گی؟ وہ اپنے حال پر قائم ہے، البتہ اس کے مقابلے میں جو سامان خریدا گیا ہے وہ گراں ہو گیا ہے، یعنی ارزانی و گرانی کا تعلق سامان اور اشیاء سے متعلق ہے، چونکہ احادیث کو دیکھنے سے بھی یہی پتہ چلتا ہے:

عن معاذ قال: سمعت رسول الله ﷺ يقول: بشس العبد المحتكر

إن أرخص الله الأسعار حزن وإن أغلاه فرح“ (مشکوٰۃ: ۲۵۱ باب الاحتكار)۔

(حضرت معاذ سے مروی ہے کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ ذخیرہ اندوزی کرنے والا بہت ہی بد بخت شخص ہے اگر اللہ تعالیٰ نرخ کم کر دے تو غمزدہ ہوتا ہے اور اگر بڑھا دے تو خوش ہوتا ہے)۔

اس حدیث میں گرانی کا تعلق نرخ سے ظاہر کیا گیا ہے، روپے کی قدر میں کمی و بیشی نہیں کیا گیا ہے۔ اسی طرح ایک دوسری حدیث میں ہے:

”عن أنس قال: غلا السعر على عهد النبي ﷺ فقالوا: يا رسول الله!

سعر لنا“ (مشکوٰۃ: ۲۵۱ باب الاحتكار)۔

(حضرت انس سے مروی ہے کہ عہد نبوی میں جب نرخ میں گرانی آئی تو صحابہ کرام نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! ہمارے لئے نرخ متعین فرما دیجئے)۔

یہاں بھی دیکھئے کہ صحابہ کرام نے غلہ اور دوسری چیزوں کی قیمتوں کو مقرر کر دینے کی درخواست کی ہے، کہ یہ طے ہو کہ فلاں چیز کا نرخ یہ ہے۔ ان احادیث کی روشنی میں یہی بات سمجھ

میں آتی ہے کہ قیمت میں ارزانی و گرانی سامان و اشیاء میں ہوتی ہے۔ جب سامان کی قیمت زیادہ ہوتی ہے تو قیمت بڑھ جاتی ہے۔ اور جب سامان کی قیمت کم ہوتی ہے تو قیمت بھی کم ہو جاتی ہے۔ یہ کہنا کہ روپے کی قوت خرید کم ہو گئی ہے صحیح نہیں ہے۔

قرض کو اشاریہ اور دقیق فنی اصول سے وابستہ کرنا نہ شرعاً درست ہے نہ عملاً ممکن ہے۔ شرعاً تو اس لئے کہ یہ سود کی صورت ہوگی؛ کیوں کہ ایک ہی جنس کا اضافہ کے ساتھ تبادلہ ہے۔ نہیں تو کم از کم ربا کا شبہ تو ضرور پایا جا رہا ہے۔ اور آپ ﷺ نے ربا اور ریبہ دونوں سے منع فرمایا ہے، چنانچہ آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

”دع ما یریک الی ما لا یریک“ (ترمذی: ۲۵۱۸)۔

علامہ ابن ہمام فتح القدر میں لکھتے ہیں:

”شبهة الربا مانعة كحقيقة الرباء لإجماع علی منع بیع الأموال

الربویة مجازفة وإن ظن التساوی“ (فتح القدر: ۱۱)۔

عملاً اس لئے ممکن نہیں ہے کہ اشاریہ میں کس چیز کو بنیاد بنایا جائے گا؟ بعض مرتبہ اناج کی قیمت بڑھتی ہے لیکن سونے کی قیمت نہیں بڑھتی اور بعض مرتبہ اس کے برعکس ہوتا ہے۔ اسی طرح دوسری اشیاء کا معاملہ ہے یعنی قیمت کے گھٹنے و بڑھنے کا کوئی اصول نہیں ہے اور نہ یہ ضروری ہے کہ اگر ایک چیز کی قیمت گھٹ یا بڑھ گئی ہو تو دوسری چیز کی قیمت بھی اسی تناسب سے گھٹے یا بڑھے گی، اور اگر کوئی اشارہ بنا دیا گیا جیسا کہ حکومت ملازمین کی اجرت میں مہنگائی بھتہ کے اضافہ کے لئے بناتی ہے تو کرنسی کی قیمت میں ہر وقت کمی و بیشی کا عمل کرتے رہنا ہوگا، ظاہر ہے کہ یہ ذہنوں کو الجھا دینے والی اور باہمی نزاع کا باعث ہوگی، اس لئے اشاریہ کو معیار بنانا درست نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فقہاء نے گھٹتی و بڑھتی نرخ کا اعتبار نہیں کیا ہے۔

ردالمحتار میں ہے:

”وإن استقرض دائق فلوس أو نصف درهم فلوس ثم رخصت أو غلت لم يكن عليه إلا مثل عدد الذي أخذه..... ولا ينظر إلى غلاء الدراهم ولا إلى رخصها“ (رد المحتار ۷/۳۹۰)۔

(اگر کسی نے ایک فلوس کا دائق یا نصف درهم قرض لیا پھر بعد میں فلوس کی قیمت ارزاں یا گراں ہوگئی تو قرض خواہ پر اتنا ہی واجب ہوگا جتنا کہ اس نے لیا تھا، دراہم کے گراں ہونے اور ارزاں ہونے پر توجہ نہیں دی جائے گی)۔  
علامہ حسکفی لکھتے ہیں:

”استقرض من الفلوس الرائجة والعدالی فكسدت فعليه مثلها..... ولا يغرم قيمتها..... أنه مضمون بمثله فلا عبرة بغلائه ورخصه“ (الدر المختار مع رد المحتار ۷/۳۹۰)۔

(اگر کسی نے رائج اور عدالی فلوس قرض لیا پھر چلن بند ہو گیا تو قرض خواہ پر اس کا مثل واجب ہوگا تاوان میں اس کی قیمت ادا نہیں کرے گا، بلکہ اسی کے مثل کا ضامن ہوگا، چنانچہ اس کی گرانی و ارزانی کا اعتبار نہیں کیا جائے گا)۔

علامہ شامی اپنے رسالہ تنبیہ الرقودنی احکام النقود میں لکھتے ہیں:

”أن الفلوس إذا لم تكسد ولكن غلت قيمتها أو رخصت فعليه مثل ما قبض من العدد“ (مجموع رسائل ابن عابدین: تنبیہ الرقودنی احکام النقود: ۶۰)۔

اگر فلوس کا چلن بند نہ ہو، لیکن اس کی قیمت گھٹ یا بڑھ جائے تو قرض خواہ پر اتنی ہی مقدار واجب ہوگی جتنا کہ اس نے لیا ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ دقیق فنی اصول کو اپنانا اسلامی مزاج کے بالکل خلاف ہے، کیوں کہ اسلام میں سادگی ہے اور سادگی کو پسند کرتا ہے۔ باریک تشقیقات اور خواہ مخواہ کی موشگافیاں

اسلام کو پسند نہیں ہے۔ خصوصاً اس وقت جب کہ عوام الناس کے پریشان ہونے کا سبب ہو، حضور اکرم ﷺ کا یہ مشہور فرمان ہمارے سامنے ہے: نحن أمة أمية لا نكتب ولا نحسب (بخاری: ۲۵۶۱) کہ ہم امی جماعت ہیں حساب و کتاب نہیں جانتے، ہمارے خیال میں اس حساب و کتاب کا مطلب یہی ہے کہ باریک حسابات اور فنی تحقیقات جو عوام کی دسترس سے باہر ہوں وہ اسلام کو پسند نہیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام ہمیشہ ایسا اصول اپناتا ہے جس میں سادگی اور عوام و خواص دونوں کے لئے یکساں دلچسپی کا حامل ہو۔ نیز عرف عام میں بھی قرضوں اور واجبات کی ادائیگی خواہ کتنے ہی عرصہ بعد کیوں نہ ہوا اتنے ہی روپے ادا کی جاتی ہے جتنے روپے اس نے لئے تھے یا واجب تھے۔ لہذا اس عرف کا تقاضہ بھی یہی ہے کہ مثل ہی واجب کیا جائے۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ نوٹ میں کمی و بیشی کا اختیار کسی عام شخص کو حاصل نہیں ہو سکتا ہے بلکہ یہ اختیار حکومت وقت کو ہی حاصل ہو سکتا ہے۔ اور ہم دیکھتے ہیں کہ حکومت وقت بھی کرنسی نوٹ میں اضافہ کو تسلیم نہیں کرتی ہے؛ کیوں کہ اگر کوئی شخص بینک میں کچھ روپے جمع کرتا ہے دس بیس سال بعد اتنا ہی روپیہ واپس ہوتا ہے جمع شدہ اصل رقم میں کوئی اضافہ یا کمی نہیں ہوتی ہے۔ مثلاً بیس سال پہلے زید نے بینک میں پانچ سو روپے جمع کیا تھا بیس سال بینک وہی پانچ سو روپے واپس کرتا ہے۔ جو زائد رقم ہوتی ہے اس کا تعلق اصل رقم سے نہیں ہوتا ہے بلکہ یہ سود کے نام پر ملتا ہے۔ یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ حکومت کے نزدیک بھی نوٹ کی قیمت یکساں رہتی ہے خواہ اشیاء کے قیمت میں کتنا ہی اضافہ کیوں نہ ہو گیا ہو۔ مگر نوٹ اپنی حالت پر برقرار رہتا ہے۔

جہاں تک اس کا تعلق ہے کہ قرض دینے والے کا نقصان ہوگا اور اس کا حق مارا جائے گا نیز اس کے ساتھ عدل و انصاف نہیں ہو سکے گا، یہ اعتراض درست نہیں ہے، بلکہ علماء مثل لوٹانے کو ہی عین انصاف قرار دیتے ہیں، چنانچہ علامہ سرسی فرماتے ہیں:

”لأن المقصود هو الجبران وذلك في المثل أتم، لأن فيه مراعاة

الجنس والمالية وفي القيمة مراعاة المالية فقط فكان إيجاب المثل عدل“  
(الموطأ ۱۱/۵۰)۔

(اصل مقصود نقصان کی تلافی کرنا ہے اور یہ چیز مثل میں بدرجہ اتم موجود ہے اس لئے کہ اس میں جنس و مالیت دونوں کی رعایت ہوتی ہے اور قیمت کی صورت میں صرف مالیت کی رعایت ہوتی ہے اس لئے مثل واجب کرنا زیادہ قرین انصاف ہے)۔  
علامہ ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں:

”ولهذا كان من أوجب المثل في كل شئ بحسب الإمكان مع مراعاة القيمة أقرب إلى العدل ممن أوجب القيمة من غير المثل“ (مجموعہ فتاویٰ ابن تیمیہ: ۱۱/۳۵۲)۔

(اسی وجہ سے جنہوں نے حتی المقدور تمام چیزوں میں قیمت کی رعایت کے ساتھ مثل واجب قرار دیا ہے یہ عدل کے زیادہ قریب ہے بہ مقابلہ ان لوگوں کے جنہوں نے مثل کے بجائے قیمت کو واجب قرار دیا ہے)۔

فقہ کا مشہور قاعدہ ہے: الضرر الأشد يزال بالضرر الأخف (لأشياء لابن نجيم: ۱۳۳ مطبوعہ دار النشر والاشاعة) جب دو ضرر لاحق ہو تو اخف کو برداشت کیا جائے گا اشد کو چھوڑ دیا جائے گا، یعنی کسی معاملہ کا دورخ ہو اور دونوں رخوں میں سے ہر رخ میں ضرر کا پہلو ہو تو بڑے ضرر سے بچنے کے لئے چھوٹے ضرر کو برداشت کیا جائے گا، اس صورت میں اگرچہ قرض دینے والے کو ضرر لاحق ہو رہا ہے لیکن سود کے بڑے ضرر سے بچنے کے لئے اس کو برداشت کیا جائے گا۔

خلاصہ کلام یہ کہ قرض خواہ نے جتنا کرنسی نوٹ قرض لیا تھا قرض و ہندہ کو اتنا ہی واپس کرے گا اس میں تفاوت کسی طرح بھی درست نہیں ہے؛ کیوں کہ یہ سود کا ذریعہ ہوگا اور ظاہر ہے سود اسلام میں قطعاً حرام ہے، دوسرے یہ کہ دقیق فنی اصول اسلام کی سادگی کے خلاف ہے اور

عائدین کے باہمی نزاع کا سبب ہے۔ اور جو چیز مفضی الی النزاع ہو وہ درست نہیں ہے۔

۲۔ نوٹوں کی شکل میں دیئے ہوئے قرض کو سونے یا چاندی کی سالمیت میں طے کرنا اور بوقت ادائیگی اس قدر سونے یا چاندی کی قیمت کے مساوی نوٹوں کی ادائیگی پر معاملہ کرنا جائز نہ ہوگا، کیوں کہ یہ ربا کی صورت ہوگی، سوال میں مذکور صورت سود کی رقم کو جائز قرار دینے کا حیلہ ہے، اور حیلہ کے ذریعہ کسی حرام کو حلال نہیں کیا جاسکتا ہے۔ جہاں تک بات رہی مہر کی، تو اول مرحلہ میں ہی سونے یا چاندی میں مہر متعین کر لے۔ ادائیگی کے وقت عورت چاہے تو بازار کے نرخ کے مطابق سونے یا چاندی کی قیمت وصول کر لے یا سونا ہی وصول کر لے، اس میں شرعاً کوئی حرج نہیں ہے (واللہ تعالیٰ اعلم)۔

### خلاصہ بحث:

۱۔ قرض ادا کرنے میں مماثل لازم و ضروری ہے، کسی طرح کا کوئی تفاوت جائز نہیں ہے۔

۲۔ مؤخر مطالبات کو دقیق فنی اصول سے وابستہ کرنا کسی طرح بھی جائز نہیں ہے؛ کیوں کہ اس میں ربا کا شبہ ہے اور لوگوں کے لئے پریشانی کا سبب ہے۔

۳۔ نوٹوں کی شکل میں دیئے ہوئے قرض کو سونے یا چاندی کی سالمیت میں طے کرنا درست نہیں ہے۔

۴۔ مہر میں اول مرحلہ میں ہی سونا یا چاندی متعین کرنا درست ہے بلکہ افضل و مستحسن ہے، اور زوجین کے لئے آسانی کا باعث ہے۔



## جدید فقہی تحقیقات

[www.KitaboSunnat.com](http://www.KitaboSunnat.com)

چوتھا باب

مختصر تحریریں





## موجودہ کرنسی پر دو سوال اور اس کا حکم

مولانا زبیر احمد قاسمی ☆

۱- دوسرے فقہی سمینار منعقدہ ۸ تا ۱۱ دسمبر ۱۹۸۹ء میں جن دو سوالات کے متعلق فیصلہ نہ ہو سکا تھا ان دونوں سوالوں کے سلسلے میں اپنی رائے میں اسی سمینار میں پیش کر چکا ہوں جو میرے مفصل اور بہت حد تک مدلل مقالہ شائع شدہ فقہی مجلہ میں موجود ہے، اور میں نے جس رائے کا اظہار اس دن کیا تھا اس رائے سے پھیرنے والی کوئی دلیل اب تک میرے سامنے نہ آسکی۔ اس طرح میں آج تک اپنی سابقہ رائے پر قائم ہوں۔ اس دن میں نے وہی کہا تھا کہ یہ کاغذی نوٹ اگرچہ ذریعہ تبادلہ بن کر عرفی طور پر شمن بن چکا ہے لیکن درحقیقت یہ شمن نہیں بلکہ صرف وثیقہ شمن ہے۔ چنانچہ سب ہی حضرات کاغذی نوٹوں کا قدر نصاب اسی خلقتی شمن سونے چاندی کے قدر نصاب کے پیمانے سے ناپ کر کبھی پانچ ہزار روپے کے مالک کو مالک نصاب قرار دیتے تھے تو کبھی دس ہزار روپے کو نصاب کہتے تھے، اور اب تقریباً پندرہ ہزار سے بھی کچھ زائد روپے کے مالک پر مالک نصاب ہونے کا حکم لگاتے ہیں۔ اسی طرح سارے ہی لوگ آئے ہی دن اس طرح کا معاملہ کرتے رہتے ہیں کہ کسی کو ایک ہزار کا ایک کاغذی نوٹ دے کر اس کے بدلے میں سو روپے کے دس نوٹ لیتے ہیں، عوضین کی تعداد اور گنتی و شمار میں اس کھلے ہوئے فرق کے باوجود کسی کے حاشیہ خیال میں بھی ربوا ہو جانے کا شبہ تک نہیں ہوتا، تو آخر کیوں؟ صرف اسی

☆ اشرف العلوم کنہواں، سیتا مڑھی، بہار۔

وجہ سے ناکہ گوگنتی و شمار میں عوضین متفاوت ہیں مگر اپنی مالیت و قیمت میں دونوں برابر ہیں  
فلایکون ربوا۔

پھر وہ اللہ تعالیٰ جو ان غنی الاغنیاء ہے اس کے حق زکوٰۃ کے وجوب میں تو نوٹوں کی گنتی و شمار سے صرف نظر کرتے ہوئے اس کی قدر و قیمت اور مالیت پر نظر رکھتے ہوئے نوٹوں کا مختلف زمانے میں مختلف قدر نصاب مانتے اور منواتے آئے ہیں، لیکن یہ کیسی عجیب منطق ہے جو سمجھ میں نہیں آتی کہ اللہ کے ایک بندہ کے حقوق میں جو احوج لکھتا جین ہے ہم نوٹوں کی قدر و قیمت اور مالیت سے صرف نظر کر کے صرف گنتی و شمار میں برابری کو کیوں ضروری سمجھنے لگتے ہیں۔ اور ایسا کس بنیاد پر کہا جاتا ہے کہ دس سال پہلے جو دس ہزار کاغذی نوٹ کسی نے کسی سے قرض لیا تھا، اس کی ادائیگی آج دس سالوں بعد بھی بس گنتی و شمار میں برابر دس ہزار نوٹ سے ہی ہو جائے گی، شمار و گنتی میں اگر ایک زائد نوٹ کا بھی مطالبہ ہوگا تو اکل ربوا ہو جائے گا، واجباً، جب کہ دس ہزار نوٹ کی جو قیمت و مالیت دس سال پہلے تھی آج اس کی مالیت اس کے نصف کے برابر بھی نہیں رہ گئی ہے۔ اس لئے ہماری رائے میں مؤخر مطالبوں قرض و مہر وغیرہ کی ادائیگی میں نوٹوں کی محض گنتی و شمار پر نظر رکھنا اور اس کی حقیقی قدر و مالیت سے آنکھ بند کر لینا اسلام کے عادلانہ نظام کے خلاف ہے، عدل کا تقاضہ یہی ہے کہ قدر و قیمت میں مساوات کو مدنظر رکھا جائے صرف گنتی و تعداد میں نہیں۔ تو ظاہر ہے کہ اسے قیمتوں کے اشاریہ سے وابستہ کر کے اصل مقصد کو حاصل کرنا دشوار ہی ہوگا؛ بلکہ آسان تر صورت یہی ہو سکتی ہے کہ واجب الاداء نوٹوں کی مالیت سونے چاندی میں طے کر لیا جائے، اور بوقت ادائیگی اسی قدر سونے چاندی کے مساوی نوٹوں کی ادائیگی کو لازم کیا جائے، اس میں گویا ظاہر سو روپے کے بدلے پانچ سو روپے کی بھی ادائیگی ہو سکتی ہے مگر یہ تفاوت صرف شمار و گنتی میں ہوگا ورنہ درحقیقت سابقہ سو روپے اور یہ حالیہ پانچ سو روپے بالکل مساوی ہی ہوں گے، کما هو الظاهر، هذا ما عندی والعلم عند اللہ۔

## موجودہ کرنسی اور اس کی شرعی حیثیت

مفتی انور علی اعظمی ☆

۱۔ کیا مؤخر مطالبوں اور اجرتوں کی ادائیگی کو قیمتوں کے اشاریہ سے وابستہ کرنا ممکن ہے؟

مذکورہ سوال کا جواب دینے سے قبل ضروری ہے کہ افراط زر اور تفریط زر کی وضاحت کی جائے۔

موجودہ معاشی اصطلاح میں ”افراط زر“ کا مطلب یہ ہے کہ کسی ملک میں مستقل کرنسی کی مقدار اس ملک کی اشیاء اور خدمات کے مقابلہ میں زیادہ ہو جائے جس کے نتیجے میں اشیاء اور خدمات کی قیمت بڑھ جانے سے ملک میں مہنگائی پیدا ہو جائے؛ اس لئے کہ کسی ملک میں جاری شدہ کرنسی اشیاء اور خدمات میں طلب کی نمائندگی کرتی ہے اور ملک میں میسر اشیاء اور خدمات رسد کی نمائندگی کرتی ہیں اور جب رسد کے مقابلہ میں طلب زیادہ ہو جائے گی تو مہنگائی پیدا ہو جائے گی، یہ بات علم معاشیات کے بنیادی اصولوں کے ذریعہ واضح ہے۔

”تفریط زر“ کا مطلب یہ ہے کہ کسی ملک میں جاری شدہ کرنسی اشیاء اور خدمات کے مقابلہ میں کم ہو جائے جس کے نتیجے میں اشیاء اور خدمات کی قیمت کم ہو کر ارزانی پیدا ہو جائے؛

اس لئے کہ جب اشیاء طلب سے زیادہ ہو جاتی ہیں تو بھاؤ گر جاتا ہے اور قیمت کم ہو جاتی ہے۔  
افراط زر کے وقت روپے کی قوت خرید کم ہو جاتی ہے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ افراط زر  
کے وقت عدد کا اعتبار کرتے ہوئے جتنا روپیہ حق دار کا واجب تھا اتنا ہی ادا کرنے سے حق ساقط  
ہوگا یا روپے کی قوت خرید گھٹنے سے عددی مقدار بڑھا کر اس کی تلافی کرنا ضروری ہوگا؟

چونکہ کاغذی نوٹوں کی خود کوئی مستقل قیمت نہیں ہے ان کی قیمت اشیاء کے اعتبار سے  
متعین ہوتی ہے، اس لئے بعض ماہرین معاشیات اس مشکل کا حل نکالنے کے لئے یہ تجویز پیش  
کرتے ہیں کہ کرنسی کی قیمت متعین کرنے کے لئے قیمتوں کے اشاریہ کو معیار بنایا جائے اور تمام  
حقوق اور واجبات کی ادائیگی میں قیمتوں کے اشاریے کے ساتھ کرنسی کی قیمت کے تعلق کو بنیاد  
بنایا جائے اور مالی سال کے شروع میں ان اشیاء کی جو قیمت رائج ہو وہ درج کی جائے اور پھر  
سال کے اخیر میں جو قیمت رائج ہو وہ درج کی جائے اور دونوں نرخوں اور قیمتوں کے درمیان جو  
فرق ہو اس کا تناسب نکالا جائے اور اسی تناسب سے نوٹوں کی قیمت میں تغیر مانا جائے۔

قرضوں کو قیمتوں کے اشاریے سے منسلک کرنے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ قرض دار قرض  
خواہ کو صرف قرض کے برابر روپے واپس نہ کرے بلکہ قیمتوں کے اشاریے میں اشیاء کی قیمتوں  
میں جس تناسب سے اضافہ ہوا ہے اسی تناسب سے قرض میں اضافہ کے ساتھ واپس کرے۔  
بعض ماہرین معاشیات اس کے جواز کے لئے یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ یہ زیادتی جو قرض دار  
قرض خواہ کو دے رہا ہے یہ حقیقی زیادتی نہیں ہے بلکہ یہ اسی مالیت کو واپس کر رہا ہے جو قرض دار  
نے بطور قرض اس سے لیا تھا، لیکن صحیح بات یہ ہے کہ اس زیادتی کو جائز سمجھنے والوں کی یہ دلیل شرعی  
قواعد و اصول سے میل نہیں کھاتی؛ اس لئے کہ شریعت اسلامیہ میں قرضوں کو اسی مقدار کے مثل ادا  
کرنا واجب ہے اس میں کسی کو اختلاف نہیں۔ جو لوگ قرضوں کو قیمتوں کے اشاریے سے جوڑنے  
کو صحیح مانتے ہیں وہ بھی اس بات کو تسلیم کرتے ہیں؛ لہذا صرف مسئلہ یہ ہے کہ مثل سے کیا مراد

ہے؛ مثل (ناپ، وزن، عدد) میں برابری مراد ہے یا قیمت اور مالیت میں برابری ضروری ہے۔ چنانچہ قرآن و سنت کے دلائل میں غور کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ قرض کی واپسی میں جو برابری شریعت میں مطلوب ہے وہ مقدار اور قیمت کی برابری ہے قیمت اور مالیت کی برابری نہیں۔ چنانچہ صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں حضرت ابو سعید خدریؓ سے یہ روایت منقول ہے کہ حضور اقدس ﷺ کے زمانہ میں ہمارے پاس ہر قسم کی ملی جلی کھجوریں آیا کرتی تھیں۔ ہم گھٹیا کھجور کے دو صاع عمدہ کھجور کے ایک صاع کے بدلہ میں بیچ دیتے تھے۔ آپ ﷺ کو اطلاع ہوئی تو آپ ﷺ نے کہا کہ دو صاع کھجور ایک صاع کے بدلہ میں نہ بیچو۔ حالانکہ حضور ﷺ کو یہ بات معلوم تھی کہ جو کھجور دو صاع کے بدلہ میں بیچی جائے گی وہ دو صاع دالی کھجور کے مقابلہ میں زیادہ قیمتی ہوگی؛ لیکن اس کے باوجود اللہ کے رسول ﷺ نے اس کی اجازت نہیں دی؛ بلکہ مقدار اور ناپ میں مماثلت اور برابری کا حکم دیا، اور قیمت کے فرق کا اعتبار نہیں کیا۔

یہ روایت اس بات کی واضح دلیل ہے کہ اموال ربویہ میں مماثل اور یکسانیت مقدار میں مطلوب ہے قیمت میں نہیں۔

چونکہ قیمتوں کا اشاریہ اپنے تمام مراحل میں اندازہ اور تخمین پر مبنی ہے اگر کسی جگہ حساب بہت باریک بینی اور پوری احتیاط سے کیا جائے تو اس کے نتیجہ کو زیادہ سے زیادہ تقریبی کہا جاسکتا ہے یقینی اور واقعی نہیں کہا جاسکتا؛ جب کہ احادیث کی روشنی میں واضح ہے کہ قرضوں کی واپسی میں انکل اور اندازہ کی شرط لگانا جائز نہیں لہذا قرضوں کی ادائیگی کو قیمتوں کے اشاریہ سے وابستہ کرنا کسی حال میں جائز نہیں۔ چنانچہ مولانا محمد تقی عثمانی تحریر فرماتے ہیں: تمام مالی معاملات میں قیمتوں کے اشاریہ کو عمل میں لانا ایک ایسا فعل ہے جس کا حصول عملاً ناممکن ہے (کرنسی کی قوت خرید، ص ۷۰)۔

اور اس طرح اشاریہ کو بنیاد بنا کر لین دین کی اجازت دینا عامۃ الناس میں مستقل

تنازع کا باعث ہے نیز اس طرح ایک سو روپے کے بدلہ پانچ سو روپے کی ادائیگی باب ربا کو کھولنے کا ذریعہ یقیناً بنے گی (بحوالہ کرنسی کی قوت خرید تکملہ فتح المہم ج ۱، ودرس ترمذی ج ۴، مولفات مولانا مفتی محمد تقی عثمانی)۔

۲- سونا یا چاندی کی قیمت کے مساوی نوٹوں کے ذریعہ واجب الاداء قرضوں کی ادائیگی؟

اس سوال کے جواب کی بنیاد یہ ہے کہ مہر کے تقرر یا ادھار فروختگی کے وقت حق دار پر جو چیز ذمہ میں واجب ہے وہ نوٹ ہے یا سونا چاندی، سوال سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بنیادی طور پر حقدار کے ذمہ جو چیز واجب الاداء ہے وہ نوٹ ہے۔ اور مستقبل کے اس خدشہ کے پیش نظر کہ نوٹوں کی اپنی کوئی مستقل قیمت نہیں ہوتی بلکہ نوٹ کی قیمت اشیاء ضروریہ کی قوت خرید ہے، جانبن اپنے اس خدشہ کو دور کرنے کے لئے نوٹ کی مقدار سونے یا چاندی کے ساتھ مقید کرتے ہیں۔ اس مسئلہ کا ایک آسان حل یہ ہے کہ درمیان سے نوٹ کا ذکر ہی نکال دیا جائے اور مہر کا تقرر سیدھے سیدھے ثمن حقیقی سونے یا چاندی میں کیا جائے۔ اسی طرح ادھار فروختگی کے لئے نوٹ کا ذکر کئے بغیر سونے اور چاندی کو طے کر دیا جائے۔ ایسا کرنے میں نہ کوئی شرعی رکاوٹ ہے اور نہ کوئی جھگڑا۔ لیکن نوٹ متعین کر کے اس کی موخر ادائیگی کو سونے یا چاندی کے ساتھ مقید کرنا نزاع کا باعث بھی ہے اور شرعی قاعدہ کے خلاف بھی؛ اس لئے کہ جب اس کے ذمہ نوٹ کی ایک مقدار طے ہے تو اس کی ادائیگی میں شرعی ضابطہ کے مطابق عدد میں مماثلت ضروری ہے۔ ایسی چیزوں میں قیمت اور مالیت کو بنیاد بنا کر کمی بیشی کرنا شرعاً درست بھی نہیں اور سود کا دروازہ کھولنا ہے۔

واللہ اعلم بالصواب۔

## موجودہ کرنسی کی شرعی حیثیت

مفتی محمد ثناء الہدیٰ قاسمی ☆

علم معاشیات میں کاغذی نوٹ اور کرنسی کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے، ایک کو زر معیاری اور دوسرے کو غیر زر معیاری کہتے ہیں، زر معیاری تو وہ ہے جس کے عوض رزرو بینک آف انڈیا یا دوسرے بینکوں نے اتنی ہی مالیت کا سونا محفوظ کر رکھا ہے، زر معیاری کی حد تک کرنسی کی حیثیت ثمن کی نہیں، وثیقہ ثمن کی ہے۔ اسلئے ایک روپے کے نوٹ یا سکہ کو چھوڑ کر کاغذ کے تمام کرنسی پر ہندوستان میں لکھا ہوتا ہے:

”میں دھارک کو..... دینے کا وچن دیتا ہوں۔“

ہندوستان کی حد تک صرف ایک روپے کا نوٹ غیر معیاری زر سمجھا جاتا تھا، جس پر ایسی کوئی تحریر نہیں ہوتی تھی اور نہ ہی اس کے عوض از روئے بینک کوئی سونا مختص کرتا تھا، لیکن اب صورت حال بدل گئی ہے، آج کے گلوبل ایج میں اور بڑھتی ہوئی ضرورتوں کے پیش نظر بینک نے غیر معیاری زر کے انداز میں دوسرے نوٹ بھی چھاپنے شروع کر دیے، جس کے نتیجے میں افراط زر کی صورت حال پیدا ہوگئی، اس لئے اب ان کی حیثیت وثیقہ کی نہیں، ثمن اصطلاحی کی ہے۔ البتہ اس کی حقیقی قدر متعین کرنے کے لئے سونا چاندی آج بھی معیار ہے اور ماہرین معاشیات کی طرف سے مقرر کردہ اندازہ پر مبنی اشاریہ، بڑی حد تک آج بھی اسی پر منحصر ہے۔

☆ نائب ناظم امارت شرعیہ، بہار اڑیسہ و جھارکھنڈ۔



۱- اس صورت حال کے باوجود، دیون یعنی موخر مطالبوں مثلاً قرض، مہر، پنشن، ادھار خریداری کی رقم اور وقت پر ادا نہ ہونے والی تنخواہوں کی ادائیگی کو قیمتوں کے اشاریہ سے وابستہ کرنا صحیح نہیں ہوگا، بلکہ محض عددی و صوری مساوات کی وجہ سے ایک کو دوسرے کا مثل تسلیم کیا جائے گا، اس لئے کہ قرض کی ادائیگی میں مماثل لازم و ضروری ہے خواہ قرض لینے اور ادائیگی کے وقت کی قوت خرید میں زمین و آسمان کا فرق ہی کیوں نہ ہو جائے، بلغة السالک میں ہے: "أخذ بمثله ولا ينظر للسعر الراجع" (بلغة السالک ۲/۲۱۲)، قرض کے مثل لیا جائے گا اور بڑھی ہوئی قیمت پر توجہ نہیں دی جائے گی، علامہ نوویؒ لکھتے ہیں:

"إذا أقرض شيئاً له مثل كالحبوب والادھان والدرھم والدينار وجب على المقرض رد مثلها لأنه أقرب إليه" (شرح المہذب ۱۲/۲۱۵)۔  
 (جب قرض مثلی چیز لیا ہو، جیسے دانہ، تیل، درہم و دینار تو قرض دار پر اس کے مثل لوٹانا واجب ہے، اس لئے کہ یہی قرض لی گئی اشیاء کے زیادہ قریب ہے)۔  
 ابن قدامہ نے المعنی میں لکھا ہے:

"إن المستقرض يرد المال في المثليات سواء رخص سعره أو غلا أو كان بحاله ولو كان ما أقرضه موجوداً بعينه فرده من غير عيب يحدث فيه لزوم قبوله سواء تغير سعره أو لم يتغير" (المعنی ۳/۳۶۵)۔

(قرض دار مثلیات میں مثل ہی واپس کرے گا خواہ قیمت کم ہوگئی ہو، بڑھ گئی ہو یا علی حالہ ہو، اگر قرض لی جانے والی چیز بعینہ موجود ہو تو بغیر عیب کے اس کو لوٹا دے تو قرض دہندہ کے لئے اسی سامان کو قبول کرنا لازم ہے خواہ اس کی قیمت میں تبدیلی ہوئی ہو یا نہ ہو)۔

یہیں سے یہ بات بھی سمجھ میں آتی ہے کہ عامۃ الناس کے درمیان ادائیگی کے لئے ایسے معیار مقرر کرنا جن کی بنیاد دقیق فنی اصولوں پر ہو، صحیح نہیں ہے، اور یہ مستقل مفصلی الی النزاع ہے، پھر

گھٹی بروہتی قیمتوں کی وجہ سے سود خوری کے دروازے کھلنے کا یقین ہے۔ اسی لئے فقہاء نے فلوس کی قدر کی کمی بیشی کا دیون یعنی مؤخر مطالبوں میں اعتبار نہیں کیا ہے۔ ردالمحتار میں ہے:

”وان استقرض دائق فلوس أو نصف درہم فلوس ثم رخصت أو غلت لم یکن علیہ إلا مثل عدد الذی أخذہ ..... ولا ینظر إلی غلاء الدراہم ولا إلی رخصہا“ (رد المحتار ۷/۳۹۰)۔

(اگر کسی نے فلوس کا دائق یا نصف درہم فلوس لیا، پھر قیمت گر گئی یا مہنگی ہو گئی تب بھی قرض دار پر اسی عدد کے بقدر واجب ہوگا جتنا اس نے لیا، درہم کی قیمت کے کم و بیش ہونے کا اعتبار نہیں ہوگا)۔

اب اگر جو روپیہ لیا گیا تھا، وہ بند ہو جائے یعنی حکومت نے اس کی جگہ دوسری کرنسی کو رواج دے دیا، اس صورت میں بھی وہ پرانی کرنسی کی موجودہ قیمت نہیں دے گا، بلکہ قرض خواہ پر اس کا مثل واجب ہوگا، پرانی کرنسی کے مہنگے یا سستے ہونے کا اعتبار اس صورت میں بھی نہیں ہوگا۔

”استقرض من الفلوس الرابحة والعدالی فکسدت فعلیہ مثلہا ولا یغرم قیمتہا ..... انه مضمون بمثلہ فلا عبرة بغلائہ ورخصہ“ (الرد المحتار علی رد المحتار ۷/۳۹۰)۔

حکومت جن کی پالیسیاں کرنسی کی قدر و قیمت پر اثر انداز ہوتی ہیں اور بینک جو تمام مالیاتی نظام کو کنٹرول کرتا ہے وہ بھی کرنسی کی قدر و قیمت کے بڑھنے گھٹنے کا اعتبار نہیں کرتا، اسی وجہ سے جمع شدہ رقم ہی بینک واپس کرتا ہے اور جو زائد رقم دیتا ہے وہ انٹرسٹ یا سود کے نام پر دیتا ہے۔

اس پوری صورت حال کا تجزیہ کرنے کے بعد عام ذہنوں میں ایک اشکال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قرض دینے والے کے حق کی رعایت اس میں نہیں کی گئی ہے جو عدل و انصاف کے خلاف ہے، علماء و فقہاء کی عام رائے یہ ہے کہ مثل لوٹانا ہی عدل و انصاف ہے، بصورت دیگر سود اور ربا کا بازار گرم ہوگا اور یہ اسلام کی نظر میں ظلم ہے، اللہ رب العزت نے سودی معاملوں کے ذکر کے بعد فرمایا کہ نہ تم

پر کوئی ظلم کرے اور نہ تم کسی پر ظلم کرو: ”لَا تَظْلِمُونَ وَلَا تُظْلَمُونَ“، علامہ سرسی فرماتے ہیں:

”لأن المقصود هو الجبران وذلك في المثل أتم لأن فيه مراعاة الجنس والمالية وفي القيمة مراعاة المالية فقط فكان إيجاب المثل أعدل“ (المبسوط ۵/۱۱۰)۔

(مقصود نقصان کی تلافی ہے اور وہ مثل کی واپسی میں بدرجہ اتم ہے؛ اس لئے کہ اس صورت میں جنس اور مالیت دونوں کی رعایت ہے؛ جبکہ قیمت دینے میں صرف مالیت کی رعایت ہے، اس لئے مثل کا وجوب زیادہ انصاف کے قریب ہے)۔

۲- مہر کا سونے یا چاندی میں ابتداء متعین کرنا درست ہے، ادھار فروختگی کے وقت طرفین سونے چاندی میں ٹمن طے کرنا۔ اس میں بھی کوئی قباحت نہیں ہے، کیونکہ یہ دونوں معاملے قرض کے نہیں ہیں گوان پر دیون یعنی متاخر مطالبوں کا اطلاق ہوتا ہے۔ نوٹوں کی شکل میں دئے ہوئے قرض کی مالیت اگر سونے چاندی میں معاملہ کے وقت ہی طے ہو جائے کہ اس روپے کے بدلے میں اس قدر سونالوں گا، تو یہ بیع سلم میں بیع کی ادائیگی کو مؤخر کرنے جیسا ہوگا اور بیع سلم کے متعلق فقہاء نے جن شرائط کا ذکر کیا ہے، ان کی پابندی لازم اور ضروری ہوگی، ہذا ما عندی واللہ تعالیٰ اعلم۔

## موجودہ کرنسی اور شرعی نقطہ نظر

مولانا محمد جعفر علی رحمانی ☆

دیون کو سونے چاندی کی قیمتوں کے اشاریہ سے وابستہ کرنا:

۱- دیون یعنی مؤخر مطالبوں، مثلاً قرض، مہر، پنشن، ادھار خرید فروخت کی رقم اور وقت پر ادا ہونے والی تنخواہوں کی ادائیگی کو سونے یا چاندی کی قیمتوں کے اشاریہ سے وابستہ کرنا، مستقل باہمی تنازعہ کا موجب ہے، وہ اس طرح کہ دیون کو سونے چاندی کی قیمتوں کے اشاریہ سے وابستہ کرنا دقیق فنی بنیادوں پر قائم ہے، عامۃ الناس کے لئے اس پر عمل ممکن نہیں، نیز ہو سکتا ہے کہ جس دن مستقرض بشکل روپیہ قرض لے، اس روز سونے چاندی کے مارکیٹ بند ہوں، جس کی وجہ سے بوقت وصولی قرض اس کی اصل قیمت معلوم نہ ہو سکے، اور بعد میں جب مقرض و مستقرض ان پر روپیوں کی مالیت کو سونے یا چاندی کی قیمتوں کے اشاریہ کے ساتھ وابستہ کرنا چاہے، تو دونوں میں اختلاف پیدا ہو، کہ جس وقت میں نے روپے آپ کو بطور قرض دیئے، اس وقت سونے یا چاندی کی یہ قیمت تھی، جس کی وجہ سے میں اس قدر سونے یا چاندی کی قیمت کا حق دار ہوں، اور مستقرض سونے یا چاندی کی قیمت اس سے کم بتلائے، جس کی وجہ سے آپس میں تنازعہ کھڑا ہو۔

نیز دیون کو سونے چاندی کی قیمتوں سے وابستہ کرنا باب ربوا کو کھولنے کا ذریعہ ہے، وہ

☆ جامعہ اشاعت العلوم اکل کوا، مہاراشٹر۔

اس طرح کہ مثلاً آج بتاریخ ۸/۱۱/۱۳۳۱ھ کو زید "۱۷۲۰۰" روپے بکر کو ایک سال کی مدت ادائیگی پر بطور قرض دے دے، جس کی مالیت ایک تولہ سونے کے بقدر ہے، اب ممکن ہے کہ جب ایک سال پورا ہو جائے، تو سونے کے دام بڑھ کر "۲۰۰۰۰" روپے فی تولہ ہو جائے، اس صورت میں بکر پر "۱۷۲۰۰" روپے کی ادائیگی لازم ہونے کے بجائے "۲۰۰۰۰" روپے کی ادائیگی لازم ہوگی، یعنی قرض پر حاصل کردہ "۱۷۲۰۰" روپے پر "۲۸۰۰" زائد دینے ہوں گے، اور یہ سود ہے۔

اور یہ بھی ممکن ہے کہ ایک سال پورا ہونے پر سونے کے دام گھٹ کر "۱۶۰۰۰" فی تولہ ہو جائے، اور اس صورت میں بکر پر "۱۷۲۰۰" کی ادائیگی لازم ہونے کی بجائے "۱۶۰۰۰" کی ادائیگی لازم ہو، یعنی قرض پر حاصل کردہ "۱۷۲۰۰" میں "۱۲۰۰" کم دینے ہوں گے۔

سونے چاندی کی قیمت میں اس کی بیشی کے احتمال کی وجہ سے، قرض کی ادائیگی میں روپیوں کی مقدار موہوم ہے، یعنی ہو سکتا ہے کہ جو مقدار قرض میں لی اس سے زیادہ ادا کرنی پڑے، اور یہ بھی امکان ہے کہ جو مقدار قرض میں لے لی اس سے کم دینی پڑے، اور یہ قمار ہے۔

خلاصہ کلام یہ کہ دیون کو سونے چاندی کی قیمتوں کے اشاریہ سے وابستہ کرنا عامۃ الناس کے لیے قابل عمل نہیں ہے، اور یہ ربوا و قمار کے دروازے کو کھولنے کا ذریعہ بن سکتا ہے؛ جب کہ فقہ کا قاعدہ ہے کہ ممنوع کا ذریعہ بھی ممنوع ہوا کرتا ہے۔

۲- اس صورت کا حکم بھی وہی ہے جو پہلی صورت کا ہے، البتہ اگر مہر وغیرہ کا تقررین سونایا چاندی میں کیا جائے، اور ادائیگی کے وقت وہی مقررہ مقدار یا روپیوں کی شکل میں اس کی جو قیمت بھی بنتی ہو، اس کو ادا کیا جائے، تو یہ بلا تاویل جائز و درست ہوگا۔

## دلائل:

قرآن کریم: ”أحل الله البيع وحرم الربوا“ (سورة البقرة: ۲۵۷)۔  
 صحیح مسلم: عن جابر قال: ”لعن رسول الله ﷺ أكل الربا وموكله  
 و كاتبه وشاهديه، وقال: هم سواء“ (۲/۲۷۷، مکتبہ بلال دیوبند)۔  
 تنویر الابصار مع الدرر والرد: الربا شرعاً فضل خال عن عوض بمعیار شرعی  
 مشروط لأحد المتعاقدين فی المعاوضة“ (تنویر ۷/۳۹۸-۴۰۱، دار الکتب العلمیة بیروت)۔  
 تبیین الحقائق والرمز والبحر والنهر: هو فضل مال بلا عوض فی معاوضة مال  
 بمال (۳/۴۳۶، رمز الحقائق شرح کنز الدقائق ۲/۳۲، البحر الرائق ۶/۲۰۷، النهر الفائق ۳/۴۶۹، کتاب  
 البیوع، باب الربوا)۔

قرآن کریم: ”إنما الخمر والميسر والأنصاب والأزلام رجس من عمل  
 الشيطان فاجتنبوه لعلكم تفلحون“ (سورة المائدة: ۹۰)۔  
 رد المحتار: لأن القمار من القمر الذي يزداد تارة وينقص أخرى، وسمى  
 القمار قماراً لأن كل واحد من المقامرين ممن يجوز أن يذهب ماله إلى  
 صاحبه، ويجوز أن يستفيد مال صاحبه، وهو حرام بالنص (۹/۵۷۷، کتاب  
 الحظر والاباحة، باب الاستبراء، فصل فی البيع)۔

معجم لغة الفقهاء: القمار تعليق الملك على الخطر، والمال من الجانبين  
 (ص: ۳۶۹)۔

بدائع الصنائع: الوسيلة إلى الحرام حرام (۲/۴۸۸)۔

شامی: ما كان سبباً لمحظور فهو محظور (۵/۲۲۳، مکتبہ نعمانیہ)۔

## خلاصہ:

- ۱- دیون کو سونے چاندی کی قیمتوں کے اشاریہ سے وابستہ کرنا عامۃ الناس کے لیے قابل عمل نہیں ہے، اور ربوا و قمار کے دروازے کو کھولنے کا ذریعہ ہے۔
- ۲- دوسری صورت کا حکم بھی پہلی صورت ہی کی طرح ہے، البتہ اگر مہر وغیرہ کا تقرر عین سونایا چاندی میں کیا جائے، اور ادائیگی کے وقت مقررہ مقدار یاروپوں کی شکل میں اس کی جو قیمت بھی بنتی ہو، اس کو ادا کیا جائے، تو یہ عمل بلا تامل جائز و درست ہوگا۔

## کرنسی کی شرعی حیثیت

ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی ☆

احقر کے نزدیک ان کرنسیوں کی وہی حیثیت ہے احادیث کے اعتبار سے جو شمن خلعتی کی

ہے۔

حضرت مولانا تقی عثمانی کا ایک تفصیلی مقالہ جس پر حضرت نے اس سلسلہ کی بڑی مفید اور بیش بہا معلومات پیش کی ہیں جس کا ایک اقتباس پیش خدمت ہے: ”اس طرح اب سونا کرنسی کے دائرہ سے بالکل خارج ہو چکا ہے اور اب سونے کا کرنسی سے کوئی تعلق باقی نہیں رہا اور نوٹوں اور زر علامتی (یعنی کم قیمت کے سکوں) نے پوری طرح سونے کی جگہ لے لی ہے، اب نوٹ نہ سونے کی نمائندگی کرتے ہیں نہ چاندی کی؛ بلکہ ایک فرضی قوت خرید کی نمائندگی کرتے ہیں۔ حضرت عثمانی صاحب نے اس مسئلہ پر مسند احمد کے مرتب اور شارح علامہ احمد ساعاتی کی ایک تحریر پیش کی ہے:

”فالذی اراه حقا أو دین الله علیہ أن حکم الورق المالی کحکم النقدين وفي الزکاة سواء بسواء لأنه يتعامل به كالنقدين تماماً ولأن مالکة يمكنه صرفه وقضاء مصالحه به فی أي وقت شاء فمن ملک النصاب من الورق المالی ومکث عنده حولا كاملا وجبت علیه زکاته“ (فقہی مقالات ۱/۲۳)

☆ شیخ الحدیث و پرنسپل جامعہ دارالعلوم مئو۔



(میرے نزدیک صحیح بات جس پر میں اللہ تعالیٰ کے حضور جوابدہ ہوں یہ ہے کہ زکاۃ کے وجوب اور اس کی ادائیگی کے مسئلہ میں ان کاغذی نوٹوں کا حکم بھی بعینہ سونے چاندی کے حکم کی طرح ہے، اس لئے کہ لوگوں میں ان نوٹوں کا لین دین بالکل اسی طرح جاری ہے جس طرح سونے چاندی کا لین دین رائج ہے اور ان نوٹوں کے مالک کو اس کا بالکل اختیار ہے کہ وہ جس وقت چاہیں ان کو خرچ کریں اور ان کے ذریعہ اپنی ضروریات پوری کریں؛ لہذا جو شخص نصاب کے بقدر ان نوٹوں کا مالک بن جائے اور اس پر ایک سال گزر جائے تو اس پر زکوٰۃ واجب ہو جائے گی)۔

حضرت مولانا اختر امام عادل صاحب کا ایک مقالہ اس موضوع پر ہے جس پر موصوف نے کرنسیوں کی تاریخ رقم کرنے کے بعد لکھا ہے: ”عملی طور پر شہری کو سونا چاندی کے سکوں کی طرح نوٹ قبول کرنے پر مجبور کر دیا گیا اس سے بظاہر معلوم پڑتا ہے کہ نوٹ نے ترقی کر کے مستقل ثمن عرفی کے حکم کی حیثیت حاصل کر لی ہے۔“

ڈاکٹر یوسف قرضاوی کرنسی کو مستقل ثمن قرار دینے کی بابت کئی دلائل ذکر کرنے کے

بعد لکھتے ہیں:

نوٹوں کا جب آغاز ہوا تو ان کی زکاۃ کے بارے میں اختلاف ضرور پیدا ہوا اور اس قسم کا اختلاف ہر نئی چیز کے بارے میں پیدا ہوتا رہتا ہے لیکن آج صورت حال بالکل بدل گئی ہے، آج ان کاغذی سکوں نے ہر ملک میں ڈھلے ہوئے سکوں کی جگہ لے لی ہے اور سماج کے تمام کام انہیں کے ذریعہ انجام پاتے ہیں مثلاً مہر کی ادائیگی نوٹوں کے ذریعہ ہوتی ہے اور اس پر شرعاً کوئی اعتراض وارد نہیں ہوتا، اشیاء کی قیمت بلا نزاع انہیں کے ذریعہ چکائی جاتی ہے، مزدور کو اجرت میں نوٹیں ہی دی جاتی ہیں اور وہ ان کو قبول کرنے سے انکار نہیں کرتا، جو شخص نوٹیں چراتا ہے وہ چوری کی سزا کا بلا اختلاف مستحق قرار پاتا ہے، اسی طرح نوٹوں کا جو شخص ایک خاص مقدار میں مالک ہوتا ہے اسے غنی شمار کیا جاتا ہے، ان حقائق کے پیش نظر نوٹوں کی حیثیت شرعی نقدی کی قرار

پاتی ہے لہذا یہ کس طرح جائز ہوگا کہ ہم فقراء و مساکین و دیگر مستحقین کو اس سے محروم رکھیں (فقہ الزکاۃ از شیخ پیرزادہ ۱۹۸)۔

حاصل کلام:

کرنسی ”نوٹ کیش“ احادیث میں وہی حکم رکھتی ہے جو ثمنِ خلقی (سونا، چاندی) رکھتا ہے؛ اس لئے اس کے ذریعہ تمامی معاملات درست و صحیح ہو جائیں گے۔ مزکی کی زکوٰۃ صحیح ہو جائے گی؛ خواہ زکوٰۃ لینے والے نے اسے اپنے مصروف میں استعمال کیا ہو یا نہ کیا ہو۔

## موجودہ کرنسی کی شرعی حیثیت

مولانا ابوسفیان مفتاحی ☆

۱- الجواب وباللہ التوفیق: کاغذی نوٹوں کی اگرچہ اپنی ذاتی کوئی قیمت نہیں مگر جب ان نوٹوں کو اصل سونے یا چاندی کا متبادل و بدل قرار دے دیا گیا تو یہ نوٹ اپنے مبادل منہ کا حکم فی الجملہ اختیار کر لیں گے اور ان پر وہی احکام جاری ہوں گے، یعنی کسی آدمی کے پاس نہ تو سونے کا نصاب مکمل ہے نہ چاندی کا لیکن دو تولہ سونا ہے اور چالیس تولہ چاندی ہے تو ادائیگی زکوٰۃ کے لئے دو تولہ سونے کو چاندی کے ساتھ ضم کر دیں گے اور ۴۰ تولہ چاندی کو موجودہ کرنسی نوٹ سے متبادل کر دیں گے، اگر متبادلہ کے بعد چاندی کا نصاب مکمل ہو جاتا ہے تو ادائیگی زکوٰۃ فرض ہو جاتی ہے تو ظاہر ہے کہ نوٹ و موجودہ کرنسی نے چاندی کا حکم لے لیا اور اسی اعتبار سے زکوٰۃ کی ادائیگی فرض قرار دی گئی۔

اور یہ کہنا کہ اس کی قوت خرید تیزی سے گر جاتی ہے صحیح نہیں ہے، یہ ایک قسم کا مغالطہ ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ چیزوں کی قیمت بڑھ جانے کی وجہ سے چیزوں کے خریدنے میں گرانی کے اعتبار سے زیادہ نوٹ دینے پڑتے ہیں۔ اور اسی گرانی کے اعتبار سے دیون مؤخر مطالبوں مثلاً قرض، مہر، پیشن وغیرہ میں بھی دیون کی مالیت کے اعتبار سے زائد نوٹ دینے پڑیں گے۔ واللہ اعلم، نیز یہ تعبیر کہ نوٹوں کی قیمتیں بڑھتی ہیں، میرے کے خیال میں درست نہیں، بلکہ درحقیقت

اشیاء کی قیمتوں میں کمی زیادتی ہوتی ہے؛ اس لئے دیون میں نوٹ لیے یا طے کئے گئے ہیں تو بعینہ وہی نوٹ یا اس کے مثل کی ادائیگی واجب ہوگی۔ قرض میں ایک سو روپے کا نوٹ دے کر اس کے بدلہ میں ۵۰۰ کا نوٹ لینا ناجائز اور سود ہوگا، اس لئے اس فتنہ و فساد کے دور میں پہلے سے اس کی قیمت سونے یا چاندی کے وزن کے ساتھ متعین کر دینا ضروری ہے۔ ادائیگی کے وقت خواہ سونا یا چاندی دے دی جائے خواہ اس کے مساوی و برابر نوٹ دے دیے جائیں یہ صورت بلاشبہ جائز و درست ہے۔

قرض، مہر، پنشن وغیرہ ادھار معاملات میں سونا چاندی ہی معیار ہیں؛ اس لئے کہ معیار صرف وہی چیز بن سکتی ہے جو تغیر و تبدل سے پاک ہو۔ دوسرے تمام سامان چند دنوں کے بعد تغیر و تبدل کا شکار ہونے لگتے ہیں، اس کے برخلاف سونا چاندی عام طور پر تغیر و تبدل سے پاک رہتے ہیں، اسی بنا پر سونا اور چاندی کو نقد و ثمن قرار دیا گیا ہے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ اگر کوئی دوسری چیز بطور سکہ کے لوگوں میں رائج ہو جائے اور وہ بھی اس طرح ذریعہ تبادلہ قرار دیا جائے جس طرح کہ سونا چاندی تو نقد کا اطلاق اس پر درست ہوگا یا نہیں؟

ضابطہ کی بات تو یہی ہے کہ اس وقت اس پر بھی نقد و ثمن کا اطلاق درست ہے، البتہ یہ فرق ضرور ہے کہ سونا چاندی ثمن خلقتی ہیں، اور نوٹ ثمن عرفی، چنانچہ مالکیہ کا مشہور مذہب اور حنفیہ کا مسلک یہی ہے۔

امام مالکؒ نے تو یہاں تک فرمایا ہے کہ اگر چہڑا کو بھی اس حیثیت سے رواج مل جائے تو وہ ثمن ہو جائے گا؛ چنانچہ المدونۃ الکبریٰ (۱۰۴/۷) میں ہے: "ولو أن الناس أجازوا بينهم الجلود حتى يكون لها سكة وعین لكرهتها أن تباع بالذهب والورق فنظرة" یعنی اگر لوگوں کے درمیان چہڑے کے ذریعہ خرید و فروخت اس قدر رواج پا جائے کہ وہ

چھڑاٹمن اور سکہ کی حیثیت اختیار کر جائے تو اس صورت میں میرے نزدیک سونے چاندی کے ذریعہ اس چھڑے کو ادھار فروخت کرنا جائز نہیں۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ دیون یعنی مؤخر مطالبوں مثلاً قرض، مہر، پنشن وغیرہ ادا کرنے کے وقت پر جو کرنسی نوٹ کی حیثیت ہوگی اسی سے ادا ہوگی، اور باب ربوا کا کھلنا ایک قسم کا مغالطہ ہے، واللہ اعلم۔

۲- الجواب وباللہ التوفیق: نوٹوں کی شکل میں قرض دیتے وقت یا مہر مقرر کرنے کے وقت یا ادھار بیچنے کے وقت طرفین واجب الاداء نوٹ کی مالیت سونے یا چاندی میں طے کر لیں تاکہ ادا کرنے کے وقت اسی قدر سونے یا چاندی کی قیمت کے برابر نوٹوں کی ادائیگی عمل میں آئے، یہ صورت شرعاً جائز و درست ہے، واللہ اعلم۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ نوٹوں کی شکل میں قرض وغیرہ دیتے وقت طرفین واجب الاداء نوٹ کی مالیت سونے یا چاندی میں طے کر لیں تاکہ ادا کرنے کے وقت اسی قدر سونے یا چاندی کی قیمت کے برابر نوٹ دے دیئے جائیں، یہ صورت شرعاً جائز ہے، واللہ اعلم۔

## موجودہ کرنسی کا مسئلہ

مولانا اشتیاق احمد الاعظمی ☆

۱- دیون یعنی موخر مطالبوں کی ادائیگی کو قیمتوں کے اشاریہ سے وابستہ کرنا کیسا ہے؟

جواب: اصل سوال کے جواب سے پہلے افراط زر اور تفریط زر کی وضاحت ہونی

ضروری ہے۔

افراط زر اور تفریط زر کی وضاحت:

آجکل کی معاشی اصطلاح میں "افراط زر" کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ بازار میں اور لوگوں کے پاس رقم زیادہ آگئی، لیکن اور خدمات اتنی ہی ہیں جتنی پہلے تھیں، ان کی رسد میں اضافہ نہیں ہوا ہے، لہذا دوکاندار جب دیکھتا ہے کہ لوگوں کے پاس رقم زیادہ آگئی ہے اور اشیاء کی طلب میں اضافہ ہو گیا ہے، لیکن رسد میں اضافہ نہیں ہوا ہے، تو وہ اشیاء کی قیمت میں اضافہ کر دیتا ہے، جس سے روپیہ کی قوت خرید میں کمی آ جاتی ہے اور مہنگائی بڑھ جاتی ہے، اسی کو افراط زر کہتے

ہیں (تقریر ترمذی از مولانا محمد تقی عثمانی ار ۵۰-۵۱)۔

اور تفریط زر کا مطلب یہ ہے کہ کسی ملک میں جاری شدہ کرنسی، اشیاء اور خدمات کے مقابلہ میں کم ہو جائے، جس کے نتیجے میں اشیاء اور خدمات کی قیمت کم ہو کر ارزانی پیدا ہو جائے،

اس لئے کہ جب اشیاء طلب سے زیادہ ہو جاتی ہیں تو بھاؤ گر جاتا ہے اور قیمت کم ہو جاتی ہے (کرنسی کی قوت خرید از مولانا تقی عثمانی ر ۵۰)۔

یہ معلوم ہو چکا کہ افراط زر کے وقت روپیہ کی قوت خرید میں کمی آ جاتی ہے تو سوال یہ ہے کہ مؤخر مطالبوں میں افراط زر کی صورت میں عدد کا اعتبار کرتے ہوئے اتنا ہی روپیہ ادا کرنے سے حقدار کا حق ساقط ہوگا، جتنا وجوب کے وقت تھا یا روپیہ کی قوت خرید کم ہو جانے سے عدوی مقدار روپیہ کی بڑھا کر اس کی تلافی کرنا ہوگا۔ چونکہ یہ بات واضح ہے کہ کاغذی نوٹوں کی اپنی ذاتی کوئی قیمت نہیں ہوا کرتی، بلکہ ان کی قیمت، اشیاء کے اعتبار سے متعین ہوا کرتی ہے، اس لئے بعض معاشین بڑے زور شور سے تجویز پیش کرتے ہیں کہ کرنسی اور نوٹ کی قیمت متعین کرنے کے لئے، قیمتوں کے اشاریہ کو معیار بنایا جائے، اور تمام حقوق کی ادائیگی میں قیمتوں کے اشاریہ کے ساتھ کرنسی کی قیمت کے تعلق کو بنیاد قرار دیا جائے اور مالی سال کے شروع میں ان اشیاء کی جو قیمت رائج ہو وہ درج کی جائے اور پھر سال کے اخیر میں جو قیمت رائج ہو، اور دونوں قیمتوں اور نرخوں کے درمیان جو فرق ہو، اس کا تناسب نکالا جائے اور اسی تناسب سے نوٹوں کی قیمت میں تغیر مانا جائے۔

قیمتوں کے اشاریہ سے دیون (مؤخر مطالبوں) کو منسلک کرنے کا منشا یہ ہوا کرتا ہے کہ دیون، دائن کو صرف اصلی دین کے برابر روپیہ واپس نہ کرے بلکہ قیمتوں کے اشاریہ میں، اشیاء کی قیمتوں میں جس نسبت سے زیادتی ہوئی ہے، اسی نسبت سے دین کی رقم میں اضافہ کر کے واپس کرے۔ بعض معاشین اس کے جواز کے لئے یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ یہ زیادتی جو دیون، دائن کو واپس کر رہا ہے، یہ حقیقی زیادتی نہیں، بلکہ اسی مالیت کو واپس کر رہا ہے، جو دیون نے بطور دین کے دائن سے لی تھی۔

لیکن ان حضرات کی یہ دلیل شرعی اصول سے متصادم ہے، کیونکہ شریعت کا یہ اصول

ہے: الدیون تقضیٰ بامثالہا (دیون کی ادائیگی انہی کے مثل سے ہوگی) اس سے یہ ثابت ہوا کہ شریعت نے مماثلت فی قضاء الدیون کو ضروری قرار دیا ہے اور شریعت کے تمام مسائل میں مماثلت سے مراد، مماثلت فی المقدار (ناپ، تول اور عدد) ہوا کرتی ہے نہ کہ مماثلت فی القیمۃ (تقریر ترمذی از مولانا محمد تقی عثمانی ۱۵۲)۔

اس امر کی دلیل کہ شرعی مسائل میں مماثلت سے مراد، مماثلت فی المقدار (ناپ، تول اور عدد) ہوا کرتی ہے، نہ کہ مماثلت فی القیمۃ۔ جیسا کہ اس وہ حدیث میں ہے جو بخاری و مسلم میں بروایت حضرت ابوسعید خدریؓ مذکور ہے کہ حضور اکرم ﷺ کے عہد مبارک میں ہمارے پاس ہر قسم کی کھجوریں آیا کرتی تھیں، دو صاع گھٹیا کھجور کو ہم ایک صاع عمدہ کھجور کے بدلہ بیچا کرتے تھے، ہمارے اس عمل کی خبر، حضور ﷺ کو ہوئی تو آپ نے فرمایا: دو صاع کھجور کو ایک صاع کے بدلہ نہ بیچو، حالانکہ حضور ﷺ کو یہ بات معلوم تھی کہ دو صاع کے بدلہ میں ایک صاع جو کھجور بیچی جاتی تھی، وہ زیادہ قیمتی ہوتی تھی، لیکن اس کے باوجود حضور اکرم ﷺ نے اس کی اجازت نہیں دی؛ بلکہ مقدار یعنی وزن میں یہاں برابری کا حکم دیا اور قیمت کے فرق کا کوئی اعتبار نہیں فرمایا۔ اس روایت سے یہ بات ثابت ہوئی کہ مماثلت سے مراد مماثلت فی المقدار ہے، نہ کہ مماثلت فی القیمۃ۔

چونکہ قیمتوں کا اشاریہ اپنے تمام مراحل میں اندازہ اور تخمین پر مبنی ہے، اس کے حساب میں خواہ کتنی احتیاط برتی جائے، پھر بھی اس کے نتیجہ کو زیادہ سے زیادہ تقریبی کہہ سکتے ہیں نہ کہ یقینی اور واقعی۔ جبکہ احادیث کی روشنی میں یہ امر واضح ہے کہ دیون کی واپسی میں اٹکل اور اندازہ کی شرط لگانا جائز نہیں، لہذا قرضوں کی ادائیگی کو قیمتوں کے اشاریہ سے وابستہ کرنا کسی بھی حال میں جائز نہیں۔ مولانا تقی عثمانی مدظلہ بحوالہ حورم اور ایچ لیوی، تحریر فرماتے ہیں: ”قیمتوں کے اشاریہ کو تمام مالی معاملات میں پورے طور پر کام میں لانا ایک ایسا فعل ہے، جس کا حصول عملًا ناممکن ہے۔“



۲- واجب الادا قرضوں کی مالیت کو سونے چاندی کی قیمت کے مساوی نوٹوں کے ذریعہ ادا کرنا:

جواب: پچھلے سوال کے جواب میں یہ بات آچکی ہے: "الديون تقضى بامثالها" (دیون کی ادائیگی انہی کے مثل سے ہوگی)، شریعت اسلامیہ نے مماثلت فی قضاء الدین کو ضروری قرار دیا ہے اور شریعت کے تمام مسائل میں مماثلت سے مراد، مماثلت فی المقدار ہوا کرتی ہے، نہ کہ مماثلت فی القیمۃ۔ تو اب اگر قرض، نوٹ کی شکل میں دیا گیا ہے تو اس کی واپسی، اسی مقدار میں نوٹ ہی کی شکل میں ہوگی، خواہ واپسی کے وقت، نوٹ کی قوت خرید میں کمی واقع ہو چکی ہو، طرفین سے نوٹ کی مالیت، سونے یا چاندی میں طے کرنے سے اور واپسی کے وقت اسی قدر سونے یا چاندی کی قیمت کے مساوی نوٹوں کی ادائیگی کو واجب کرنا جائز ہوگا۔

مولانا تقی عثمانی مدظلہ نے اس موقع پر ایک بڑی عمدہ بات تحریر فرمائی ہے جو یہاں قابل ذکر ہے، وہ تحریر فرماتے ہیں: "جب کوئی شخص دوسرے کو قرض دینا چاہتا ہے تو اس کو پہلے یہ فیصلہ کرنا چاہئے کہ اس قرض کے ذریعہ اس کی امداد کرنا چاہتا ہے یا اس کے منافع میں حصہ دار بننا چاہتا ہے؟ اگر وہ منافع میں حصہ دار بننا چاہتا ہے تو پھر اس کے ساتھ نقصان میں بھی حصہ دار بنے اور وہ اس طرح کہ اس کے ساتھ شرکت یا مضاربت کا معاملہ کرے، اور اگر صرف امداد کرنا چاہتا ہے تو پھر یہ سوچ لے کہ قرض دینا ایسا ہے جیسے کوئی شخص اپنے پیسے اٹھا کر صندوق یا الماری میں تالہ لگا کر رکھ دے اور پھر اس الماری یا صندوق میں رکھے ہوئے پیسوں پر پانچ سال گذر جائیں تو اس دوران ان پیسوں کی قیمت کم ہو جائے گی، جس کی وجہ سے پیسے رکھنے والے کا نقصان ہو جائے گا تو اس نقصان کی تلافی کون کرے گی؟ ظاہر ہے کوئی نہیں کرے گا۔ اسی طرح آپ نے کسی کو قرض دیا تو وہ ایسا ہی ہے جیسے آپ نے صندوق یا الماری میں پیسے اٹھا کر رکھ دیئے، اس لئے یہ بات درست نہیں کہ دیون کی ادائیگی میں "قوت خرید" کا اعتبار کیا جائے" (تقریر ترمذی ۱۵۳)۔

## موجودہ کرنسی کی شرعی حیثیت اور اس پر قیمتوں کے اشاریہ کا اثر

مولانا امداد اللہ قادری مدنی ☆

جہاں تک کرنسی نوٹ کی شرعی حیثیت کا سوال ہے تو یہ بات اکیڈمی کے دوسری ہی سمینار میں طے ہو چکی ہے اور موجودہ جہاں دیدہ عالم مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہ نے اپنی کتاب ”اسلام اور جدید معیشت و تجارت“ میں اسی کو صحیح قرار دیا ہے کہ کرنسی نوٹ سند و حوالہ نہیں، بلکہ خود مال اور ثمن ہے، البتہ سونے اور چاندی کی طرح ثمن حقیقی نہیں بلکہ ثمن عرفی اور زرا اصطلاحی و قانونی کی حیثیت رکھتا ہے اور یہ بھی مسلم ہے کہ کاغذی نوٹ کی اپنی حقیقی قدر کچھ نہیں ہوتی، نوٹ کی قدر کا تعین اشیاء و خدمات کی قیمتوں سے ہوتا ہے، اشیاء و خدمات کی قیمتیں بڑھ جائیں تو نوٹ کی قیمت کم ہو جاتی ہے اور گھٹنے کی صورت میں نوٹ کی قیمت بڑھ جاتی ہے، اسی کو افراط زر اور تفریط زر سے تعبیر کیا جاتا ہے، افراط زر کی صورت میں جب نوٹ کی قوت خرید کم ہو جاتی ہے تو اس وقت کیا شرعی صحیح ہوگا کہ موخر مطالبیوں کو قیمتوں کے اشاریہ سے وابستہ کر دیا جائے، تاکہ صاحب حق کے ساتھ ظلم اور نا انصافی نہ ہو؟ اس سوال کے جواب سے پہلے چند باتیں ملحوظ خاطر رکھنی چاہئیں:

۱۔ اشیاء کی قیمتوں کو دیکھ کر قدر زر اور افراط زر یا تفریط زر کی پیمائش کے لئے ماہرین کے یہاں ایک حسابی نظام ہے، جسے عربی میں ”قائمۃ الاسعار“ اور اردو میں ”قیمتوں کا اشاریہ“ کہتے ہیں، یہ نظام محض ایک تخمینی چیز ہے، قطعی نہیں، اس لیے کہ اس میں کون سی اشیاء لینی ہیں اس

کا انتخاب تخمینہ ہے، پھر ہر شے کو جو وزن دیا جاتا ہے وہ بھی تخمینہ، ہر شے کی جو قیمت رکھی جاتی ہے وہ بھی تخمینہ ہے، غرض یہ نظام ازسرتابن تخمینات اور اندازہ پر مبنی ہے، اور اس قسم کا نظام یقیناً باہمی نزاع کا باعث ہوتا ہے۔

۲- اموال ربویہ میں حقیقی مماثلت ضروری ہے، اسی لئے شریعت نے ان اموال میں مجازتہ یعنی اٹکل و اندازہ سے فروختگی کو ناجائز قرار دیا ہے، اور ادائیگی کو قیمتوں کے اشاریہ کے ساتھ وابستہ کرنے میں مجازتہ لازم آتا ہے، اس لئے کہ ابھی یہ بات گزری ہے کہ قیمتوں کا اشاریہ محض تخمینہ ہوتا ہے۔

۳- قرض کی ادائیگی میں شرعاً مقدار میں مثلیت کا اعتبار ہے، قیمت میں مثلیت کا نہیں، مثلاً کسی نے گیہوں قرض لیا تو واپسی میں گیہوں کی اتنی ہی مقدار لوٹائے گا، اگرچہ اب قیمت تبدیل ہو چکی ہو۔

۴- حضرت ابن عمرؓ کی حدیث میں جو ابو داؤد (۳۳۵۴)، ترمذی (۱۴۴۴)، نسائی (۴۵۹۶) اور ابن ماجہ (۴۴۶۴) میں موجود ہے، مذکور ہے کہ ابن عمرؓ بقیع میں اونٹ بیچا کرتے تھے، کبھی ایسا ہوتا کہ معاملہ دراہم پر ہوتا اور ادائیگی دینار سے ہوتی اور کبھی اس کے برعکس ہوتا، جب انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے اس بابت دریافت کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ”لا بأس ان تأخذ بسعر یومہا“ یعنی آپ ﷺ نے اس شرط کے ساتھ اجازت دی کہ ادائیگی کے دن کی قیمت کے مطابق ہو، یعنی اگر بیع دراہم پر ہوئی تھی اور ادائیگی دنانیر میں ہو رہی ہے، تو ادا کے دن اتنے درہموں کے جتنے دینار بنیں گے وہی دینے ہوں گے، کیوں کہ ذمہ میں تو اسی چیز کی مقدار واجب ہوئی تھی جس پر بیع ہوئی تھی، یعنی دراہم پر، البتہ ادائیگی کے وقت اس دن کی قیمت کے لحاظ سے واجب شدہ متبادلہ دوسرے شے مثلاً دینار سے ہو سکتا ہے، اس حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ دیون میں جو چیز واجب ہوتی ہے وہ دیون کی مقدار ہے نہ کہ حقیقی قیمت، اگر قیمت واجب

ہوتی تو وجوب کے دن کی قیمت کے لحاظ سے تبادلہ ہوتا، نہ کہ ادائیگی کے دن کے اعتبار سے۔ ان امور پر نظر کرنے سے یہ بات واضح طور سے سامنے آتی ہے کہ دیون یعنی مؤخر مطالبوں کو اشیاء کی قیمتوں کے اشاریہ سے وابستہ کرنا شرعاً صحیح نہیں ہے، ایسا کرنا عاقدین کے مابین نزاع کا باعث اور باب ربا و اکڑنے کا محرک ہوگا، کیوں کہ یہ اشاریہ تخمینات سے عبارت ہے۔ یہیں سے یہ اشکال بھی ختم ہو جاتا ہے کہ مؤخر مطالبات مثلاً قرض میں نوٹ کی قیمت کم ہو جانے سے صاحب حق کو دی ہوئی مقدار ہی لوٹانے میں اس کے ساتھ نا انصافی اور ظلم ہے، کیوں کہ یہ بات گزر چکی ہے کہ دیون میں مقدار واجب ہوتی ہے نہ کہ قیمت، مقدار میں مماثلت کا اعتبار ہے نہ کہ حقیقی قیمت میں، نیز روپے کی قدر کم ہونے میں مستقرض کے کسی فعل کا دخل نہیں ہے، لہذا وہ ذمہ دار بھی نہ ہوگا۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے قرض دینے والا اگر اپنے ہی پاس وہ روپے رکھتا تو قیمت میں کمی کے وقت کوئی ذمہ دار نہ ہوتا۔

البتہ اگر کہیں کی کرنسی کی قیمت اس حد تک گر جائے کہ کساد میں داخل ہو جائے یا خود حکومت اپنی کرنسی کی قیمت گھٹا دے تو اس کا حکم مختلف ہو سکتا ہے۔

### دوسرا مسئلہ:

اگر نوٹوں کی شکل میں قرض دیتے وقت یا مہر کے تقرر کے وقت یا ادھار فروختگی کے وقت طرفین واجب الاداء نوٹوں کی مالیت سونے یا چاندی میں طے کر لیں، اور یہ واضح کر دیں کہ معاملہ درحقیقت اتنے نوٹوں پر نہیں بلکہ اتنی مقدار میں سونے یا چاندی پر ہوا ہے، پھر ادائیگی کے وقت بجائے سونے یا چاندی لینے کے ان کا تبادلہ دوسرے شمن یعنی نوٹوں سے کر لیں تو ایسا کرنا جائز ہوگا، جیسا کہ حدیث ابن عمر میں ابھی گزرا ہے، نیز نوٹ فلوس کے حکم میں ہیں، لہذا ان کے ذریعہ سونے یا چاندی کا تبادلہ ادائیگی کے دن کی قیمت کے اعتبار سے درست ہوگا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

## موجودہ کرنسی سے متعلق سوالات کے جوابات

مفتی محفوظ الرحمن مفتاحی ☆

موجودہ کرنسی اپنے وجود کے ابتدائی دور میں وثیقہ ثمن اور سند کے درجہ میں تھا؛ اس لئے اس کے احکامات وثیقہ اور سند کے لحاظ سے تھے مثلاً زکوٰۃ کی ادائیگی میں نوٹ دینے سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوتی یا قرض نوٹوں سے لیتے وقت اس کی مالیت کا اندازہ سونا چاندی سے طے کیا جاتا کہ قرض ادا کرتے وقت نوٹ اتنے ادا کئے جائیں جتنے متعینہ چاندی یا سونے میں ملیں۔ اسی طرح دوسرے مسائل رہے۔

مگر اب نوٹوں کا چلن اور لین دین عام ہو گیا۔ ثمن حقیقی کے سکے درہم و دینار بالکل ختم ہو گئے ہیں جس کی بنیاد پر کہا جاسکتا ہے کہ نوٹوں کو ثمن حقیقی کی حیثیت حاصل ہے، اور اگر ثمن حقیقی کی حیثیت نہ مانی جائے تو بہت سی مشکلات درپیش ہوں گی اس لئے فقہاء کرام نے اب ثمن حقیقی مان کر فتوے دئے ہیں۔

چنانچہ حضرت مولانا عبدالحی صاحب نوٹ پر بحث کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں کہ نوٹ ہر چند خلق ثمن نہیں مگر عرفاً حکم ثمن میں ہے بلکہ عین ثمن سمجھا جاتا ہے اس وجہ سے کہ اگر نوٹ سو روپیہ کا کوئی ہلاک کر دے تو اصل مالک سو روپے کا تاوان لیتا ہے اور سو روپیہ کا نوٹ جب بیچا جاتا ہے تو مقصود اس سے قیمت ملنا اس کا غنڈ کا نہیں ہوتا؛ کیوں کہ یہ ظاہر ہے کہ وہ کاغذ

☆ دارالافتاء، جامعہ مفتاح العلوم منو۔

دو پیسہ کا بھی نہیں ہے، بلکہ مقصود سو روپیہ کا بیچنا اور اس کی قیمت لینا ہوتا ہے، اور نوٹ سو روپیہ کا اگر کوئی قرض لے تو بوقت ادا خواہ نوٹ سو روپیہ کا دیوے یا سو روپے دیوے دونوں امر مساوی سمجھے جاتے ہیں اور دائن کو کسی کے لینے میں مدیون سے عذر نہیں ہوتا حالاں کہ اگر مدیون غیر جنس بوقت ادا دیوے تو دائن نہیں لیتا بخلاف پیسوں کے کہ وہ بھی اگر چہ عرفاً ثمن ہے مگر یہ کیفیت ان کی نہیں ہے، اگر ایک روپیہ کے عوض میں کوئی چیز خرید لے یا ایک روپیہ کسی سے قرض لے اور بوقت ادا پیسے یا ایک روپیہ دے دے تو دائن اور فروخت کنندہ کو اختیار رہتا ہے کہ وہ لے یا نہ لے اور حاکم کی طرف سے اس پر جبر نہیں ہو سکتا کہ خواہ مخواہ وہ پیسے لے لے، پس پیسہ اگر چہ عرفاً ثمن ہے مگر عین ثمن خلقی نہیں سمجھے گئے ہیں بخلاف نوٹ کے کہ یہ عین ثمن خلقی ہے گو عینیت خلقیہ نہیں بلکہ عینیت عرفیہ ہو، پس تقاضل بیع فلوس میں جائز ہونے سے یہ نہیں لازم آتا ہے کہ نوٹ میں بھی جائز ہو جائے؛ کیوں کہ پیسہ غیر جنس ثمن ہے حقیقتاً بھی اور عرفاً بھی، گو بوجہ اصطلاحی اور عرف کے اس میں ثمنیت آگئی ہو، پس ہر گاہ نوٹ عرفاً جمیع احکام میں عین ثمن خلقی سمجھا گیا، باب تقاضل میں اسی بنا پر حکم لگا دیا جائے گا اور تقاضل اس میں حرام ہوگا۔

مولانا نے ان سطروں میں واضح فرمادیا کہ نوٹ اپنی اصلیت کے اعتبار سے اگر چہ ثمن نہیں مگر عرف اور اصطلاح میں ثمن ہی جیسا معاملہ اس کے ساتھ ہو رہا ہے۔

دوسرے فقہاء و علماء نے بھی اسی کو تسلیم کیا ہے۔ اس لئے:

سوال (۱) کے جواب میں یہ ہے کہ مؤخر مطالبوں کو قیمتوں کے اشاریہ سے وابستہ نہیں

کیا جائے گا، جتنے نوٹ مقرر ہوں گے اتنا ہی نوٹ ادا کیا جائے گا۔

اور سوال (۲) کے جواب میں یہ ہوگا کہ قرض دیتے وقت یا مہر مقرر کرتے وقت نوٹ

کی مالیت سونا یا چاندی میں طے کرنے کی ضرورت نہیں، جتنا نوٹ قرض میں لیا یا مہر میں مقرر کیا

اتنا ہی نوٹ ادا کرنا ہوگا۔

## موجودہ کرنسی اور اس کی شرعی حیثیت

☆ مولانا سلطان احمد اصلاحی ☆

اس سوال نامہ کے تحت دو استفسارات ہیں ان کے جوابات بہ ترتیب حسب ذیل ہیں:

۱- یہ صحیح ہے کہ کرنسی نوٹوں کے سلسلہ میں افراط زر (inflation) ایک مسئلہ ہے۔ ہندوستان کی حد تک ہم کو اس کا براہ راست تجربہ ہوتا ہے۔ اشیاء صرف کی قیمتوں میں اضافہ ہوتا رہتا ہے اور اس کی وجہ سے روپے کی حقیقی قیمت گھٹتی رہتی ہے، کھانے پینے کی چیزوں سے لے کر، کپڑا، فرنیچر، برتنے کے دوسرے سامان، زمین، فلیٹ اور دوکان پر ہر چیز کا دام وقت گزرنے کے ساتھ بڑھتا رہتا ہے اور اس کے مقابلے میں روپے کا وزن گھٹتا رہتا ہے۔ آج جو سامان خرید لیا گیا وہ سال بھر بعد خرید جائے گا تو یقیناً اس کی اس سے زیادہ قیمت دینی پڑے گی۔ اس کے لحاظ سے افراط زر ہماری معاشی زندگی کی ایک حقیقت ہے۔ اس مسئلہ سے عہدہ برآ ہونے کا اصل طریقہ مسلمان معاشرے میں ”عدل“ کی جگہ ”احسان“ پر عمل ہے۔ معلوم ہے کہ اسلام میں ایک چیز عدل ہے، دوسرا احسان ہے۔ عدل یہ ہے کہ میں ۱۰۰ روپے کے بدلے ۱۰۰ روپے لوٹاؤں اور احسان یہ ہے کہ میں اس میں اپنی مرضی سے ۱۰۰ روپے کا اضافہ کردوں۔ یہ جائز ہی نہیں مستحسن ہے۔ اور آخری نبی ﷺ کی مثالی زندگی اس کے نمونوں سے بھری پڑی ہے، اس کا تفصیلی مطالعہ ہونا چاہئے اور حضرات علماء کرام کے ذریعہ مسلمان

معاشرے میں اس کی مناسب تفہیم ہونی چاہئے۔ قرض تو ایک طرح کا احسان ہے، اور اسے ہر حال میں واپس لینا ہی ضروری نہیں ہے؛ بلکہ اس کے معاف کرنے کی بڑی فضیلت ہے۔ اسی طرح صرف مہر کی بڑھی رقم سے عورت کی زندگی پار نہیں لگ جاتی۔ پینشن، ادھار خریداری اور وقت پر ادانہ ہونے والی تنخواہوں وغیرہ کو بھی اس کے ساتھ اسی طرح شامل کیا جاسکتا ہے۔ ان تمام طرح کی صورتوں میں متعلق فرد/ افراد کو افراط زر کے نتیجے میں پیدا ہونے والے نقصان سے بچانے کا بہتر طریقہ ہے کہ شوہر، امپلائر اور خریدار، جیسا کہ گزرا، عدل کے بجائے (احسان) کا طریقہ اپنائے اور دوسرے فریق کو نقصان سے بچاتے ہوئے ادائیگی میں اس کے ساتھ فراخ دلی کا مظاہرہ کرے۔ جس کے نظائر سے ہمارے صدر اول کی روشن تاریخ بھری ہوئی ہے۔ اس کے بجائے اس کو کسی لگے بندھے اشارے سے جوڑنا مقضی الی النزاع، جھگڑے کا سبب ہوگا، جس کی فقہ میں ممانعت ہے، اور جو اس کے اندر کسی معاملے کی حرمت کی ایک مستقل اساس ہے۔

۲۔ دوسری صورت میں بھی جب کہ پہلی ادائیگی نوٹ کی صورت میں ہو تو دوسری ادائیگی بھی نوٹ ہی میں ہو اور افراط زر کی امکانی نقصان کی تلافی باہمی صوابدید سے اوپر کے ”احسان“ کے اصول سے کی جائے۔ جب پہلا معاملہ نوٹ کے ذریعہ ہو تو دوسرا معاملہ بھی نوٹ کے ذریعہ ہی ہونا چاہئے۔ افراط زر کے فرق کو سونے چاندی سے نہ جوڑا جائے۔ لیکن اگر فریقین افراط زر کے نقصان سے بچنے کے لئے کرنسی نوٹ سے بچنے کے لئے مصر ہوں تو انہیں پہلا معاملہ بھی نوٹ یعنی کرنسی کے بجائے سونے چاندی کی صورت میں کرنا چاہئے۔ چاندی کے ڈلے اور سونے کے بسکٹ سے معاملہ کیا جائے اور ان کی کوالٹی کا اندراج معاملہ کے وقت تحریری طور پر کر لیا جائے، بعد میں واپسی کے وقت برابر برابر سونے اور چاندی کی واپسی ہو جائے۔ اس کے بجائے معاملہ کی پہلی صورت شق اول کی طرح ”مقضی



الی النزاع“ جھگڑے کا باعث ہوگی۔ جس سے بچا جانا ضروری ہے۔ اور جیسا کہ گزرا کسی معاملے کے ناجائز اور ممنوع ہونے کی یہ مستقل اسس ہے۔ **هَلَّا مَا عَلِمَ وَاللَّهُ اَعْلَمُ وَعِلْمُهُ اَتَمُّ وَاَحْكَمُ۔**

www.KitaboSunnat.com

## مسائل کرنسی

مولانا محمد عثمان ستوی

تحملة و تصلى على رسولہ الکریمہ اعلا ینالہ

موتخر مطالبیوں کی اقسام:

موتخر مطالبیوں کو اثناریہ سے متعلق کرنے کی دو صورتیں ہیں:

۱۔ ثمن، اجرت، ہیر، کسب، قلم، عاقدین کے درمیان طے کی جائے ہو حقیقت اس کو عوض

تسلایا جائے بلکہ عوض اس کی مقدار کی مالیت کو تسلایا جائے جو اثناریہ سے حاصل ہو۔

حکم: اثناریہ سے ثمن، اجرت، ہیر وغیرہ طے کرنے میں جہالت ہے، لیکن یہ الکی

جہالت ہے جس کا اثناریہ کے اصول و ضوابط سے دور کرنا عاقدین کے اختیار میں ہے اور ہر الکی

جہالت جس کا دور کرنا عاقدین کے اختیار میں ہو راجح و مستحبی قول کے مطابق مفید نہیں۔ لہذا اگر

عاقدین اثناریہ کے اصول و ضوابط سے واقف ہوں تو ان کے لئے اثناریہ سے ہیر، ثمن، اجرت

وغیرہ متعین کرنا جائز ہے، اگر عاقدین اس کے اصول و ضوابط سے واقف نہ ہوں تو ان کے لئے

اثناریہ سے قیمت متعین کرنا جائز نہیں ہے (دیکھئے: فتاویٰ ۷/۱۱۳)۔

علامہ کشمیری فرماتے ہیں:

”والذی اراہ ان النہی عند کونہ مفضیا الی النزاع وکل امر یکون النہی عنہ بذلک لا یشدد فیہ الشارع بنفسہ بل ربما یغمض عنہ ایضا فلا ینبغی التشدد فیہ“ (فیض الباری ۳/۳۷۲)۔

یعنی جس میں ممانعت کی وجہ نزاع ہو اس میں شارع کی جانب سے اصل میں سختی نہیں ہوتی ہے بلکہ اس میں بعض اوقات اغماض سے کام لیا جاتا ہے لہذا اس میں سختی و تشدد مناسب نہیں۔

۲- دوسری صورت یہ ہے کہ عاقدین ثمن، اجرت، مہر وغیرہ اپنی صوابدید کے مطابق متعین کر لیں، ان کی تعیین کے بعد ان کو مؤخر اس شرط کے ساتھ کر دیا جائے کہ ادائیگی کے وقت اگر قیمتوں میں اضافہ ہو، تو قیمتوں کے اشاریہ میں جس تناسب سے اضافہ ہوگا اسی تناسب سے ان متعینہ مقداروں میں بھی اضافہ کرنا پڑے گا۔

حکم: مذکورہ بالا صورت میں دو جہت پائی جاتی ہے:

۱- اس کو اثمان خلقیہ (سونا چاندی) سے مشابہت کی۔

۲- فلوس اور اشیاء مثلیہ سے مشابہت کی۔

۱- پہلی جہت (اثمان خلقیہ سے مشابہت) کا تقاضہ یہ ہے کہ یہ شکل جائز نہ ہو؛

کیوں کہ دیون (مؤخر مطالبے) کا حکم یہ ہے کہ جب وہ سونا چاندی کی قبیل سے ہوں، اور ان کی قیمتوں میں چاہے جتنا اضافہ ہو جائے، تو جتنا ذمہ میں باقی ہے اتنا ہی ادا کیا جائے، اضافہ کی شرط کے ساتھ لین دین ربوا (سود) میں داخل ہونے کی وجہ سے جائز نہیں (دیکھئے: الفقہ الحنفی فی ثوبہ الحجید ۲/۳۷۲)۔

۲- دوسری جہت (فلوس اور اشیاء مثلیہ میں مشابہت) کا تقاضہ یہ ہے کہ دوسری شکل

جائز ہو، کیوں کہ جب فلوس کی قیمت یا قرض میں دی ہوئی چیز کی قیمت میں تفاوت فاحش (جو

قیمت لگانے والوں کے اندازے میں نہ آئے) حد تک اضافہ یا کمی ہو جائے تو حضرت امام ابو یوسفؒ کے قول کے مطابق (جو راجح اور مفتی بہ بھی ہے) مقروض کے ذمہ قرض کے دن کی قیمت ادا کرنا واجب ہے (دیکھئے: الفقہ الحنفی فی ثوبہ الحدید ۲۳۷/۲)۔

”لو استقرض الطعام ببلد الطعام فيه رخيص، فلقية المقرض في بلد الطعام فيه غال ففيه عند الصاحبين عليه قيمته فقد اتفقا على وجوب رد القيمة دون المثل..... و قولهما انظر للمقرض من قول الإمام لأن في رد المثل إضراراً به ثم قول أبي يوسف انظر له أيضا لأن قيمته يوم القرض أكثر من يوم الانقطاع وهو أيسر أيضا فإن ضبطه وقت الانقطاع عسر“ (الفقہ الحنفی فی ثوبہ الحدید ۲۱۸/۲)۔

ترجیح: مندرجہ جہات متعارضہ کے حکموں میں غور کرنے سے ترجیح عدم جواز کو معلوم ہوتی ہے؛ چونکہ متعینہ مقدار پر اضافہ کو لازم کرنے کی صورت میں ربوا (سود) کا دروازہ کھل جانے کا سخت اندیشہ ہے، نیز قیمتوں میں اضافہ کے لئے کن چیزوں کی قیمتوں کا اعتبار کیا جائے اس کی تعیین میں نزاع کا ہونا لابدی ہے۔

ومشائخنا لم يفتوا بجواز ذلك في العدالي والغطارقة لأنها أعز الأموال في ديارنا فلو أبيع التفاضل فيه يفتح باب الربوا (ہدایہ ۹۳/۲)۔  
ومعتمد الفقہ جريان الربا في الفلوس كالذهب والفضة وتحريم الربا إذا كان النقد ذها وفضة لا يعني إبطال حكمه إذا اصطاح الناس على غيره من غيرهما فإن الثمن غير مقصود لذاته بل لقيمته، فإن شرط زيادة في القدر حرم إن كان المال ربويا وإن كان غير ربوي على الصحيح“ (الفقہ الحنفی فی ثوبہ الحدید ۲۳۷/۲)۔

حکم متوسط: ربوا (سود) سے بچنے کے لئے اگر جنس دین کے علاوہ کوئی دوسری چیز وقت قرض کی قیمتوں کا اندازہ کر کے دلوائی جائے تو یہ جائز ہونے کے ساتھ ساتھ انصاف کے مطابق ہے، اس میں نہ تو اضرار ہے اور نہ ہی تحمل ضرر، اس کے جواز کی وجہ یہ ہے کہ دین (قرض) کو من علیہ الدین سے فروخت کر دینا اگرچہ کمی بیشی کے ساتھ ہو جائز ہے۔

”عن ابن عمر رضی اللہ عنہما قال کنت ابيع الإبل بالبقیع فأبيع بالدنایر فأخذ مکانها الورق وأبيع بالورق فأخذ مکانها الدنایر فأتیت رسول اللہ ﷺ فوجدته خارجاً من بیت حفصة رضی اللہ عنہا فسألته عن ذلك فقال: لا بأس به بالقیمة“ (ترمذی شریف)۔

### خلاصہ جواب:

۱- (الف)۔ قرض و مؤخر مطالبے (مہر، اجرت، ثمن وغیرہ) کو قیمتوں کے اشاریہ سے متعلق کرنا جائز نہیں، یہی پاکستان کے سمینار کا بھی متفقہ فیصلہ ہے، تجویز ۳۳ ملاحظہ ہو۔  
ذمہ میں ثابت شدہ دیون چاہے وہ کسی بھی قسم کے ہوں ان کو قیمتوں کے اشاریہ کے ساتھ منسلک کر دینا جائز نہیں الخ (فقہی مقالات ۱/ ۷۳)۔

(ب)۔ پنشن چوں کہ یہ تبرعات کی قبیل سے ہے لہذا اس میں اضافہ جس طرح سے چاہے کرے؛ خواہ قیمتوں کے اشاریہ کے طریقہ سے یا کسی اور طرح (امداد الفتاویٰ ۳/ ۱۵۰، فتاویٰ محمودیہ ۲۰/ ۲۰۳-۱۱۵/ ۱۶)۔

۲- اگر نوٹ کی مالیت کا اندازہ کر کے اصل ثمن کے طور پر سونا یا چاندی وغیرہ طے کیا جائے اور پھر ادائیگی کے وقت باہمی رضا سے متعینہ سونا چاندی کی جو قیمت بنے اس کا لین دین کیا جائے تو یہ جائز ہے (دیکھئے: اللہ لکھنی فی ثوبہ الجدید ۳/ ۲۰۳)۔

## موجودہ کرنسی کی شرعی حیثیت

مفتی لطیف الرحمن ولایت علی ☆

الجواب وباللہ التوفیق:

۱- ماہرین معاشیات کا تو یہی کہنا ہے کہ کرنسی اور نوٹ کی قیمت متعین کرنے کے لئے قیمتوں کے ”اشاریہ“ کو معیار بنایا جائے اور تمام حقوق اور واجبات کی ادائیگی میں قیمتوں کے اشاریہ کے ساتھ کرنسی کی قیمت کے تعلق کو بنیاد بنایا جائے (فقہی مقالات ۱/۵۱)۔

اور قرضوں کو قیمتوں کے اشاریہ سے منسلک کرنے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ قرض دار قرض خواہ کو صرف قرض کے برابر روپیہ واپس نہ کرنے بلکہ قیمتوں کے اشاریہ میں اشیاء کی قیمتوں میں جس تناسب سے اضافہ ہوا ہے اسی تناسب سے قرض میں اضافہ کر کے واپس کرے، مثلاً کسی نے اگر ایک ہزار روپیہ قرض لئے اور قرض کی واپسی کے وقت قیمتوں کے اشاریہ میں دس فیصد کے تناسب سے اضافہ ہو چکا ہے تو اب قرض دار بھی قرض میں دس فیصد کے تناسب سے اضافہ کر کے گیارہ سو روپے کرے، اس لئے کہ ایک ہزار روپے کی قوت خرید قرض لیتے وقت زیادہ تھی اور قرض کی واپسی کے وقت قوت خرید دس فیصد کے تناسب سے کم ہو گئی، اگر اس صورت میں قرض دار ایک ہزار ہی واپس کرے تو یہ قرض خواہ پر ظلم ہوگا (حوالہ بالا ۱/۵۲)۔

لیکن حق بات یہ ہے اس زیادتی کو جائز قرار دینے والوں کی یہ دلیل شرعی قواعد پر کسی

☆ دارالافتاء والارشاد، چونا بھٹی مسجد، شاننا کروڑ، ممبئی۔

طرح بھی منطبق نہیں ہوتی، اس لئے کہ شریعت اسلامیہ میں قرضوں کو اسی مقدار کے مثل (برابر) ادا کرنا واجب ہے اس میں کسی کو اختلاف نہیں۔ ادھار کے متعلق یہ ضابطہ معروف ہے: ”الدین نقضی بامثالها“ کہ ادھار اور قرض کی ادائیگی مثل سے ہی ہوتی ہے، اور عالم گیری میں ہے: ”والقرض هو أن يقرض الدراهم والدنانير أو شيئاً مثلياً فأخذ مثله في ثانی الحال“ (۳۶۶/۵)۔

اب ”مثل“ کی تعبیر کرنی ہے کہ مثل سے کیا مراد ہے؟ لہذا بنیادی سوال یہ ہوتا ہے کہ یہ برابری اور مثل مقدار (ناپ، وزن، عدد) میں ضروری ہے یا قیمت اور مالیت میں ضروری ہے؟ چنانچہ قرآن و سنت کے دلائل میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قرض کی واپسی میں جو برابری شریعت میں مطلوب ہے وہ مقدار اور کیت میں مطلوب ہے قیمت اور مالیت میں مطلوب نہیں۔

صحیح بخاری و مسلم میں حضرت ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ کے زمانہ میں ہمارے پاس ہر قسم کی مٹی جلی کھجوریں آیا کرتی تھیں۔ ہم گھٹیا کھجور کے دو صاع کو اچھی کھجور کو ایک صاع کے بدلے میں بیچ دیتے تھے، جب آپ ﷺ کو اس کی اطلاع ہوئی تو آپ ﷺ نے فرمایا: دو صاع کھجور کو ایک صاع کھجور کے بدلے میں مت بیچو اور نہ دو صاع گندم کو ایک صاع گندم کے بدلے میں بیچو اور ایک درہم کو دو درہم کے عوض مت بیچو۔

یہ بات حضور ﷺ کو معلوم تھی کہ جو کھجور دو صاع کے بدلے میں بیچی جائے گی وہ اس کھجور کے مقابلہ میں زیادہ قیمتی ہوگی جو ایک صاع کے عوض بیچی جائے گی لیکن اس کے باوجود آپ ﷺ اس پر راضی نہیں ہوئے بلکہ مقدار اور ناپ میں مماثلت اور برابری کا حکم دیا اور قیمت کے فرق کا اعتبار نہیں کیا (فقہی مقالات ۱/۵۵)۔

جہاں یہ نظام حدیث و سنت کے خلاف ہے وہیں اس میں اور بھی مزید خرابیاں پیدا ہو

جائیں گی۔

۱- سب سے پہلے اس سے سود کا دروازہ کھل جائے گا اور سود خور یہ کہنے لگیں گے کہ اتنے دنوں میں بازار کی قیمتوں میں اس قدر تفاوت ہوا اس لئے اضافہ لیا جانا ضروری ہے، تو اسلام نے جس سود پر آہنی دیوار کھڑی کی تھی اس نظام سے گر جائے گی۔

۲- پھر اشاریہ والے نظام میں دوسری مشکل یہ ہے کہ اس کا حساب و کتاب کرنا آسان نہیں ہوگا اور نہ ہر شخص کے بس کی بات ہوگی۔ ہلال کے باب میں ایک حدیث آئی ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: ”إنا أمة أمية لا نكتب ولا نحسب“ (مشکوٰۃ) (ہم لوگ امی جماعت سے تعلق رکھتے ہیں جو دقیق حساب و کتاب نہیں جانتی) (جدید فقہی تحقیقات ۱۳۲۲-۱۳۳-۱۳۳)۔

ایک اور اہم بات جو ماہرین معاشیات سے کہنی ہے وہ یہ کہ نوٹ کے بارے میں حکومت نے کبھی یہ رویہ اختیار نہیں کیا جس سے معلوم ہو کہ نوٹ کی قیمت میں کمی بیشی ہوتی ہے مثلاً آپ کسی بھی بینک میں روپیہ جمع کریں اور دس سال بعد وہ رقم نکالیں تو وہ اتنی ہی رقم واپس کرے گا جتنی اس نے جمع کی تھی، جو اس بات کی کھلی دلیل ہے کہ حکومت کے نزدیک نوٹ کی قیمت یکساں رہتی ہے (حوالہ بالا ۲۱۳/۲)۔

اسی طرح ماہرین معاشیات ”افراط زر“ کی صورت میں تو تائید کرتے ہیں لیکن ”تفریط زر“ کی صورت میں کوئی بھی اس نظریہ کو نہیں اپناتا۔ اگر اس نظریہ کو اپنایا جائے گا تو کوئی بھی شخص اپنا پیسہ بینک میں نہیں رکھوائے گا (فقہی مقالات ۱۷۱)۔

بہر حال دیون یعنی موخر مطالبوں میں جیسے قرض، مہر، پنشن اور ادھار خریداری کی رقم کی ادائیگی کو قیمتوں کے اشاریہ سے متعلق کرنا نہ تو شرعاً جائز ہے اور نہ قیمتوں کے اشاریہ کے ذریعہ ادائیگی کے لئے کوئی منضبط و متیقن قاعدہ ہے، اور جو دقیق فنی قاعدے اس سلسلہ میں بیان کئے جاتے ہیں وہ عوام الناس کے فہم و ادراک سے بالاتر ہیں، لہذا شرعی نقطہ نظر سے قیمتوں کے



انتہائی ہمتیاد کرنا کسی بھی طرح یا تر قرضوں میں بیایا جا سکے (جدید فقہی تحقیقات ۱۱۸۸)۔

۲۔ البتہ قرض دیتے وقت یا مہر مقرر کرتے وقت اور اجراء قرضوں کی کے وقت طرفین واجب انفاق و اتوات کی مالیت سونے یا چاندی میں طے کر لیں۔ اور بوقت انفاق سونے یا چاندی کی قیمت کے مساوی اتواتوں کی انفاق پر محالہ کریں، مثلاً اس طرح کہ آج دو تولہ چاندی کے برابر سو روپیہ قرض میں دے رہا ہوں اور وصولیائی کے وقت دو تولہ چاندی کے برابر روپیے لیں یا اتوات کتنے ہی اتواتوں کے برابر ہو (جدید فقہی تحقیقات ۱۱۸۹)۔

اور ”مہر“ کے بارے میں تو سب سے آسان اور سہل صورت اور عورتوں کے حق میں بہتر یہی ہے کہ اس کو سونے یا چاندی کی شکل میں طے کر لیا جائے، اس میں عورت اس کی قیمت یا تر کے نرخ سے وصول بھی کر لیں گی اور اس میں شرعاً کوئی حرج بھی واقع نہیں ہوگا اور نہ عورت خرابہ میں رہے گی، اور مرد پر کوئی تر انتہیاد بھی نہیں پڑے گا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

## موجودہ کرنسی کی شرعی حیثیت سے متعلق سوال کا جواب

☆ مولانا عبداللطیف پالنپوری ☆

۱۔ یقیناً کاغذی نوٹوں کی اپنی ذاتی کوئی قیمت نہیں ہوتی، اور افراط زر کی صورت میں اس کی قوت خرید تیزی سے گرجاتی ہے، لیکن اس کے باوجود یہ عرفی ثمن ہے، دوسری طرف یہ بات بھی متفق علیہ ہے کہ شریعت اسلامیہ نے قرضوں کی ادائیگی میں اسی مقدار کے مثل کو واجب قرار دیا ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ یہ مثلیت اور برابری مقدار میں ضروری ہے یا قیمت و مالیت میں؟ دلائل شرعیہ میں غور کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ قرضوں کی واپسی میں جو برابری شریعت میں مطلوب ہے وہ مقدار اور کمیت میں مطلوب ہے، قیمت اور مالیت میں مطلوب نہیں۔ مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ نے اپنے مقالہ ”کرنسی کی قوت خرید“ میں دلائل کو تفصیل سے بیان فرمایا ہے (فقہی مقالات ۱/ ۵۳)۔

لہذا دیون یعنی مؤخر مطالبوں مثلاً قرض، مہر، ادھار خریداری کی رقم، اور وقت پر ادا نہ ہونے والی تنخواہوں کو قیمتوں کے اشاریہ کے ساتھ وابستہ کرنا شرعاً صحیح نہ ہوگا، اور یہ باب ربوا کے کھلنے کا ذریعہ ہوگا (فقہی مقالات ۱/ ۷۳)۔

۲۔ سوال نامہ میں مذکورہ صورت شرعاً صحیح نہیں ہے، ہاں یہ صورت ہو سکتی ہے کہ قرض دیتے وقت بجائے نوٹ کے سونا یا چاندی بطور قرض دے، یا مہر کے تقرر کے وقت یا ادھار فروختگی

☆ دارالعلوم جامعہ ندویہ، کاکوی، گجرات۔

کے وقت بجائے نوٹ کے سونا یا چاندی طے کیا جائے، پھر ادائیگی کے وقت یا تو اسی قدر سونا اور چاندی ادا کرے یا سونے یا چاندی کے بدلے میں اس کی قیمت کے مساوی نوٹ ادا کئے جائیں، لیکن نوٹ ادا کرنے کی صورت میں اسی مجلس میں نوٹ پر قبضہ ضروری ہے تاکہ بیع الدین بالذین لازم نہ آئے:

”ولا یصح السلم حتی یقبض رأس المال قبل أن یفارقہ فیہ أما إذا کان من النقود فلأنه افتراق عن دین بدین وقد نهی النبی علیہ السلام عن الکالی بالکالی“ (ہدایہ ۳/۹۶ باب السلم)۔

(اور بیع سلم صحیح نہیں ہے یہاں تک کہ رأس المال پر اسی مجلس میں جدا ہونے سے پہلے قبضہ کر لے، وجہ یہ ہے کہ جب رأس المال نقد میں سے ہوگا تو افتراق عن دین بدین لازم آئے گا، حال یہ کہ رسول اللہ ﷺ نے ادھار کو ادھار کے بدلے میں بیچنے سے منع فرمایا ہے)۔  
پنشن حکومت کی طرف سے ایک عطیہ ہے، جز واجرت نہیں ہے (فتاویٰ مجموعیہ ۲۱۳ مکتبہ صدیق ڈابھیل)۔

لہذا حکومت اگر پنشن کو قیمتوں کے اشاریہ کے ساتھ وابستہ کر کے ادا کرے، چاہے کسی صورت میں یا زیادتی کی صورت میں تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے، اس لئے کہ یہ تبرع ہے۔

## موجودہ کرنسی سے متعلق جوابات

مفتی شیری علی گجراتی ☆

مہر موجل، پنشن وغیرہ میں معیار کا پیمانہ کیا ہوگا؟

دیون یعنی موخر مطالبات مثلاً قرض، مہر موجل، پنشن، ادھار خریداری کی رقم اور وقت پر ادا نہ ہونے والی تنخواہوں کی ادائیگی کے لئے سونے کو معیار بنایا جانا چاہئے؛ اس لئے کہ سونا ہی ثمن حقیقی ہے۔

اور اگر ڈالر کو معیار بنائے جائے تب بھی درست ہے؛ کیوں کہ وہ ثمن عرفی عام ہے اور بین الملکی تجارت اور معاملات حکومتوں کے درمیان ڈالر ہی کے ذریعہ انجام پاتے ہیں، اور ڈالر میں زیادہ تر انحطاط نہیں ہوتا ہے برخلاف دیگر ممالک کی کرنسی کے، مثلاً ہندوستان کے روپیہ میں اکثر اوقات گزراوٹ زیادہ رہتی ہے۔

اور ویسے بھی ہندوستان کا روپیہ ثمن عرفی خاص ہے اور ڈالر ثمن عرفی عام ہے اور جب ثمن عرفی عام اور ثمن عرفی خاص میں تعارض ہو جائے تو ثمن عرفی عام کو ترجیح حاصل ہوتی ہے۔  
واللہ تعالیٰ اعلم۔

## موجودہ کرنسی کا شرعی پہلو

مفتی اسماعیل بن ابراہیم بھٹ کو دروی ☆

۱- عرف حادث میں کاغذی نوٹوں نے شمن عرفی کی حیثیت لے لی ہے اور جمہور مفتیان کرام نے زکوٰۃ وغیرہ کی ادائیگی میں اس پر شمن عرفی کا حکم لگایا ہے، اس کو سونا، چاندی یا کسی مالیت کا وثیقہ نہیں شمار کیا ہے نیز کچھ بڑے ممالک نے اس کے سونے میں ناقابل تبدیل ہونے کا اعلان بھی کر دیا ہے جیسا کہ جناب محمد سلیمان تنولی صاحب اپنے ایک مضمون بعنوان ”نصاب زکوٰۃ: اجتہاد کی ضرورت“ میں لکھتے ہیں:

”تاہم جب ۵/ اگست ۱۹۲۱ء کو امریکہ نے ڈالر کے سونے میں ناقابل تبدیل ہونے کا اعلان کیا تو سونے کا پیسے سے تعلق تقریباً ختم ہو گیا، اس طرح اب زکوٰۃ کی تعیین کے لئے روپے کو چاندی یا سونے سے منسلک کرنے کا کوئی جواز نہیں، شرعاً جواز تب تھا جب قانوناً نوٹ چاندی یا سونے میں قابل تبدیلی تھے، اب ایسا نہیں، اس لئے شرعاً کوئی جواز نہیں“ (ماہنامہ الفرقان: مارچ ۲۰۰۵ء)۔

اور حکومت کا کوئی بینک کاغذی نوٹوں کے عوض اس کی قیمت کے برابر نوٹ بردار کو سونا دینے کا قانوناً ذمہ دار اور پابند بھی نہیں سمجھتا، لہذا اس کو اتنی قیمت کے سونا، چاندی کا وثیقہ سمجھنا اور موخر مطالبات میں سونے چاندی کی قیمت کے اعتبار سے نوٹوں کی ادائیگی کو ضروری قرار دینا یہ

☆ دارالعلوم عربیہ اسلامیہ کلتھاریہ بھروج۔

شرعاً، قانوناً و عرفاً جائز نہیں ہے، وہ صرف ایک عدوی ثمن عرفی ہے، لہذا اسی عدد کے اعتبار سے ادائیگی ضروری ہونی چاہئے۔

رہی بات مؤخر مطالبات میں کاغذی نوٹ کی مالیت کو اشیاء ضرورت کی قیمتوں کے ساتھ وابستہ کرنا تو یہ بھی مشکل ہے، اولاً تو اس لئے کہ اشیاء ضرورت کی تعیین کیسے ہوگی؟ ثانیاً اس لئے کہ پڑھے لکھے لوگ بھی اس وابستگی کا مطلب صحیح طور پر نہیں سمجھتے اور نہ سمجھا پاتے ہیں، پھر عوام الناس جن کو اس بنیاد پر معاملہ کرنا ہوگا وہ بغیر جانے، سمجھے کیسے معاملہ کر پائیں گے، لہذا یہ کہنا صحیح ہے کہ عامۃ الناس کے درمیان ادائیگیوں کے لئے (کاغذی نوٹ کے) ایسے معیار مقرر کرنا جن کی بنیاد فنی اصولوں پر ہو، باہمی تنازعہ کا موجب ہوگا، نیز اس طرح سو روپے کے بدلہ پانچ روپے کی ادائیگی باب ربوا کو کھولنے کا ذریعہ بنے گی۔

اور قانوناً اور عرفاً بھی ایسی ادائیگی کو سود ہی پر محمول کیا جاتا ہے اور شرعاً بھی یہی حکم ہوگا۔

۲- قرض میں تو قرض لی ہوئی چیز کی مثل لوٹانی ضروری ہوتی ہے لہذا قرض لیتے وقت نوٹ کی مالیت سونے یا چاندی میں طے کر کے قرض کی ادائیگی اتنے سونے یا چاندی کی نوٹوں سے طے کرنا یہ نوٹ کو ثمن عرفی ماننے کی صورت میں سودی معاملہ ہو جائے گا، لہذا جائز نہیں ہے۔

البتہ کسی سامان کی ادھار فروختگی کے وقت جتنے نوٹ میں خریدنے کا ارادہ ہے اتنی قیمت کے سونے یا چاندی کو ثمن مؤجل کے طور پر طے کیا جائے تو یہ جائز ہے، ایسے ہی نکاح کے وقت مہر مؤجل میں سونے یا چاندی کی جائز مقدار کو متعین کرنا بلاشبہ جائز ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

## کرنسی نوٹ

مولانا محمد صدرا الحسن قاسمی ☆

۱- دوسرے فقہی سمینار میں شرکاء سمینار نے کرنسی نوٹ کی حیثیت کو واضح کر دیا ہے اور یہ فیصلہ کیا ہے کہ:

(۲) ”کرنسی نوٹ سند و حوالہ نہیں ہے بلکہ ثمن ہے اور اسلامی شریعت کی نظر میں کرنسی نوٹ کی حیثیت زراصلحی و قانونی کی ہے۔“

(۲) ”عصر حاضر میں نوٹوں نے ذریعہ تبادلہ ہونے میں مکمل طور پر زر خلقی (سونا، چاندی) کی جگہ لے لی ہے اور باہمی لین دین نوٹوں کے ذریعہ انجام پاتا ہے، اس لئے کرنسی نوٹ بھی احکام میں ثمن حقیقی کے مشابہ ہے؛ لہذا ایک ملک کی کرنسی کا تبادلہ اسی ملک کی کرنسی سے کی ویشی کے ساتھ نہ تو نقد جائز ہے نہ ادھار۔“

مذکورہ فیصلہ نے کرنسی نوٹ کو زر خلقی کے مشابہ قرار دیکر اس معاملہ کو آسان کر دیا کہ مؤخر مطالبوں میں بھی زر خلقی کا ہی حکم ہوگا اور جس طرح زر خلقی کو کسی اشارہ سے وابستہ نہیں کیا جاسکتا ہے اسی طرح اس کو بھی کسی اشاریہ سے وابستہ کرنا صحیح نہیں ہوگا۔ ہاں اگر اس کی ثمنیت کو باطل کر کے شیخین کے مسلک پر بیع کا درجہ دیا جائے تو کمی بیشی کے ساتھ تبادلہ جائز ہوگا فلوس پر قیاس کرتے ہوئے۔

پھر اس میں اشاریہ سے وابستہ کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہے، نوٹ بھی معزز مال ہے، عرف و رواج میں کسی کے وہم و خیال میں بھی یہ بات نہیں ہے کہ اس کی مالیت مفقود ہے؛ البتہ زکوٰۃ کے باب میں اس کو اموال تجارت کا حکم ہے۔ مگر اس کی وجہ یہ ہے کہ زکوٰۃ کے باب میں معیار نصاب چاندی ہے اس وجہ سے کرنسی نوٹ کو اموال تجارت کا حکم ہے۔ باقی تمام معاملات میں کرنسی نوٹ کی ثمنیت کا اعتبار کرتے ہوئے مؤخر مطالبات میں کمی بیشی کرنا یا اس کو اشاریہ سے وابستہ کرنا صحیح نہیں ہے۔ پھر یہ کہ کھلے عام ربوا کی چھوٹ ہو جائے گی، لہذا سد ذرائع میں اس کو داخل کر کے ربوا کے دروازہ کو بند کرنا لازم ہے۔

قرض ایک تبرع اور بجکم عاریت ہے اس لئے قرض دینے والا بھی یہ سمجھ کر ہی قرض دیتا ہے کہ پانچ سال یا دس سال کے بعد مجھے اسی مقدار میں رقم واپس ملے گی اور اسی مقدار کا مطالبہ بھی ہوتا ہے اور یہی حکم دوسرے دیون کا بھی ہے، صرف فرق یہ ہے کہ قرض میں مدت متعین کرنے کے باوجود متعین نہیں ہوتا ہے، قرض دینے والا جب چاہے واپسی کا مطالبہ کر سکتا ہے البتہ دین میں مدت کی تعیین ہوتی ہے اور اس کی پابندی لازم ہوتی ہے، لیکن مدت کسی ثمن کا معاوضہ بننے کی صلاحیت نہیں رکھتی ہے اس لئے قیمتوں کے اتار چڑھاؤ کا کوئی اعتبار کئے بغیر مؤخر مطالبوں میں کمی بیشی کی گنجائش نہیں ہے۔

۲- سونے اور چاندی میں بھی طے کرنا صحیح نہیں ہے، جبکہ ادائیگی کرنسی نوٹ کی کرنسی نوٹ سے ہی ہو؛ کیونکہ اس صورت میں یہ ایک من گھڑت حیلہ ہوگا اور اس کو حیلہ شرعی نہیں کہا جاسکتا ہے؛ کیونکہ اگر ہم پندرہ ہزار روپے کسی کو یہ کہہ کر دیں کہ یہ پچاس تولہ چاندی کی قیمت کے برابر ہے دس سال کے بعد پچاس تولہ چاندی کی جو قیمت ہوگی اسی مقدار میں ہم یہ روپیہ واپس لیں گے۔

تو اس صورت میں ممکن ہے کہ چاندی کی قیمت میں گرواٹ آجائے اور پچاس تولہ کی



قیمت صرف پانچ ہزار ہو تو کیا ایسی صورت میں دائن کو صرف پانچ ہزار روپیہ ہی ملے گا؟ اس دائن کا دس ہزار روپے کا نقصان ہے اور قیمت کے اضافہ کی صورت میں مدیون کا نقصان ہے کہ اس کو حق مطالبہ سے زیادہ ادا کرنا پڑ رہا ہے۔

احکام شرع میں عرف کو بڑا دخل ہے اور اب تک عرف میں جو معمول بہا ہے اس کو اپنے حال پر رہنے دینا ہی مناسب ہے، اس لئے میری رائے فقہ کی جزئیات کے مطالعہ کے بعد اسی نتیجہ پر پہنچی ہے کہ مؤخر مطالبوں میں کرنسی نوٹ کی قیمت کو نہ تو کسی اشاریہ سے وابستہ کیا جائے اور نہ سونے اور چاندی کی قیمت میں طے کریں۔

## موجودہ کرنسی کی شرعی حیثیت

مولانا ثار احمد گودھروی ☆

نوٹ کی ایک قیمت ہے جو اس پر لکھی ہوئی ہے جس کو قیمت اسمیہ کہا جاتا ہے اور ایک اس کی قوت خرید ہے جس کو قیمت حقیقیہ کہا جاتا ہے۔

۱۔ مسئلہ یہ ہے کہ دیون کی واپسی قیمت اسمیہ کے مطابق ہونی چاہئے یا قوت خرید کے مطابق؟

اصل تو دیون اور قرضوں میں مماثلت فی المقدار کا اعتبار ہے نہ کہ مماثلت فی القیمۃ کا جیسا کہ فقہاء کے کلام سے مترشح ہوتا ہے: ”الديون تقضى بأمثالها الأقرض تقضى بأمثالها“ مراد اس سے مماثلت فی المقدار ہے۔ آج جو انڈیکس (اشاریہ) کا نظریہ پیش کیا جاتا ہے جس کا تعلق فنی اصولوں سے ہے، اور فقہی نقطہ نظر سے بھی غلط ہے جس کی تفصیلی بحث حضرت مولانا محمد تقی عثمانی نے اپنی کتاب اسلام اور جدید معیشت و تجارت میں فرمائی ہے، رہا قذو کے کم نہ ہونے کا معاملہ اس میں دیون اور مستقرض کا عمل و دخل نہیں، لہذا اس کی ذمہ داری دیون پر ڈالنا سراسر ظلم ہے، خاص کر کے قرض دینے کے بعد زیادتی کی امید رکھنا بھی درست نہیں۔ زیادتی کو حاصل کرنے کے لئے شریعت نے شرکت، مضاربت کا طریقہ رکھا ہے، اس پر عمل کیا جائے۔

## موجودہ کرنسی اور شرعی نقطہ نظر

مولانا محمد ذکاء اللہ شبلی ☆

یہ ایک حقیقت ہے کہ کاغذی نوٹوں کی حیثیت روز بروز گرتی جا رہی ہے، اس لئے ایسے دیون جن کی ادائیگی کے لئے فریقین کے درمیان جو مدت یا تاریخ طے پائی ہو اس کے اندر ادائیگی سے مدیون نے غفلت برتی اور تقاضا کے باوجود کوئی معقول بات پیش نہیں کی اور عرصہ گزر گیا تو ایسے معاملہ میں اس کی ادائیگی کے مطالبہ پر فریقین کے درمیان جو مدت طے پائی تھی اور اس وقت اس قدر رقم میں جتنی چاندی خریدی جاسکتی تھی قاضی اس قدر چاندی دینے کا فیصلہ دے سکتا ہے۔

البتہ شق دوم میں جو صورت مذکور ہے لین دین کے وقت ہی رقم کے بدلے اسی قدر سونے یا چاندی یا اس کی قیمت کی ادائیگی کی شرط کر لی جائے تو یہ زیادہ بہتر اور مناسب ہے اور ہر قسم کے خسارے و نزاع سے حفاظت ہے۔

## موجودہ کرنسی کی شرعی حیثیت

حافظ کلیم اللہ عمری مدنی ☆

۱- صورت مذکورہ میں جس وقت کرنسی کی قیمت تھی اسی کی ادائیگی ہوگی، اس لئے کہ فریقین کے مابین یہی طے ہوا تھا اور اس لئے بھی کہ وقت ادائیگی رقم بڑھ جاتی ہے اور یہ مثل ربا ہے جیسا کہ کسی نے کرنسی یا سکہ کی شکل میں قرض لیا تھا اور کرنسی یا سکہ منسوخ ہو جائے تو امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے پاس طے شدہ اصول کے تحت وہی سکہ یا کرنسی ادا کریگا جبکہ صاحبین کے پاس قیمت ادا کی جائے گی لیکن اس میں ربا کا شائبہ موجود ہے جیسا کہ کتاب الصرف میں امام صاحب اور صاحبین کا سکہ راجح الوقت کے سلسلہ میں اختلاف مذکور ہے جب وہ سکہ منسوخ ہو جائے۔

ولو استقرض فلوسا نافقة فكسدت عند أبي حنيفة رحمه الله يجب عليه مثلها لأنه إعارة وموجبه رد العين معنى والشمية فضل فيه إذ القرض لا يختص به وعندهما تجب قيمتها لأنه لما بطل وصف الشمية تعذر ردھا كما قبض فيجب رد قيمتها (الغاية شرح الهدية ۱۰/۳۲)۔

۲- بوقت ادائیگی اسی قدر سونے یا چاندی کی قیمت کے مساوی نوٹوں کی ادائیگی میں شرعا کوئی حرج نہیں ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔



# جدید فقہی تحقیقات

## پانچواں باب اختتامی امور



## مناقشہ

## موجودہ کرنسی کی شرعی حیثیت

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی:

حضرات! اس وقت نہایت اہم موضوع آپ کے سامنے ہے، معیشت کی ایک اہم ضرورت ایک ایسی چیز کا وجود ہے جو تبادلہ کا ذریعہ بنے، اسی کو ٹمن یا زریا کرنسی کہتے ہیں، اگر کرنسی کا وجود نہ ہو تو کسی کے پاس چاول تو ہو، کپڑے نہ ہو تو اول تو اسے کپڑے حاصل کرنے کے لئے منوں اور بعض اوقات ٹمنوں چاول کا ڈھیر اپنے گھر سے کپڑے کی مارکیٹ تک لے جانا پڑے گا، تاکہ کپڑوں سے اس کا تبادلہ ہو جائے، پھر یہ عمل ضروری نہیں ہے کہ جب چاول کا اتنا سا رابو جھ اٹھا کر وہ کپڑے کی دکان پر پہنچے تو کپڑا بیچنے والے کو چاول کی ضرورت بھی ہو اور وہ اسے قبول بھی کر لے، اسی لئے ضرورت محسوس کی گئی کہ کوئی ایسا ذریعہ تبادلہ ہو جس کا وزن کم ہو اور اس کی قدر بڑھی ہوئی ہو، انسان کی اس ضرورت کے لئے اللہ نے سونے چاندی کو پیدا فرمایا اور تمام لوگوں نے ذریعہ تبادلہ کی حیثیت سے اسے تسلیم کر لیا اس لئے اس کو ٹمن خلقی کہتے ہیں۔

پھر ایسا ہوا کہ آہستہ آہستہ کاغذی نوٹوں اور معدنی سکوں نے سونے چاندی کی جگہ لے لی، یہ کیوں ہوا؟ اس کی ایک طویل تاریخ ہے؛ لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سونے چاندی کی تو بجائے خود قیمت و اہمیت تھی، لیکن ان کاغذی نوٹوں کی خود کوئی قیمت نہیں ہے، اسی لئے یہ سوال پیدا ہوا کہ کاغذی نوٹ اصل ٹمن ہیں یا وثیقہ ٹمن ہیں؟ اگر اصل ٹمن ہوں تو لین دین میں نوٹوں کی تعداد کا اعتبار ہوگا، اور وثیقہ ٹمن ہوں تو لینے اور ادا کرنے کے وقت کی قوت خرید معتبر ہوگی، اگر اس کو



بعینہ شمن مان لیا جائے تو تاجر سے ادا کی جانے والی رقم قوت خرید کے اعتبار سے بعض اوقات نصف یا اس سے بھی کم ہو جاتی ہے، تو ظاہر ہے کہ یہ تقاضہ عدل کے خلاف محسوس ہوتا ہے، جب کہ احکام شریعت کی بنیاد عدل پر ہے، اور اگر قوت خرید کا لحاظ کرتے ہوئے ادائیگی کے وقت زیادہ نوٹ واپس کئے جائیں تو سود کا شبہ پیدا ہوتا ہے اور سود کی شناعت ظاہر ہے۔

ان دو جہتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس مسئلہ کو آپ حضرات کے سامنے پیش کیا گیا ہے، امید ہے کہ شریعت کے اصولوں کو اور فقہاء کے اجتہادات کو سامنے رکھ کر آپ مسئلہ کے تمام پہلوؤں پر غور فرمائیں گے، اور امت کو آپ کے علم سے روشنی حاصل ہوگی۔

مولانا محمد علی الدین صاحب (بڑودہ):

میں اس تجویز کے بے سود ہونے کے ایک پہلو کی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہوں، پنشن، تنخواہ ایک الگ چیز ہے، اس میں اگر کوئی خسارہ کا اشتباہ ہے تو تنخواہوں کے اضافے، پنشن کے اضافے وغیرہ سے اس کی تلافی پوری ہو جاتی ہے۔ مہر کا مسئلہ تو خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سونے اور چاندی ہی سے مہر کو مقرر کیا اپنی ازواج مطہرات اور صاحبزادی کا اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے، تو مہر مثلاً ایک تولہ سونا متعین ہو گیا، ٹھیک ہے لیکن آج نکاح ہوا اور ایک شخص شوہر یہ سمجھتا ہے کہ ایک تولہ پانچ ہزار کا ہے اور اس لحاظ سے اس نے متعین کر دیا، اب ظاہر بات ہے کہ اب دو مہینے کے بعد، تین مہینے کے بعد، چار مہینے کے بعد سونے کی قیمت جیسا کہ آج کل کیسا ہو رہا ہے اضافہ ہو گیا، اب جو ہے شوہر جس نے یہ سمجھا تھا کہ پانچ ہزار کا سونا میں لا کر کے دے دوں گا، اس کے ذمہ مطالبہ اب پندرہ ہزار کا ہو گیا ہے اور عورت وہ سمجھ رہی تھی کہ اب میں پندرہ ہزار کی مستحق ہوں، تو ظاہر بات ہے کہ ہم اگر سونے کے اندر بھی روپیوں کی قیمت متعین کرتے ہیں تو یہی بات تنخواہ وغیرہ میں بھی لازم آئے گی کہ اگر سونے سے ہم نے تنخواہ کی

تعیین کردی یا ادھار کا، قرض کی ادائیگی کا تو اب اس صورت میں یا جس سونے سے ہم نے متعین کی تو اب اگر تنخواہ میں دیر ہوئی ہے، تاخیر ہوئی ہے یا پورے مہینہ کی تنخواہ اور چاندی کی قیمت ہر روز گھٹتی بڑھتی رہتی ہے تو اس کے پیش نظر ادائیگی کو اشاریہ سے وابستہ کرنے میں دقتوں اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔

مولانا یاسر ندیم قاسمی (دیوبند):

.....کیس کا اعتبار ہے کیفیت کا نہیں یہی وجہ ہے کہ کتب فقہ میں اس کی تصریح ملتی ہے کہ سونے کا سونے سے تبادلہ ہو تو اس میں اس کے جید یا ردی ہونے کو ملحوظ نہیں رکھا جاتا، لہذا کرنسی اگرچہ سونے کی ترجمانی نہیں کرتی، مگر ثمن عرفی ہونے کی بناء پر اس کو کسی نہ کسی چیز سے متعلق کرنا ضروری ہے اور جیسا کہ میں نے ابھی کہا کہ سونے سے متعلق کرنا قرین قیاس ہے، اس لیے کرنسی کا اگر کسی نے سو روپے قرض لیے دس سال کے بعد اگرچہ اس کی حیثیت میں اور عرفی قدر میں کوئی کمی زیادتی ہوئی ہو، لیکن اس کو سو ہی روپے واپس کرنے ہیں، اس لیے کہ جیسا کہ میں نے ابھی ذکر کیا کہ سونے میں کیت کا اعتبار ہے کیفیت کا نہیں۔ جزاکم اللہ

مفتی اعجاز الحسن صاحب (کشمیر):

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ سب سے پہلے میری گزارش سوالنامے کے اندر یہ ہے کہ جس طرح سے سوالنامے میں قرض، مہر، پنشن، ادھار، خریداری کی رقم یا وقت پر ادانہ ہونے والے تنخواہوں کے بارے میں شقیں داخل کی گئی ہیں، ایک شق کا اس میں اضافہ کیا جائے وہ یہ ہے کہ ہمارے کشمیر میں خصوصاً اور ممکن ہے کہ ہندوستان کے دوسرے علاقوں میں بھی یہ شکل ہو یا عالمی سطح پر بھی یہ نوعیت ہو کہ ہمارے یہاں خوشی و غمی کے موقع پر ہدایا لینے اور دینے کا رواج ہے اور ان ہدایا کے اندر شکل ظاہری اعتبار سے ہوتی ہے ہدیہ کی، لیکن حقیقت کے اعتبار سے اس کی شکل ہوتی ہے

لین دین کی، اب اگر آج اس سال کوئی شخص کسی کو ہدیہ پیش کر رہا ہے کسی خوشی کے موقع پر، دس سال کے بعد یہ آدمی اس کو کسی خوشی کے موقع پر واپس ہدیہ دے رہا ہے، آج جو پانچ سو ہدیہ دے رہا ہے اس کے ذہن میں یہ شکل ہوتی ہے کہ واپسی کے موقع پر اس سے زیادہ رقم مجھے دے گا۔ اگر وہ کم دیتا ہے تو لینے والا ناراضگی کا اظہار کرتا ہے، اس شق کا بھی اس میں اضافہ کیا جائے۔ دوسری گزارش یہ ہے کہ مہر کے سلسلہ میں ہم لوگ تو اتنا اختیار رکھتے ہیں شریعت کی روشنی میں کہ ہم لوگ اس کے اندر سونے یا چاندی کو معیار بنائیں۔

مفتی محمد زاہد علی خان صاحب (علی گڑھ):

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ میں یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ ثمنیت کے سلسلہ میں جو بات کہی گئی ہے کہ اس کو، کرنسی کو آیا اصطلاحی ثمن یا عرفی ثمن تسلیم کیا جائے یا وثیقہ ثمن۔ تو میری ذاتی رائے یہ ہے کہ اس کو اصطلاحی ثمن یا عرفی ثمن تسلیم کرنے میں زیادہ فائدہ ہے، نہ کہ وثیقہ ثمن صرف تسلیم کرنا۔ اگرچہ پہلے وثیقہ ثمن کے طور پر اس پر لکھا رہتا تھا، اس کے علاوہ صرف سونے کو متعین کر لینا بھی خلاف عدل معلوم ہوتا ہے، اس لیے کہ دنیا کا جو مالیاتی نظام ہے اس حد تک بدل چکا ہے کہ صرف سونے کے اندر بسا اوقات گرانی ہو جاتی ہے، باقی چیزوں کے اندر گرانی اس حد تک نہیں ہوتی ہے، لہذا کرنسی غیر ہنگامی حالات میں معیار ہونا زیادہ قرین انصاف ہے بنسبت سونے کے معیار بنانے کے۔ اس کے علاوہ یہ ایک جو رائے ہے کہ اموال ربویہ میں کمیت کا اعتبار کیا جائے گا کیفیت کا اعتبار نہیں کیا جائے گا، یہ بات اگر قاعدہ بنا دیا جائے تو خلاف عدل ہونا زیادہ ممکن ہے، اس کے علاوہ ایک اور بات بھی ہے کہ اگر اس پر چلا جائے گا تو کوئی کسی کو سود کے بغیر رقم دے ہی نہیں سکتا، چونکہ اس کو کوئی فائدہ ہی نہیں ہوگا الٹا نقصان ہوگا، لہذا کبھی کسی کو قرض ملنا ممکن نہیں ہے اور یہ صورت اضطرار کی پیدا کر دیتا ہے، کسی کو اپنے کسی قاعدہ فقہیہ کی بنیاد

پر ہم اس کو بنیادی حقوق سے محروم کر دیں، یہ بات بہت صحیح نہیں ہے، چوں کہ قیام عدل فرض ہے اور قیام عدل کے بہر حال یہ خلاف ہے تو اٹمان خلقیہ اور اٹمان عرفیہ دونوں کا اعتبار کرتے ہوئے اس زمانے میں چوں کہ دنیا میں جورانج ہے اور تقریباً تمام ملکوں کا اتفاق ہے کہ اٹمان عرفیہ جو ہیں وہ معتبر ہیں اس اعتبار سے اس کا خیال رکھنا از حد فائدہ مند ہوگا، پنشن کے سلسلہ میں یہ کہدینا کہ یہ صرف مستاجر کی طرف سے تبرع ہے، اس کو عام طور پر جو گویا ہم لوگوں سے دستخط کرائے جاتے ہیں یہ اس کے خلاف پایا جاتا ہے، یہ دنیا میں جو عام طور سے اتفاق ہے اس سلسلہ میں اس کے بھی خلاف پایا جاتا ہے، بلکہ یہ حقیقتاً حق الخدمت ہے جو متآخر اور ضرورت کے موقع پر ہم کو مل جاتا ہے نہ کہ اس کو صرف تبرع قرار دینا، تبرع کو بہر حال کسی بھی وقت منع کیا جاسکتا ہے، حق الخدمت کو منع نہیں کیا جاسکتا؛ لہذا دیون متآخرہ ہوں یا مؤخر مطالبے ہوں اس میں کرنسی کو اس وقت جو معتبر قرار دیا گیا ہے ہم کو بھی اس کا خیال رکھنا پڑے گا چوں کہ یہ عدل کے زیادہ قریب ہے اور یہ میری ایک رائے ہے، واللہ اعلم بالصواب۔ جزاکم اللہ

مولانا محمد مبین سلیم ندوی صاحب (علی گڑھ):

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ یہاں پر کئی مباحث سامنے آئے، اس میں سے جو بات سامنے نہیں آئی وہ یہ تھی کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں جو سکے، دراہم و دنانیر موجود تھے۔ اس میں سے اصل کونسا سکہ تھا جس پر قیاس کر کے صحابہ کرام دوسرے سکوں کو جوڑتے تھے، یہ ابھی تک کسی کے سامنے بحث نہیں آئی ہے تو اس میں علامہ ماوردی نے اور علامہ بلاذری نے اور ابن خلدون نے اس کی تفصیلات ذکر کی ہیں، اس میں سے یہ ہے کہ جو دینار کی کرنسی تھی وہ تو متفق علیہ طور پر لوگوں کے درمیان معروف تھی، پھر ایک دینار کا کتنا وزن ہے اس کے اندر کوئی اختلاف نہیں تھا۔ لیکن دراہم کی جو کرنسی موجود تھی اس میں اختلاف پایا جاتا تھا۔ تو دراہم تین قسم کے تھے،

وزن بھی تین قسم کے تھے حضرت عمرؓ کے زمانہ میں، حضرت عمرؓ نے اس کو مشورہ کر کے متعین کر دیا اس کے بعد اس زمانے تک اسلامی کرنسی وجود میں نہیں آئی تھی، بلکہ جو روپی اور کسروی کرنسیاں تھیں وہی چلتی تھیں، اس کے بعد عبدالملک بن مروان کے زمانہ میں جب اسلامی سکے کو ڈھالا گیا یعنی دینار اور درہم کو، تو درہم کے اندر بھی یہی خیال رکھا گیا کہ جو تین قسم کے درہم کی تعداد ہے اور وزن ہے، اس کا اوسط متعین کر کے جیسا کہ علامہ ماوردیؒ نے لکھا ہے انہوں نے اس بات میں اس دینار کے اصل وزن اور قیمت کا خیال رکھا، جیسا کہ علامہ ماوردیؒ لکھتے ہیں: عہد فارس میں تین وزن کے درہم مضروب ہوتے تھے، ایک تو مثقال کے وزن سے بیس قیراط کا، دوسرا بارہ قیراط کا، تیسرا دس قیراط کا، عہد اسلامی میں درہم ڈھالنے کے وقت ان تینوں کا مجموعہ یعنی بیالیس قیراط کا اوسط یعنی چودہ قیراط لیکر اس وقت درہم ضرب کرایا گیا، ایسے درہم کا وزن سات مثقال کے برابر ہے، اور بعض کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے جب درہم میں اختلاف پایا، کوئی درہم بغلی وزن آٹھ دانق کوئی تبری وزن چار دانق، کوئی مغربی وزن تین دانق اور کوئی یمنی وزن ایک دانق، تو حکم دیا کہ سب سے اعلیٰ اور سب سے ادنیٰ کو جو زیادہ مروج ہو جمع کر دو، اس طریقہ سے انہوں نے اوسط نکالا، کہنے کا مقصد یہ ہے کہ چوں کہ سونے اور چاندی کا معیار تقریباً قریب قریب تھا تو انہوں نے چاندی کے سکے کو ڈھالتے وقت اس بات کا خیال رکھا کہ فرق اس کا سونے کے وزن سے اور اس کی قیمت سے کیا ہے، ایک تو اس میں اصل جو قرار دیا جائے وہ سونے کے سکے کو اصل قرار دیا جائے اور اس کے وزن کے اعتبار سے قیمت کا تعین ہو۔

دوسری بات کرنسی کے سلسلہ میں کہ یہ کرنسی جو اس وقت موجود ہے اس کو وثیقہ شمن قرار دیا جائے، یہ تو نہ بینک اس کا التزام کرے گی، اور بینکوں نے بھی اس کا انکار کر دیا ہے اس لیے یہ خود نقدین کی طرح کی حیثیت رکھتی ہے، اسی لیے اس صورت حال میں جو اس وقت مسئلہ ہے قرض و ادھار کا، اگر قرض دیتے وقت یہ تعین کیا جائے کہ اس وقت سونے کی مقدار میں اتنی قیمت

ہوتی ہے، اسی وقت تعین کیا جائے، اور جب وہ ادا کرے قرض کو، اس وقت سونے کی جو قیمت ہو اس کو واپس کرے، یہ زیادہ بہتر ہوگا اور ربوا سے بھی خالی ہوگا۔ جزا کم اللہ

مولانا ظہیر الدین صاحب (کانپور):

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد: ”أحل الله البيع وحرم الربوا“ اس میں جو ربوا ہے اور اس کا جو اصل مقصد ہے، اس کی طرف ہم کو غور کرنا چاہیے کہ اس میں عدل کو پیش نظر رکھا گیا ہے جیسا کہ اسی آیت کریمہ میں آگے چل کر فرمایا: ”لا تظلمون ولا تُظلمون“ نہ تم ظلم کرو اور نہ تمہارے اوپر ظلم کیا جائے، اس سے سمجھ میں آتا ہے کہ جو لا تظلمون ہے، اس کا مطلب ہے کہ اخذ ربوا کے سلسلہ میں کہ ربوا نہ لیا جائے، اضافہ نہ لیا جائے، لیکن جو دوسرا ہے اس کا مقصد ہے ولا تظلمون گویا کہ اس کے اوپر ظلم نہ کیا جائے تو اس کا مقصد یہ بھی ہے کہ جتنا اس نے لیا اتنا کم از کم واپس بھی ہونا چاہئے، اس کے پیش نظر اگر ہم دیکھیں اس پر غور کریں تو سمجھ میں آتا ہے کہ آج کل کی جو کرنسی ہے اس کو سونے کے ساتھ ہی مربوط کرنے میں عافیت ہے، سارے لوگوں کا مفاد اس میں ہوگا، اور اس میں جو شبہ ربوا کی بات کہی جا رہی ہے تو اس کا موازنہ کم از کم جو صراحت کے ساتھ ولا تظلمون ہے اس پر ہمیں غور و فکر کرنا چاہئے، اس کے ذریعہ جو بینک ہمیں قرض وغیرہ دے رہے ہیں اس میں بھی آسانی ہوگی، خاص طور سے جو طویل المیعاد قرض دیئے جاتے ہیں اس میں تفاوت فاحش ہو جاتا ہے اور اس کے ذریعہ سے گویا قرض دین دینے والوں کا جو مقصد ہے وہ فوت ہو جائے گا یا وہ کبھی ہمت نہیں کرے گا، اور مفتی نظام الدین صاحب کا فتویٰ بھی جیسا کہ مقالات کے اندر آیا ہے تو وہ بھی گویا اس بات کے قائل ہیں، اگر اتنا تفاوت ہو جاتا ہے، تو اس میں اس وقت کا اعتبار کیا جائے گا جس وقت میں اس نے قرض لیا ہے تو اس وقت میں جتنا سونا ملتا تھا اتنے سونے کے بقدر قیمت دلائی جائے گی۔

واللہ اعلم، جزا کم اللہ

مولانا مفتی جمیل احمد ندیری صاحب (اعظم گڑھ):

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ ابھی جو بحث چل رہی ہے موجودہ کرنسی کی شرعی حیثیت کے بارے میں، اس کے بارے میں مجھے یاد آ رہا ہے کہ جب دوسرا فقہی سمینار ہوا تھا تو اس میں بہت سے بینکنگ کے، معاشیات کے، اقتصادیات کے ماہرین شریک ہوئے تھے اور انہوں نے بھی ایک بات بتائی تھی، مثلاً یہ کہا جاتا ہے کہ موجودہ کرنسی کی قیمت اور مالیت سونے کے ذریعہ متعین کی جاتی ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اب یہ ثمن عرفی، اصطلاحی نہیں رہے بلکہ ثمن خلقی کا درجہ حاصل کر چکے ہیں، چنانچہ ان لوگوں نے کہا تھا کہ اگر آپ ریزرو بینک میں جائیں سو کا نوٹ لے کر اور ان سے یہ کہیں کہ اس کا ہم کو سونا دیدیجئے تو سونا ہرگز نہیں دیں گے، بلکہ دوسرا سو کا نوٹ دیدیں گے اور پھر دوبارہ آپ جائیں تو پھر وہ کوئی اور نوٹ دیدیں گے، سونا کبھی نہیں دے سکتے وہ، ہمیشہ نوٹ ہی دیتے رہیں گے، اور اس کے علاوہ ایک بات یہ بھی ہے کہ کسی آدمی کے پاس پندرہ سال پرانا سو کا نوٹ ہے جب کہ ریزرو بینک کا گورنر کوئی اور تھا اور آج ریزرو بینک کا گورنر کوئی اور ہو چکا ہے تو اگر پندرہ سال پرانا نوٹ آج اگر بینک میں آپ لے کر جائیں گے تو بینک مالیت کے اعتبار سے نہیں بدلے گا بلکہ وہ اس پندرہ سال پرانے والے سو کے نوٹ کے بدلے دوسرا سو کا نوٹ دیدیگا، مالیت سے اس کو بالکل نہیں جوڑ سکتا، لہذا اس کو ثمن خلقی کا درجہ ایک طرح سے حاصل ہو چکا ہے، اس لیے ثمن خلقی کے اعتبار ہی سے اس کا فیصلہ ہونا چاہئے، یعنی سو کا نوٹ اگر پہلے واجب تھا پندرہ سال پہلے تو آج بھی وہ سو کا نوٹ ہی دیا جائے گا، مالیت کا اس میں کوئی اعتبار نہیں کیا جائے گا۔ جزاکم اللہ

مولانا محمد عارف باللہ قاسمی (حیدرآباد):

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ موجودہ دور میں جو کرنسیاں چل رہی ہیں، ان کو بینکوں کے

قوانین سے اور جو ملکی قوانین ہیں ان سے الگ کر کے نہیں دیکھا جاسکتا اور ملکی قوانین اور بینکوں کے جو نظام ہیں اس کے جو قوانین ہیں اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ کرنسیاں اس کا تعلق سونے سے باقی نہیں رہا جیسا کہ مولانا نے کہا تھا کہ ویتنام کی جنگ کے بعد امریکہ نے صاف اعلان کر دیا کہ میں اس کے بدلہ میں سونا نہیں دوں گا، ابھی ابھی بات آئی کہ کوئی بینک اگر ہم ایک ہزار روپے لیکر جاتے ہیں کہ اس کے بدلہ سونے دیدو تو نہیں دیتا، اس کے علاوہ ایک پہلو یہ بھی ہے کہ آج کل دنیا میں شیئر بازار میں جس طرح سے عام کمپنیوں کے شیئرز بکتے ہیں، اسی طرح سے سونے چاندی اور تمام جو بھی چیزیں ہیں ان کی بھی خرید و فروخت ہوتی ہے حتیٰ کہ کرنسیوں کی بھی خرید و فروخت ہوتی ہے، بہت سی مرتبہ آپ دیکھیں گے کہ سونے اور چاندی کی قیمت میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی نہیں ہو رہی ہے لیکن کسی ملک کے اندرونی حالات کی وجہ سے، جیسے کہ اس ملک میں انتخاب جاری ہے یا کوئی ایسی حکومت بن رہی ہے جو حکومت اتنی مستحکم نہیں ہے، اس ملک کے اندرونی حالات کی وجہ سے سونے چاندی میں تبدیلی کے بغیر، اس ملک کی کرنسی کی قیمت گھٹ جاتی ہے جیسے کہ جن دنوں یہاں الیکشن چل رہا تھا ان دنوں انڈین کرنسی کی قیمت کم تھی، حالانکہ عالمی سطح پر دیکھا جائے تو سونے چاندی کی قیمت میں کوئی تبدیلی نہیں تھی الا یہ کہ جزوی تبدیلی پچاس روپے کی، سو روپے کی ہو، جب کہ کرنسی میں کافی اتار چڑھاؤ ہو رہا تھا سونے اور چاندی کی قیمتوں میں اتار چڑھاؤ کے بغیر۔ کرنسیوں کی قیمت میں جو اتار چڑھاؤ ہوتا ہے یہ اس بات کی دلیل ہے کہ موجودہ جو دنیاوی نظام ہے اس میں کرنسیاں سونے سے جڑی ہوئی نہیں ہیں اس لیے ہمیں اس کو پیش نظر رکھنا ہوگا۔ جزاکم اللہ

مولانا محمد جعفر ملی رحمانی (اکل کوا):

بسم اللہ الرحمن الرحیم! مہر اور دیون موجدہ کے سلسلہ میں احقر کی ناقص رائے یہ ہے کہ

مہر اور دیون موجدہ کو سونے چاندی اور روپے دونوں میں سے کسی ایک کے ساتھ ہی مقرر کیا جانا



چاہئے؛ کیوں کہ اگر سونے کو روپیوں کے ساتھ مربوط کرتے ہیں یا روپے کو سونے کے ساتھ مربوط کرتے ہیں تو سونے کی قیمت یا روپے کی مالیت، کمی بیشی کی وجہ سے بوقت ادائیگی کمی بیشی ہوگی، جس کی وجہ سے ربوا کا دروازہ کھل سکتا ہے، جب کہ سد ذرائع کے طور پر ہمارے فقہائے کرام یہ فرماتے ہیں: "إن الذریعة والوسیلة تكون محرمة إذا كان المقصد محرماً، وتكون واجبة إذا كان المقصد واجباً" بہر حال یہ بات پیش نظر رہنی چاہئے کہ دونوں میں سے کسی ایک ہی کو مقرر کیا جانا چاہئے۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب:

اگر آپ دونوں میں سے کسی ایک سے ہی متعین کریں گے تو شبہ ربوا کا امکان تو اس میں بھی ہے؛ اس لیے کہ ان دونوں دھاتوں کی قیمت میں فرق واقع ہوتا رہتا ہے، البتہ یہ ہے کہ سونے کی قیمت زیادہ مستحکم ہوتی ہے اور عالمی سطح پر اس کی قیمت متعین ہوتی ہے، لیکن ٹھیک ہے۔۔۔۔۔

مولانا محمد جعفر ملی رحمانی:

صرف روپے کو اگر ہم مقرر کرتے ہیں مہر میں اور ادائیگی کے وقت پھر ہم روپے ہی کو لازم قرار دیتے ہیں تو پھر سود کے پیدا ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی:

روپے کو؟ اور آپ نے کہا سونا یا چاندی سے مربوط کرنے کو تو۔

مولانا جعفر ملی رحمانی:

دونوں میں سے کسی ایک ہی کے ساتھ مقرر کرنا چاہئے دیون موجدہ کو یا تو آپ مہر میں

روپے ہی کو مقرر کیجئے اور بوقت ادائیگی اسی کو لازم قرار دیجئے۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی:

یعنی آپ کا منشا یہ ہے کہ سونے یا چاندی ہی سے مہر مقرر کیا جائے۔

مولانا جعفر ملی رحمانی:

جی! سونے یا چاندی ہی سے مقرر کیجئے یا روپے ہی سے مقرر کیجئے اور بوقت ادائیگی

دونوں میں سے ایک سے ادائیگی ہو۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی:

وہ تو متفق علیہ بات ہے اور اکیڈمی کے تیسرے فقہی سمینار جو حضرت مولانا مفتی

اشرف علی صاحب کے یہاں منعقد ہوا تھا تو اس میں باضابطہ ایک تجویز ہے اور گزارش کی گئی ہے

کہ مہر کو سونے یا چاندی ہی سے طے کرنے کی کوشش کی جائے تاکہ اس میں عورتوں کا نقصان نہ

ہو، جو آپ فرما رہے ہیں اس کے مطابق ہی ہے وہ تجویز۔ اب مشکل یہ ہے کہ جن لوگوں کا مہر

مقرر ہو گیا ہے ان کا مسئلہ کس طرح حل ہوگا؟

مفتی عبدالباسط قاسمی صاحب (مہیبی):

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، اس سلسلہ میں یہ بات ذہن نشین رہے کہ کرنسی جو ہے

وثیقہ دشمن نہیں، بلکہ خود دشمن ہے، جہاں تک فتاویٰ کے اختلاف کا تعلق ہے تو وہ فتاویٰ مختلف زمانے

میں دیئے گئے، جب تک یہ بات واضح ہو کر نہیں آئی تھی کہ اس کے پیچھے سونا ہے یا نہیں، اس

وقت فتاویٰ میں اختلاف رہا، جب یہ بات مکمل طور پر واضح ہو گئی کہ اس کے پیچھے سونا چاندی

نہیں ہے، چوں کہ ۱۹۷۳ء میں امریکہ نے یہ اعلان کیا تھا، لیکن اعلان ہونے کے فوراً بعد

مفتیان کرام اور علماء کرام تک یہ بات نہیں پہنچی تھی، اس لیے اس زمانے میں فتاویٰ میں اختلاف رہا، لیکن بعد کے جتنے فتاویٰ ہیں جب یہ بات مستح اور واضح ہو گئی اور اس کو ثمن قرار دے دیا گیا اس لیے یہ ثمن اصطلاحی ہے۔ دوسری بات یہ عرض کرنی ہے کہ دیون موجدہ اور مہر وغیرہ کے اندر چوں کہ ثمن اصطلاحی کے اندر بہت زیادہ تفاوت ہوتا ہے یہ مثال شہروں میں بہت آسانی سے سمجھ میں آتی ہے، مثال کے طور پر کسی نے کسی بلڈنگ میں کوئی مکان بک کرایا، آج کی تاریخ میں وہ ہزار روپے اسکوائر فٹ سے بک کراتا ہے اور بلڈر ایک سال کا وقت لیتا ہے کہ میں دے دوں گا، لیکن قانونی پیچیدگیاں اور مسائل بڑھتے بڑھتے پانچ سال ہو گئے اور وہ فلیٹ نہیں دے سکتا، اب اسی جگہ پر اسی مقام پر اس بلنگ کی قیمت جو ہے سات ہزار، آٹھ ہزار، دس ہزار روپے ہو جاتی ہے اسکوائر فٹ۔ تو ایسی صورت کے اندر بڑی دشواریاں پیش آتی ہیں اور بہت سے مسائل ایسے اچھے ہوئے ہیں، اس لیے دیون موجدہ یا طویل مدتی جتنے معاملات ہیں اس کے اندر سونے یا چاندی کسی ایک کو معیار بنایا جائے اور معیار بنانے میں اس بات کو ملحوظ رکھے کہ اسکے پس پشت کرنسی کا ذکر نہ ہو، اس لیے کہ اگر کرنسی کا ذکر کر دیا جائے گا پھر تفاوت پیدا ہوگا ادائیگی کے وقت میں، جس سے ربا یا شبہ ربا پیدا ہو جائے گا، اور رہی یہ بات کہ اگر سونے یا چاندی کی شکل میں دیون موجدہ، قروض، مہر وغیرہ کی تعیین کی جائے تو یہ بات ذہن میں رہے کہ عہد نبوی کے اندر بھی دراہم اور دینار جو سونے کے سکے تھے، ثمن خلقی تھے، ان ہی کے ذریعہ سے قروض اور دیون کے معاملات طے ہوتے تھے، یہ غور کر لیا جائے کہ اس زمانے میں اس کی کیا نوعیت تھی، کیا شکل تھی کہ کس بنیاد پر وہاں پر قروض کے معاملات طے ہوتے تھے، اسی طرح سے آج بھی یہ طے کیا جاسکتا ہے کہ طویل مدتی دیون کے اندر سونے کو مکمل طور پر تعیین کر لیا جائے، اسی طرح کرنسی کے تعلق سے یہ ہے کہ اس کو کسی سے مربوط کرنا ہے، جہاں تک اشاریہ بندی سے کرنسی کو مربوط کرنے کی بات آئی ہے یہ بالکل خلاف عقل ہے؛ اس لیے کہ اشاریہ بندی کے جہاں تک معاملات ہیں اشیاء کی

قیمتیں طلب و رسد کے اوپر موقوف ہیں اور طلب و رسد حالات اور زمانے کے اعتبار سے گھٹتی بڑھتی رہتی ہے، جب اشیاء کی طلب و رسد کم زیادہ ہوگی اسی اعتبار سے قیمتوں میں کرنسی کے تفاوت ہوگا، یہ تفاوت جو ہے ہوتا ہی رہے گا، اس لیے اشاریہ بندی کے ساتھ اس کو مربوط نہیں کیا جاسکتا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب:

جہاں تک وثیقہ دشمن والے فتویٰ کی بات ہے تو ہمارے بعض وہ بزرگ جو ماضی قریب کے تھے جیسے میرے استاذ گرامی حضرت مولانا مفتی نظام الدین صاحب اعظمیؒ تو ان کا بھی فتویٰ اس سلسلہ میں موجود ہے صرف قدیم بزرگوں ہی کا نہیں ہے، اور جہاں تک یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں درہم و دینار کے ذریعہ دیون طے ہوتے تھے اور ادا کیے جاتے تھے، وہ تو کوئی مسئلہ نہیں ہے، آج بھی اگر سونے اور چاندی کے سکے ڈھلنے لگے تو یہ مسئلہ پیدا نہیں ہوگا، یہ ساری زیادتی جو یہودی اور نصرانی نظام کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ انہوں نے بغیر کسی بنیاد کے نوٹ چھاپنے شروع کر دیئے ہیں جو بین الاقوامی قانون شروع میں بنا تھا کرنسی کے سلسلہ میں۔ علی الاعلان اس کی مخالفت کرتے ہوئے امریکہ اور یورپ نوٹ چھاپتا جا رہا ہے تو آج دنیا میں جو بہت سی نا انصافیاں ہیں اس کی ایک بنیاد یہ بھی ہے، اور سود کے مروج ہونے اور اس کے تقویت پانے کی ایک وجہ یہ بھی ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ ہم اور آپ اس موقف میں ہیں نہیں کہ اس صورت حال کو بند لیں تو اس پس منظر میں ہم کو اس مسئلہ پر غور کرنا ہے۔ آپ کی رائے اور اظہار خیال بہت اچھا ہے، یہ ایک قابل وضاحت بات تھی اس لیے میں نے عرض کر دیا۔

مولانا محمد ظفر عالم ندوی صاحب (لکھنؤ):

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ قرض کے سلسلے میں یہ بات آ رہی ہے کہ اگر کوئی شخص

مربوط کیا جائے یا نہیں، تو ظاہر بات ہے کہ قرض ایک تبرع ہے، قرض دینے والا کسی کا تعاون کرنا چاہ رہا ہے، وہ ایک مالی تبادلہ نہیں چاہ رہا ہے، ایسی صورت میں اگر سونے سے مربوط کر دیا جائے اور کچھ مدتوں کے بعد ادا کرنے میں شبہ ربوا جو پیدا ہوگا، تو ربوا کے سلسلہ میں کتاب و سنت میں جس قدر شاعت آئی ہے اس کو دیکھتے ہوئے احتیاط کا پہلو تو یہی ہے کہ اس کو سونے یا کسی اور دھات سے مربوط نہ کیا جائے، البتہ تاخیر ہونے کی صورت میں جس نے قرض دیا ہے اس کو نقصان ہو رہا ہے تو اس نقصان کی تلافی کی شکل نکالی جائے، نقصان کی تلافی کی ایک شکل تو وہ ہے کہ خود قرض لینے والا اپنی دیانت پر احسان کا معاملہ کرے، زائد رقم دیدے جیسا کہ روایتوں میں اس کی مثالیں ملتی ہیں، اسی کی کوئی ایسی شرعی شکل نکالی جائے کہ جو وہ دیانتاً ادا کرے، احساناً ادا کرے، اخلاقاً ادا کرے، کوئی ایسی شکل نکل جائے کہ ان کو ادا کرنا پڑے، اس کی طرف ہم لوگ توجہ کریں تو زیادہ بہتر ہوگا، تاکہ شبہ ربوا سے بچیں اور خسارہ بھی نہ ہو سکے، ان کی تلافی کی کوئی گنجائش نکالی جائے، بس اتنی بات میں عرض کرنا چاہ رہا تھا۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی:

یہ ایک اہم بات کہی ہے مولانا ظفر عالم صاحب نے ابھی ابھی، ہمارے جو مالیاتی ادارے ہیں اور ہمارے مولانا تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم جو اس میں شامل ہیں تو انہوں نے بین بین حل نکالا ہے، آپ لوگوں میں سے اکثر کے علم میں ہوگا، ہو سکتا ہے بعض حضرات کے علم میں نہ ہو اس لیے عرض کرتا ہوں، وہ ہے التزام، یعنی فقہاء مالکیہ کے یہاں اگر کسی چیز کا آدمی اپنے اوپر التزام کر لے تو دیانتاً تو تمام فقہاء کے نزدیک اس کا ایفاء واجب ہوتا ہے، لیکن مالکیہ کے یہاں اگر التزام کی وجہ سے قضاء بھی اس کا ایفاء واجب ہوتا ہے تو ابھی جو اسلامی بینکوں نے اس میں جو طریقہ اختیار کیا ہے وہ یہ ہے کہ اگر وقت مقررہ پر قرض ادا نہیں کر سکیں گے، تو مستقرض سے لکھایا جائے کہ وہ بینک کے تھرو اتنی رقم صدقہ کرنے کا گویا عہد کرتا ہے اپنے اوپر لازم کرتا

ہے، اور یہ جو صدقہ والی رقم ہے یہ بینک کے استعمال میں نہیں جاتی ہے۔ جو شریعت بورڈ ہے براہ راست اس کے کنٹرول میں جاتی ہے اور وہ اس رقم کو گویا خرچ کرتے ہیں تو اس سے مقرض کا تو فائدہ نہیں ہوتا ہے، اس کا مسئلہ تو حل نہیں ہوتا ہے، لیکن اتنا فائدہ ضرور ہوتا ہے کہ مستقرض کو تنبیہ ہوتی ہے اور خواہ مخواہ دین کی ادائیگی میں جو مداخلت ہوتی ہے، ٹال مٹول ہوتا ہے اس کو اس طرح حل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

مولانا مفتی محمد زید مظاہری ندوی صاحب (لکھنؤ):

جب فقہاء کرام نے واضح طور پر ثمن کی دو قسمیں فرمادی ہیں: ثمن خلقتی اور ثمن عرفی اور جملہ احکام میں ثمن عرفی کو ثمن خلقتی ہی کا درجہ دیا ہے تو ثمن عرفی کا اگر قرض دیا جائے اور پانچ سال بعد گو اس کی قوت خرید کم ہو جائے اور اس میں مقرض کا بظاہر نقصان بھی ہوتا ہو لیکن تب بھی اس میں کمی بیشی کا قطعاً اعتبار نہ ہوگا، کیوں کہ اس صورت میں اس کے اجر و ثواب میں بھی اضافہ ہوگا لیکن کیت کا اعتبار نہ ہوگا؛ کیوں کہ ثمن عرفی کو ثمن خلقتی ہی کا درجہ دیا گیا، البتہ اگر قرض لینے دینے وقت یا دوسرے معاملات میں اگر ثمن عرفی کو نقدین سے مربوط کر دیا جائے تو پھر اس کا اعتبار کیا جائے گا۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ نے رسالہ ابن عابدین میں اس کی صراحت فرمائی ہے اس لیے اگر ثمن عرفی ہی کا قرض لیا دیا جائے، مہر مقرر کیا جائے تو کیت میں چاہے جتنا فرق ہو جائے اس کا اعتبار نہیں کیا جائے گا، اور وہ گیا مقرض کا نقصان تو اس کے بدلہ میں اس کو ثواب ملے گا، ثواب میں اضافہ ہوگا، البتہ اگر اس کو مربوط کر دیا جائے تو اس کی گنجائش فقہاء کے کلام میں ملتی ہے۔ جزاکم اللہ

مولانا محمد ابو بکر قاسمی (در بھنگہ):

قرض کی ادائیگی میں ٹال مٹول کرنے اور تاخیر کی صورت میں فقہاء مالکیہ کے نظریہ

کے مطابق ابھی مسئلہ التزام کا جو حضرت مولانا خالد صاحب نے ذکر کیا ہے مولانا محمد تقی صاحب نے فقہی مقالات میں اس کو تفصیل سے لکھا ہے، یہ سوال نامہ چوں کہ میرے پاس پہنچا نہیں تھا اس لیے میں نے کوئی مقالہ تو نہیں لکھا ہے لیکن میں اس سے متفق ہوں، مولانا تقی صاحب کی تحریر اور مولانا خالد صاحب نے جو ابھی کہا ہے اس کی روشنی میں اس کا حل دین کے مسئلہ میں تلاش کیا جائے تو انشاء اللہ یہ جو ٹال مٹول کرتے ہیں اور بعض لوگ قرض لے کر کے یہ سمجھتے ہی نہیں کہ وقت پر ادا کرنا چاہیے اور کچھ گڑ بڑی کرتے ہیں اس سے باز آئیں گے۔ غیر مسلموں کے یہاں تو مسئلہ آسان ہے کہ اگر کسی نے قرض کی ادائیگی یا کوئی کاروبار، یہ ایک مدت متعین کر کے کوئی قرض لیا، کوئی سامان لیا، اب جیسے کوئی کاروبار کیا اور کہا کہ ایک مہینے میں ہم قیمت دیدیں گے، لیکن ایک مہینے میں قیمت نہیں دیتا ہے تو ان کے یہاں ہے کہ شرح سود ایک متعین کر دیتے ہیں کہ اگر تم نے ایک مہینے میں ادائیگی نہیں کیا دین کی، تو تم کو اتنی رقم دینی ہوگی تو وہ لوگ تو ذاتی نفع میں استعمال کرتے ہیں، لیکن ہمارے یہاں، عام طور سے کاروباریوں کے یہاں اس طرح کی کوئی بات نہیں ہے، ہوتا کیا ہے کہ لیا دو مہینے یا ایک مہینے کی مدت کے لیے، سال سال ہو جاتا ہے ادا نہیں کرتے۔ یا ابھی شہر کا جو مسئلہ ذکر کیا کہ بلڈر سب ایک مکان کی قیمت ہے ایک ہزار روپے اور کہتے ہیں کہ ایک سال میں بنا کر کے دیدوں گا، لیکن تین تین سال چار چار سال ہو جاتا ہے اور وہ دیتے نہیں اور جب ان سے کہا جاتا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ میں بنا نہیں سکا، ایسا کیجئے کہ پیسہ لے لیجئے، تو اس میں ہونا یہ چاہیے کہ بیع مسلم کے اندر جو بیع متعین ہے وہ متعین بیع دے اور اگر اس نے نہیں دیا تو اس وقت کی جو قیمت ہوگی، اس کی قیمت دے، اس لیے کہ ہم نے صرف خالص دین نہیں دیا ہے بلکہ معاملہ طے ہو گیا ہے کہ اس دین کے بدلہ میں ہم کو بیع دینا ہے اور بلڈر نے بیع نہیں دیا تو وہ اتنی قیمت دے تاکہ اس قیمت کے ذریعہ سے دوسرا سامان خرید سکے، اگر یہ کیا جائے کہ جو قیمت طے ہے بیع کی اور جس وقت ادائیگی کرے گا، ادائیگی کے دن کی جو قیمت ہوگی، اس دن

کی قیمت کے اعتبار سے اگر طے کیا جائے تو یہ بیع سلم میں مناسب ہے، اور بیع سلم کے علاوہ جو عام دیون ہیں ان میں مسئلہ التزام پر عمل کیا جائے، میری یہ رائے ہے اللہ تعالیٰ عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی:

بیع سلم کے مسئلہ پر بھی بحث کی ہے ماہرین شریعت نے، مسئلہ یہ ہے کہ جب اس وقت قیمت ادا کر دی جائے کہ جب وقت آئے گا تو بیع الدین ہو جائے گا تو ثمن تو آپ کو نقد ادا کرنا ہے اس میں۔

مولانا مفتی جنید عالم ندوی قاسمی صاحب (پٹنہ):

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ تین مسئلے زیر بحث ہیں، پہلا مسئلہ ہے مہر کی ادائیگی، اس سلسلہ میں جیسا کہ بات سامنے آئی کہ تیسرے فقہی سمینار میں یہ طے پایا تھا کہ کوشش یہ کی جائے کہ مہر سونے یا چاندی میں متعین ہو، میرے خیال سے اس پر محنت ہو، کوشش ہو، کوشش جاری رہے انشاء اللہ کامیابی ملے گی۔ اگر رائج سکے میں مہر متعین ہے تو ربوا، شہ ربوا اس سب کی بحث آچکی ہے سامنے، تفصیلات آگئی ہیں، ان کے علاوہ ایک بات اور ہے کہ بہت ساری جگہوں میں یہ فارم نہیں بھرا جاتا ہے نکاح کا۔ جیسے دیہات میں، تو جہاں پر فارم نہیں بھرا جاتا ہے ان لوگوں کو معلوم بھی نہیں ہوتا ہے کہ کب میرا نکاح ہوا تھا، اس وقت کرنسی کی کیا مالیت تھی اور اب کیا مالیت ہے، اس کے حساب لگانے میں بھی پریشانی ہوگی، اس لیے میری رائے یہ ہے کہ جیسا پہلے سے چلا آرہا ہے کہ جو سکے متعین تھے جتنے مہر متعین تھے پانچ ہزار دس ہزار وہی ادا کیے جائیں گے، اس میں مالیت کا اعتبار نہیں کیا جائے گا۔ دوسرا مسئلہ تنخواہ اور پنشن کا ہے، اس میں تنخواہ پانے والے جو ملازم ہوتے ہیں وہ دو طرح کے ہوتے ہیں: ایک سرکاری ملازم، ایک غیر سرکاری ملازم۔ اگر



سرکاری ملازم ہیں تو ان کو تنخواہ سرکار دیتی ہے، ہم کچھ بھی طے کریں گے، سرکار اپنے مطابق جو اس کا طے شدہ اصول ہے اس کے مطابق تنخواہ ملے گی۔ اب رہا غیر سرکاری جو ملازم ہیں تو ایسی صورت میں ربوا اور شبہ ربوا وغیرہ کا مسئلہ تو ہے ہی، اس کے علاوہ ایک نقصان یہ ہے کہ بہت سارے مدرسوں میں تین ماہ چار ماہ دس ماہ بلکہ بورڈ کے مدرسوں میں تو اور زیادہ ہے، چھ ماہ کے بعد تنخواہ دے رہے ہیں، تو مہتمم صاحب یا ناظم صاحب میں اور ان کے ماتحت جو عملہ ہے ان میں جھگڑا ہو جائے گا، دونوں کیلکولیٹر لیکر بیٹھیں گے کہ یہ اس کی مالیت تھی اور اب مالیت یہ ہے، یہ بہت بڑا نقصان ہوگا، مہتمم صاحب میں اور جو ملازمین ہیں ان میں جھگڑے کی شکل پیدا ہوگی۔ تیسرا مسئلہ قرض کی ادائیگی کا ہے۔ قرض کی ادائیگی کے سلسلہ میں میری رائے یہ ہے کہ اگر قرض دیتے وقت یہ طے کر لیا کہ سولہ ہزار یا پندرہ ہزار روپے میں آپ کو دے رہا ہوں، جب آپ اس کو ادا کریں گے تو اس کی قیمت آج ایک تولہ سونا بنتی ہے۔ یعنی پندرہ ہزار میں ایک تولہ سونا ملتا ہے جس وقت آپ ادا کریں گے اس وقت ایک تولہ سونا ادا کریں گے یا اس وقت ایک تولہ سونا کی جو قیمت ہوگی، چاہے پندرہ ہزار ہو، سولہ ہزار ہو، بیس ہزار ہو یا دس ہزار ہو وہ قیمت آپ کو ادا کرنا پڑے گی۔ تو اگر اس طریقے سے باقاعدہ طے کر لیتا ہے تو اس کی گنجائش ہے، اور اگر اس طرح طے نہیں کیا بلکہ قرض میں جو پیسہ دینا تھا دس ہزار بیس ہزار وہ دیدیا اور مزید کوئی بات طے نہیں پائی۔ میرے خیال میں پھر جتنا دیا ہے اتنا ہی لیں گے اس سے زیادہ لینا جائز نہیں ہوگا، ربوا اور شبہ ربوا کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی ذہن میں رہے، سدا للذرائع کی بھی بات آگئی ہے آپ کے سامنے۔

تیسری بات یہ ہے کہ قرض جو دیتا ہے اس کے سامنے انسانی ہمدردی اور ثواب بھی ہے، قرض دینے والا جس وقت قرض دیتا ہے اس وقت سمجھتا ہے کہ چھ ماہ کے بعد قرض کی ادائیگی ہوگی، اس کی مالیت گھٹ جائے گی، قوت خرید گھٹ جائے گی پھر بھی وہ قرض دیتا ہے اس بنیاد پر

اس کو ثواب ملے گا، اس لیے رائج سکے میں اگر طے نہیں کیا ہے تو جتنا دیا ہے اتنی ہی کی واپسی ہوگی۔ جزاکم اللہ۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی:

صرف میں آپ حضرات کی اطلاع کے لیے عرض کرتا: وہ کہ یہ پوچھنے والے ہیں کہ آج پندرہ ہزار روپے دیئے اور اس کو ایک تولہ سونا سے مربوط کر دیا کہ جب ہم آپ سے پیسہ وصول کریں گے تو ایک تولہ سونا وصول کریں گے یا اس کی قیمت۔ تو اصل میں شبہ ربوا تو اس صورت میں بھی پیدا ہو جاتا ہے، معایر شرعیہ جو ہیں جو مجلس الاعلیٰ للمؤسسات والبنوک المالیہ کی جو تجاویز ہیں تو اس میں اس صورت کو بھی جائز نہیں کیا ہے اس بنیاد پر، شبہ سود کی بنیاد پر، صرف آپ حضرات کی اطلاع کے لیے میں نے عرض کر دیا۔

میرے پاس ایک سوال آیا ہے، اس کے بعد ہم جناب علامہ سے اس سوال پر گفتگو کرتے ہوں گے۔ سوال یہ کیا گیا ہے کہ آج کل کرنسی کے پیچھے نہ سونا نہ چاندی تو کرنسی کا معیار کیا ہے؟ اور کس بنیاد پر ہر ملک کی کرنسی کی تعیین ہوتی ہے، تو یہ تو سوال کسی ماہر معاشیات سے کیا جانا چاہیے لیکن جو لوگ بتاتے ہیں وہ یہ ہے کہ اس میں دو تین چیزیں ملحوظ رہتی ہیں، خاص کر آج کل ملکوں کی برآمدات کی اہمیت بہت ہوتی ہے، آپ کی برآمدات کیا ہیں، آپ کو زر مبادلہ کیا حاصل ہوا ہے اور کچھ سونے سے بھی اس کا ربط ہوتا ہے، آپ کے پاس سونے کا محفوظ ذخیرہ کیا ہے؟ تو یہ مختلف چیزیں ہیں جن سے یہ مربوط ہوتی ہے۔

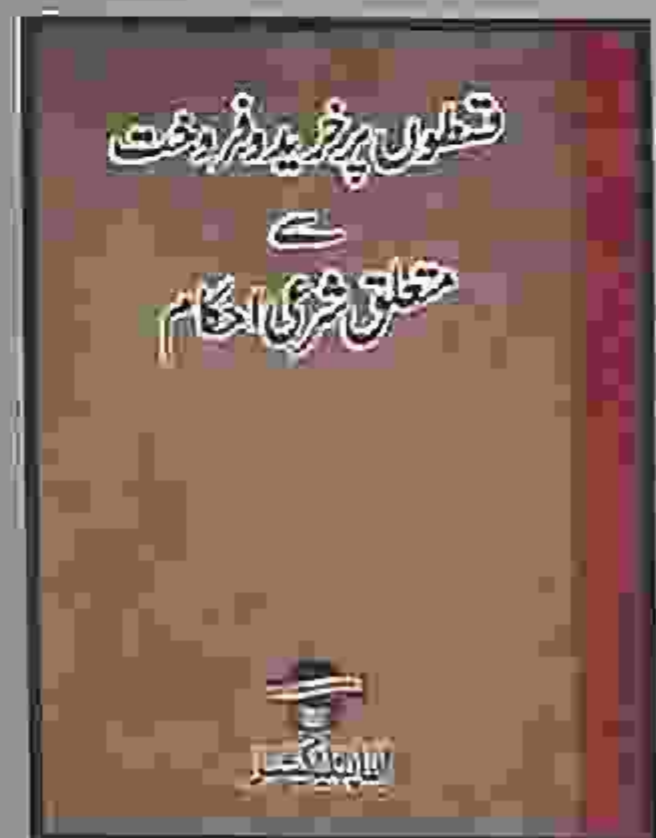
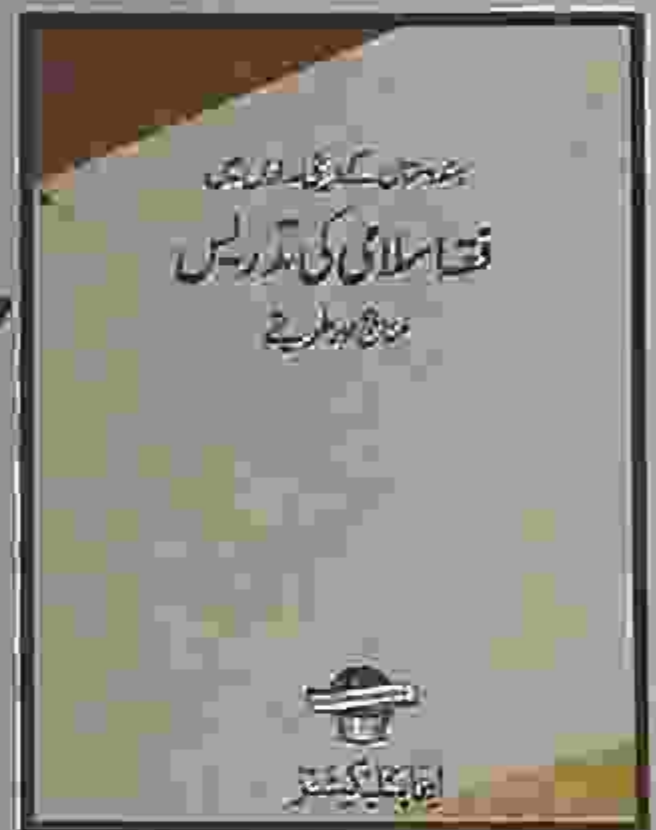
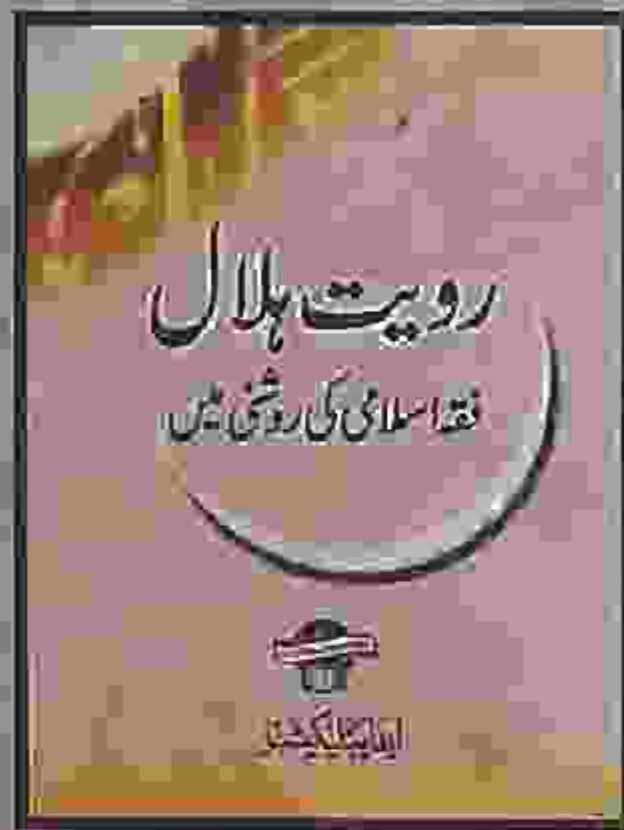
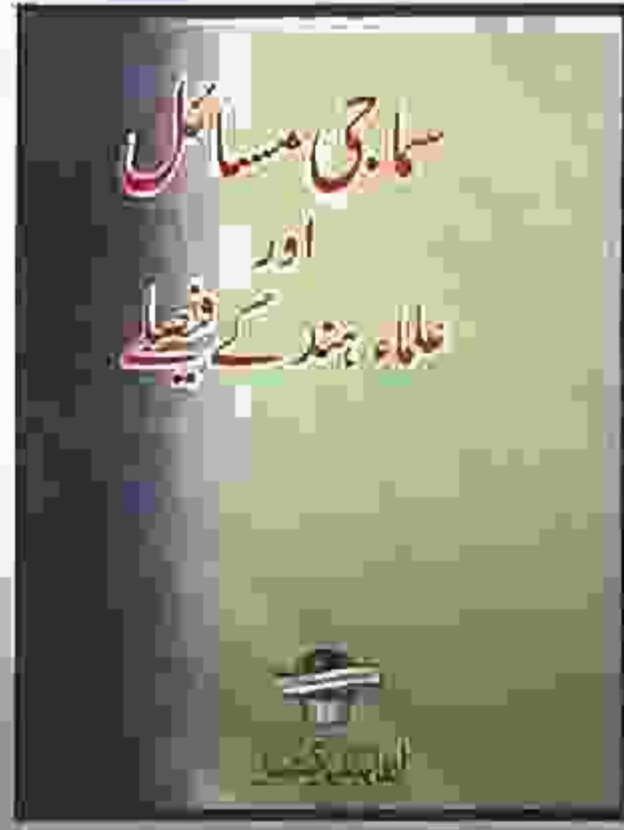
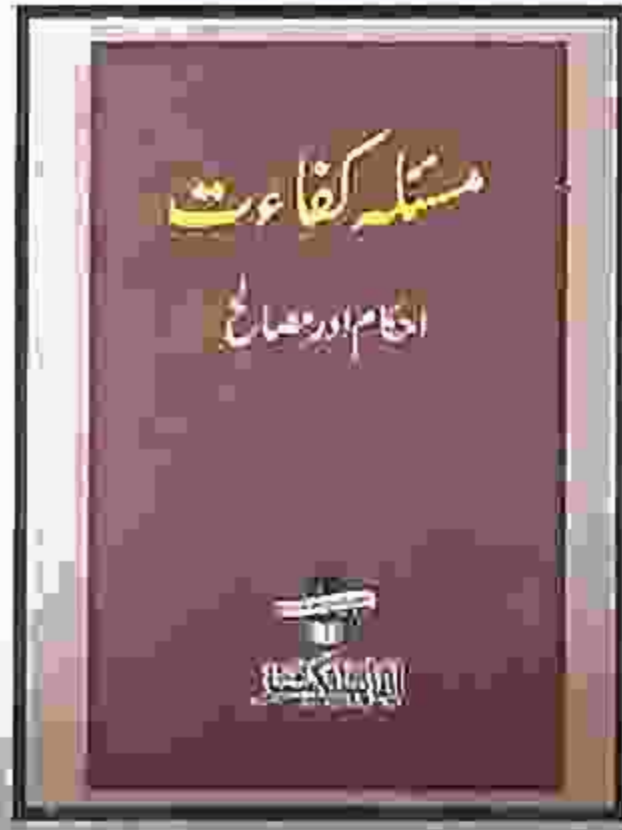
دوسرا سوال یہ ہے کہ آج اگر کوئی شخص کسی کو سولہ ہزار قرض دیتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ میں تم کو ایک تولہ سونا دیتا ہوں (یہ وہی بات ہے جو ابھی مولانا جنید صاحب نے بیان کی) اس کے بارے میں جس کتاب کا میں نے حوالہ دیا ہے، معایر شرعیہ، جس کو اسلامک بینکنگ اور اسلامی اقتصادیات کی بنیادی کتاب سمجھا جاتا ہے تو انہوں نے اس کو جائز قرار نہیں دیا ہے شبہ سود کی بنیاد پر۔

مولانا احمد نادر قاسمی صاحب:

یہ کرنسی کے انسولیشن کا جو مسئلہ ہے یعنی کرنسی کی جو حیثیت آج ہے وہ کل نہیں رہے گی، یہ ماہرین معاشیات کی تفصیلات کے مطابق بھی اور ریزرو بینک آف انڈیا کے ضابطہ کے مطابق بھی یہ ہے کہ ایسے ہی ہوتا ہے یعنی آج جتنی مالیت روپے کی ہے وہ کل اتنی نہیں رہتی ہے اس کو انسولیشن سے وہ لوگ تعبیر کرتے ہیں۔ انسولیشن کو سامنے رکھتے ہوئے آئندہ وصول کیے جانے والے قرض، یا بقایا جات، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے علماء بھی اس کو تسلیم کرتے ہیں۔ جس طرح سے مہر کے باب میں علماء یہ کہتے ہیں کہ مہر اگر موجل ہو تو اسے سونایا چاندی میں باندھا جانا چاہیے ہمیں اس پر غور کرنا چاہئے کہ آخر علماء نے اس کی اجازت کیوں دی ہے؟ ورنہ عام طور سے ماضی میں یہ ہوتا رہا ہے کہ سکہ راج الوقت، مہر، فلاں فلاں وغیرہ۔ لیکن اب یہ کہتے ہیں کہ مہر اگر مقرر ہو اور موجل ہو تو اس کو چاندی یا سونے سے مربوط کیا جائے اس کی کیا وجہ ہے۔ یہ ہم بہت سے دوستوں سے جن کا تعلق اسٹاک ایکسچینج سے، شیئر سے ہے اسی طرح سے وہ سونے کا ایکسپورٹ وغیرہ کا کام کرتے ہیں، انہوں نے یہ بتایا کہ جہاں سونے اور چاندی کی خرید و فروخت ہوتی ہے تو ملک میں جو سونا رہا ہے اگر آپ ان کے پاس ادھار معاملہ کرتے ہیں وہ جتنا پیسہ لیتے ہیں اتنا پیسہ دینے پر وہ بات نہیں کرتے بلکہ وہ یہ کہتے ہیں کہ اگر آج آپ ایک لاکھ روپے مجھے دے رہے ہیں اور کل ہم آپ کو ادا کریں گے تو اس سے یہی معاملہ کرتے ہیں کہ اس وقت سونے کی جتنی قیمت ہے یعنی ایک لاکھ روپیہ کا جتنا سونا بن رہا ہے گویا ہم آپ سے ایک لاکھ کا سونا لے رہے ہیں اور ایک لاکھ کا سونا ہی اس وقت ہم آپ کو دیں گے۔ چاہے اس کی قیمت ایک لاکھ دس ہزار پہنچ جائے یا اس کی قیمت ایک لاکھ پندرہ ہزار پہنچ جائے اور کبھی کبھی اس کی کمی کو بھی گوارا کرتے ہیں۔ جیسا کہ حضرت مولانا مکی الدین صاحب نے عرض کیا کہ کم ہو جائے تو کیا کیا جائے گا، وہ کہتے ہیں کہ اگر ہم نے سونے اور چاندی میں تبادلہ نہیں کیا تو ہمارا

دیوالیہ ہی ہو جائے گا، اس لیے دیوالیہ ہو جائے گا کہ ریزرو بینک آف انڈیا کا قانون ہے کہ کرنسی میں انسولیشن ہوتا ہے یعنی جتنی قیمت آج کرنسی کی ہے، نوٹ کی، اتنی کل نہیں رہے گی اس لیے مجھے یہ سمجھ میں آتا ہے جیسا کہ مفتی جنید صاحب نے فرمایا اور علی گڑھ سے ہمارے دوست نے کہی، کہ قرض دیتے وقت یہ طے کر لیا جائے کہ میں آپ کو قرض دے رہا ہوں ایک لاکھ روپے، اس ایک لاکھ روپے کی جو قیمت ہے سونے میں گویا ہم نے اتنا سونا دیا آپ کو قرض۔ جب مجھے ادا کریں گے تو اتنا سونا ہی ادا کریں گے۔ چاہے یہ رسید جسے آپ کرنسی کہہ رہے ہیں اس کی گنتی میں چاہے ایک لاکھ دس ہزار ہو جائے یا پندرہ ہزار ہو جائے، ایسا مجھے سمجھ میں آتا ہے، یہی بہتر شکل معلوم ہوتی ہے انسولیشن کے پیش نظر۔





330

ط 6771



\* 2 7 8 8 0 - E U - 6 4 \*

Publications

Loga Bai, Post Box No - 9708,

New Delhi - 110025

Tel : 26981327 Email: ifapublications@gmail.com